بے پتوار





عبدالرب بھٹی

پیش لفظ

شروع اللہ کے بابرکت نام سے جس کی تعریف ہی سربہ سر رحمت العالمین ہے...... جس نے مجھ گناہ گار کو اپنے فیوض و برکات سے ہمیشہ، اور بن مانگے ہی مستفیض کیا، کم از کم مجھ پر غالب کا یہ شعر صادق نہیں آتا کہ......

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے......

اللہ نے میری ہر خواہش پوری کی، دستِ مسیحائی سے لے کر شوقِ قلم و قرطاس تک...... اور میں جو بھی مانگوں گا، جو خواہش رکھوں گا وہ صرف اللہ تعالیٰ سے رکھوں گا کہ یہ ایک عاجز بندے کا حق ہے۔ ''بے پتوار'' کوئی ماورائی یا محیر العقول واقعات پر مبنی کہانی نہیں ہے...... بلکہ یہ ہمارے ہی معاشرے کی ایک سچی داستان ہے۔ جس میں آپ، میں اور ہم سب سانس لے رہے ہیں، ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم دیکھ رہے ہیں اور محسوس کر رہے ہیں۔

''بے پتوار'' میں عشق و محبت کی داستانِ دل ستان بھی ہے جو ایک عام انسان کو خاص بنا دیتی ہے اور بے دھڑک بڑے سے بڑے طوفانِ متلاطم خیز کے آگے ڈٹ جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اس میں معاشرے کی روایتی بے حسی اور کج ادائیاں بھی ہیں جو انسان کے افکار، احساس محرومی اور کم مائیگی کے جذبات پروان چڑھانے کا باعث بنتی ہیں۔

''بے پتوار'' جیسی حقیقت خیز کہانی میں فرسودہ، رسم و رواج کی المناک حقیقتیں باشعور قارئین کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ آج کل تفریحی ادب میں آج بھی حقیقت پسند قارئین...... ایسی کہانیاں ذوق و شوق سے پسند کرتے آئے ہیں۔ ایک زندہ و جاوید معاشرتی کتھا کو پڑھنے کا اپنا ایک خاص لطف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے واقعات کڑی در کڑی ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں جس سے دلچسپی، کشاکش اور سنسنی خیزی کا اثر غالب رہتا ہے اور قاری ایک تجسس کے زیرِ اثر کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔

کثیر الاشاعت ہفت روزہ اخبارِ جہاں میں یہ ناول چھپنے کے بعد میرے دوست محترم عبدالغفار صاحب نے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ میں ان کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

آپ کی آراء اور دعاؤں کا طالب

نیازمند۔

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

باہر ٹھٹھرتی ہوئی رات میں خنک ہوا سرسرا رہی تھی۔ جاڑا اس قدر تھا کہ رگوں میں موجود خون تک برفاب ہوا جا رہا تھا۔ گارے مٹی سے بنے اس جھونپڑی نما گھر کے کچے اور بوسیدہ صحن میں ایک کونے پر رکھی بہت سی پیال کی ڈھیری سے وہ دیہاتن سی جوان لڑکی لپٹ کر علیحدہ ہوئی تو...... بہت سا پیال اس کے نازک بازوؤں میں بھر آیا۔ وہ بڑی چوکھٹ کو پار کرتی ہوئی باہر آئی اور قریب ہی کھڑی ایک بیل گاڑی پر پیال ڈال کر اسے پھیلانے لگی۔ یہی عمل اس نے تین مرتبہ مزید دہرایا اور پھر اندر کچے صحن میں ہی کھڑی چند ثانیے کے لیے ہانپنے لگی۔

اوپر کھلے اور صاف تاروں بھرے آسمان پر دہکتے چاند کی ٹھنڈی روشنی میں اس لڑکی کا معصوم اور صبیح چہرہ اس وقت شدید تھکن اور اعصاب زدہ نظر آ رہا تھا۔ ذہنی اور جسمانی تکالیف کی تفسیر بنی اس لڑکی کی کجراری آنکھوں میں اس وقت شدت غم سے آنسو جھلملاتے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ خالصتاً مقامی اور دیہاتی لباس میں ملبوس تھی جو کافی حد تک پرانا اور میلا چیکٹ ہو رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے ہلکے سبز رنگ کے شیشوں جڑے گلے والی قمیض اور اسی رنگت کی شلوار میں اس کا ملکوتی معصوم سا حسن اس وقت اور کوئی نہیں دیکھ رہا تھا لیکن اوپر آسمان پر ٹکے مبہوت چاند کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی لاابالی شہزادے کی طرح اپنی شمسی کشش ثقل سے نکلنے اور اس معصوم دیہاتن لڑکی کے دلآویز حسن کے مدار میں آنے کے لیے بے چین ہو۔

دفعتہً صحن کے ایک جانب بنے تنگ و تاریک کوٹھڑی نما کمرے میں ہولے ہولے اور دردانگیز کراہیں سی بلند ہونے لگیں جس نے تھکی ہاری اس لڑکی کو چونکا دیا۔ اس نے ایک لمحے کو کوٹھڑی نما کمرے کے بند دروازے کو دیکھا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ حرکت میں آ گئی۔ نیز اس کے چہرے پر بھی پریشانی کی لکیریں کچھ مزید گہری ہو گئیں۔ وہ جلدی سے کوٹھڑی کے اندر داخل ہوئی جہاں جھلنگا سی کھاٹ پر ایک مدقوق سا ضعیف بوڑھا لیٹا کراہ رہا تھا۔

اس کی ہیئت کذائی سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی شدید قسم کے مرض میں مبتلا ہو۔ کھاٹ پر صرف میلی چیکٹ رلی بچھی ہوئی تھی اور ایک عجیب قسم کی سڑاند بھی ماحول کو پراگندہ کیے ہوئے تھی۔ اس لڑکی نے پریشان کن نگاہ سے کھاٹ پر پڑے بوڑھے کو دیکھا۔ اندر لالٹین کی یرقان زدہ روشنی میں لڑکی کو وہ بوڑھا کوئی دم کا مہمان نظر آنے لگا۔ وہ قریب المرگ بوڑھا اس کا باپ تھا جسے اچانک ہی گزشتہ دنوں سے ایک خطرناک وبائی مرض نے جکڑ لیا تھا۔ گوٹھ کا ایک پرانا حکیم بڈھل اس کا علاج کر رہا تھا اور اس نے یہی بتایا تھا کہ اسے کالا یرقان ہو چکا ہے۔ جس کا علاج شہر کے بڑے ہسپتال کے سوا کہیں ممکن نہیں۔ مگر پھر بھی حکیم نے اپنی حکمت کا حق ادا کرتے ہوئے گوندی کے پتوں کا عرق نیم کے پتوں میں ملا کر پیتے رہنے کی تاکید کی تھی۔ وہ بے چارا اس قدر بخار میں تپ رہا تھا کہ پوری کوٹھڑی میں اس کی حدت محسوس ہو رہی تھی۔ خود اس لڑکی کو بھی اندر کی فضا قدرے گھٹی ہوئی اور تپتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

وہ دوبارہ صحن میں آ گئی۔ جہاں سردی نے ایک بار پھر اس کے نازک وجود کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا۔ تاہم اس نے سردی کی پروا کیے بغیر قریب جھولتی ہوئی رسی سے ٹنگی رلی اتاری اور باہر آ کر بیل گاڑی پر بکھری ہوئی پیال پر بچھا دیا پھر وہیں ایک لمحے کو رکی۔ باہر ہر طرف کہرا سا چھایا ہوا تھا۔ سناٹا اس قدر تھا کہ پتا بھی کھڑکتا تو دھماکے جیسی آواز محسوس ہوتی۔ لڑکی کی بے چین سی نگاہیں سامنے دبیز کہر میں لپٹے ہوئے کچے راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے شاید کسی کا انتظار تھا۔ پھر وہ بیلوں کے قریب آ کر ان پر دھری موٹی گودڑ نما پھٹی پرانی چادروں کو بیلوں کے جسموں پر پھیلا کر درست کرنے لگی جو ان دونوں کے لیے گرم لحافوں کا کام دے رہی تھیں۔ لگتا تھا اس لڑکی کو اپنے بیلوں سے بڑی محبت تھی۔ اس نے باقاعدہ ان دونوں جانوروں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک سانولا تھا اور دوسرا ہیرا۔ پھر وہ ان کی تھوتھنیوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی تو اس کی کپکپاتی ہوئی آواز میں بلا کا درد سمٹ آیا تھا۔

''رے سانولے! دھڑیں سائیں سے دعا کر وہ ہمارے بابا کو بچا لے۔'' پھر وہ دوسرے سے مخاطب ہوئی۔ ''ہیرے! تو بھی دعا کر...... بابا کے لیے...... ورنہ...... ورنہ ہم اکیلے رہ جائیں گے۔ سارے سنسار میں کوئی ہمارا نہیں ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے بے اختیار اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے۔

پھر یوں ہوا کہ محسوسات کی غیر مرئی ڈور نے دونوں جانوروں کو احساس کی جکڑ بندی

میں لیتے ہوئے یہ باور کرا دیا کہ ان کی کھرلی میں بڑے انس کے ساتھ جو لوگ چارا ڈالا کرتے تھے اور موسموں کے تغیر و تبدل میں ان کی حفاظت کرتے تھے۔ وہ ہمدرد لوگ آج کسی بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس لڑکی کو چند لمحے کے لیے بیلوں کی موٹی موٹی سیاہ ابھری ہوئی آنکھوں میں معصومانہ چمک، نمی کی صورت میں جھلملاتی ہوئی نظر آئی۔

وہ اب شدید قسم کے تذبذب میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑائی۔

''جانے چاچا سوڈھل کو کیوں دیر ہو گئی۔''

بیلوں نے ہولے سے ''اُوں......ں......ں'' کیا تو وہ یکدم چونکی۔ پھر ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے دماغ میں لپکا۔ درحقیقت وہ اپنے باپ کو شہر بغرض علاج لے جانا چاہتی تھی جو ان کے گوٹھ سے کوئی بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ مگر یہ سب پروگرام منہ اندھیرے روانہ ہونے کا تھا اور چاچا سوڈھل اور چاچی عنایتاں نے بھی اس کے ساتھ جانا تھا، لیکن پھر یوں ہوا کہ اچانک ہی اس لڑکی کے باپ کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور وہ شدید قسم کے بخار میں پھنکنے لگا۔ اس کی حالت آج شام کے بعد سے بگڑنا شروع ہوئی تو لڑکی خود حکیم بڈھل کے ہاں سے دوائی لے کر آئی اور وہ اپنے باپ کو دی جس سے برائے نام ہی افاقہ ہوا تھا اور رات کو پھر حالت پہلے سے زیادہ بگڑنے لگی تو بے چاری پریشان سی ہو گئی اور پھر کسی کے ہاتھ اپنے چاچا سوڈھل کے ہاں پیغام بھجوایا کہ وہ آ جائے تاکہ فوری طور پر ''بابا'' کو شہر لے جایا جا سکے۔

جس گوٹھ کے لڑکے کے ہاتھ چاچا سوڈھل کو پیغام بھجوایا تھا اس نے گھنٹہ بھر بعد آ کر بتایا کہ چاچا سوڈھل...... بس پہنچنے والا ہے ساتھ ہی اپنی بھتیجی کو اس نے یہ بھی ہدایت بھجوائی تھی کہ ان کے آنے تک وہ بیل گاڑی وغیرہ تیار کر کے رکھے۔ سو اب وہ اپنا کام نمٹا چکی تھی۔ مگر اس کے چاچا کا کچھ پتہ نہ تھا؟ وہ اندر آ گئی تو ایک بار پھر کوٹھڑی سے اسے اپنے قریب المرگ باپ کی نیم غنودہ سی کراہیں سنائی دینے لگیں وہ پریشان سی ہو گئی۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ چاچا سوڈھل ابھی نہیں پہنچا تھا۔ اسے حیرت کے ساتھ دکھ بھی ہو رہا تھا جو اس کی پژمردگی میں مزید اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ اس بے چاری کو اپنے باپ کی جاں بہ لب کراہیں پریشان کیے دے رہی تھیں۔

''دھڑیں سائیں...... میرے بابا...... پر رحم کرنا اور...... اور چاچا سوڈھل کو جلدی بھیج دینا۔'' بے اختیار اپنی بے بسی پر ایک بار پھر اس کی سیاہ آنکھوں کے گوشے نمناک ہو گئے تھے۔

پھر شاید اللہ نے اس کی دعا قبول کر لی کیونکہ اگلے ہی لمحے باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

''اللہ رکھی! دروازہ کھول میں آیا ہوں سوڈھل۔''

یہ چاچا سوڈھل تھا جس نے دستک کے ساتھ ہی باہر سے اپنی بھتیجی اللہ رکھی کو پکارا تھا اور اللہ رکھی کے اندر اس آواز پر جیسے جان سی پڑ گئی۔ اس نے لپک کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی اس کا چاچا سوڈھل ایک موٹی سی چادر اوڑھے کھڑا تھا۔ ''آ...... آ...... چاچا اندر آ جا۔'' اللہ رکھی نے بڑے رسان سے کہا۔ اس آڑے اور بے یارومددگار وقت میں کسی اپنے کو پا کر اس کی پژمردگی یکدم ڈھل سی گئی تھی۔ چاچا سوڈھل جو پچاس سے اوپر ہی کا تھا سردی سے ٹھٹھرتا کانپتا ہوا اندر آ گیا۔

''دھیئے...... مجھے دیری ہو گئی پر شاباش ہے توں آپڑاں کام پورا کر کے رکھا ہے۔ کیا کروں تیری چاچی نے بھی کھاٹ پکڑ لی ہے۔ اچھا بتا بھائی کیسا ہے۔''

''بس چاچا ویسا ہی ہے۔'' اللہ رکھی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی اور سوڈھل اندر کوٹھڑی میں آ گیا۔ وہ اللہ رکھی کے بیمار باپ کا چھوٹا بھائی تھا یہی کوئی چار پانچ سال چھوٹا۔ اللہ رکھی کے باپ پر اب نیم بے ہوشی سی طاری ہو گئی تھی۔ سوڈھل بھائی کی جانب دیکھ کر قدرے مایوس سا نظر آنے لگا۔ وہ آگے بڑھا اور اسے سہارا دیتے ہوئیہ آہستگی چارپائی سے اٹھا کر اپنے بازوؤں پر سنبھال لیا۔ اللہ رکھی نے بھی ہاتھ بڑھایا اس نے فوراً باپ پر رلی ڈال دی تھی۔ پھر وہ چاچا سوڈھل کے عقب میں چلتی ہوئی باہر آ گئی۔

''دھیئے توں نے کچھ کھایا پیا بھی ہے۔ نہیں تو روٹی وغیرہ باندھ لے۔ میں تو جلدی میں کچھ نہ لا سکا آپڑیں نال...... تیری چاچی بھی بس۔'' اس نے پھر اپنی بیوی کا رونا رویا۔

اس اثناء میں وہ اپنے بیمار بھائی کو بیل گاڑی پر بچھی پرال پر آہستگی کے ساتھ لٹا چکا تھا اور اللہ رکھی نے بھی بڑھ کر اپنے باپ پر دو تین چادریں ڈال دیں۔ تاہم سوڈھل چاچا کی بات پر وہ گومگوسی ہو گئی۔ اس کی متذبذب سی چپ نے جہاندیدہ سوڈھل کو زادِ راہ کی عدم دستیابی کے بارے میں بتا دیا۔ اس کے بعد وہ بھی چپ رہا۔

پھر اس نے اللہ رکھی کو گھر کا دروازہ بند کر کے تالا لگانے کی ہدایت کی اور خود بیلوں کی رسی تھام کر انہیں ہولے سے ٹٹکارنے لگا۔ ادھر اللہ رکھی فوری دروازہ وغیرہ بند کر کے بیل گاڑی پر اچک کر آ بیٹھی اور سوڈھل بھی چابک سنبھال کر بیٹھ گیا۔

بیل ہولے سے ''آں...... ں...... ں......'' کی آواز نکال کر ڈکرائے اور آگے کو

ہو لیے۔

رات کے مہیب سناٹے میں بیل گاڑی کے چوبی اور بے تکے پہیوں سے ''چوں...... چک...... چوں...... چک...... چک'' کی بیزار کن آوازیں انتہائی ناگوار معلوم ہو رہی تھیں سامنے کچے راستے پر مدہم چاندنی میں لپٹی ہوئی کہر کی دھندلی چادر سی تنی ہوئی تھی۔ بیل گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھی چلی جا رہی تھی۔

بیلوں کی رسی تھامے سوڈھل اندر سے بڑا مسرور تھا۔ اپنے بھائی کی موت اسے یقینی نظر آ رہی تھی۔ وہ تو یونہی اپنی بھتیجی اللہ رکھی کے سامنے ''دردمند بھائی اور پُر شفقت چاچا'' بننے کی اداکاری کر رہا تھا تاکہ وہ اس سے بددل نہ ہو، وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ اب کوئی دم کا مہمان ہے۔ اس کے بعد...... ہاں...... اس کے بعد اللہ رکھی کا اس دنیا میں اس کے سوا کوئی نہ تھا اور باپ کے مرنے کے بعد وہ لازماً اس کی ذمہ داری بننے والی تھی اور بے حس اور حریص چاچا سوڈھل پہلے ہی سے اپنی اس ''ذمہ داری'' سے اچھی طرح سے نمٹنے کے لیے شیطانی منصوبہ بنا چکا تھا۔

وہ ایک عرصے سے کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ دمے کا مریض بھی تھا مگر حقہ گڑگڑانا پھر بھی نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ وڈیرے میر لکھمیر خان کی زمینوں میں ''رہا کی'' کرتا تھا۔ اب اس سے مشقت نہیں ہوتی تھی۔ وہ تھا بھی بے اولاد، لے دے کے ایک بیوی تھی جو ہر سے اٹوائی کھٹوائی لئے پڑی رہتی تھی۔ وہ اس قدر بے حس اور لالچی ہو چکا تھا کہ اسے اب اپنے بیمار بھائی کی یقینی موت اور بھتیجی اللہ رکھی کی ''سرپرستی'' اس کے ذمے آنے کی صورت میں سارے دلدر دور ہوتے نظر آ رہے تھے۔ بس اب اس کی یہی ایک خواہش تھی کہ کسی طرح سے بیل گاڑی میں موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا اس کے بھائی کا دم پار ہو جائے۔ ورنہ وہ جانتا تھا کہ شہر کے ہسپتالوں میں کتنا ذلیل وخوار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ سنگدلانہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ اگر شہر پہنچنے سے پہلے پہل اس کا دم نہ نکلا تو ہو سکتا ہے یہ بچ جائے اور الٹا خرچہ ہی گلے پڑ جائے۔ لہٰذا اب بیل گاڑی ہانکنے کے دوران وہ اب اس سنسنی خیز گتھی میں الجھ گیا کہ اس زندہ لاش سے کس طرح چھٹکارا حاصل کرے۔

اب وہ جان بوجھ کر بیل گاڑی کی رفتار بھی قدرے آہستہ رکھے ہوئے تھا۔

اللہ رکھی نے بیل گاڑی کی ہلکی رفتار پر جھجکتے ہوئے چاچا سوڈھل کو ٹوکا۔ ''چاچا...... بہت آہستہ چل رہی ہے۔ تیز چلاؤ نا۔''

سوڈھل نے چونک کر اس کی بات سنی اور مکارانہ تشویش سے بولا۔ ''دھیئے! تیز چلانے کو تو چلاؤں۔ پر مجھے پہیوں کی کاٹھی کمزور محسوس ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ٹوٹ جائے تو...... اس سے بھی رہ جائیں گے۔''

اللہ رکھی بے چاری یہ سن کر چپ ہو رہی۔ تاہم اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ وہ بے چاری بار بار پرال پر لیٹے اپنے بیمار باپ کی تپتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگتی اور دل ہی دل میں اس کی زندگی اور شفایابی کی دعائیں مانگنے لگتی۔

عجیب سی بات تھی ایک کے ہاتھ بیمار بوڑھے کی زندگی کے لیے اٹھ رہے تھے تو دوسری جانب اس کی موت کی آرزو و بددعا کی صورت پر نکل رہی تھی۔ یہ سوڈھل تھا جو اپنے بھائی کی موت کا شدت سے آرزومند تھا۔ عجیب فلسفۂ قدرت تھا یعنی سوڈھل بھی اپنے بھائی کی موت کے سلسلے میں اپنی 'دعا' کے پورا ہونے پر پُر امید تھا۔

بہر طور وقت بھاری سِل کی طرح سرک رہا تھا۔ کچا اور ناہموار راستہ اب ختم ہونے کو تھا کیونکہ سامنے شہر جانے والی پکی سڑک مدہم چاندنی میں نظر آنے لگی تھی۔ سوڈھل پر اب عجیب کیفیت طاری تھی وہ بار بار اپنے عقب میں بیٹھی اللہ رکھی سے پوچھے جا رہا تھا۔

''دھیئے! مٹھل...... کو سانس آ رہا ہے نا۔''

اور بے چاری اللہ رکھی جانے کیوں اپنے چاچا سوڈھل کے ان الفاظ پر لرز سی جاتی۔

پکی سڑک کی چوڑی پٹی اب سامنے آ چکی تھی۔ وہ چونکہ ذرا اونچی تھی اس لئے سوڈھل نے بیلوں کی رفتار یکدم بڑھا دی پھر ایک زوردار جھٹکے سے بیل گاڑی کے پہیے پکی سڑک کے ابھرے ہوئے کناروں سے ٹکرائے...... گاڑی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اللہ رکھی گرتے گرتے سنبھلی اس کے بیمار باپ کے حلق سے بھی زوردار کراہ خارج ہو کر رہ گئی۔ اب بیل گاڑی سڑک پر چڑھ چکی تھی۔ پھر دفعتہً سوڈھل کو اپنے بیمار بھائی کی مسلسل کربناک کراہوں کی آوازیں آنے لگیں۔

''چاچا...... چاچا...... گاڑی روکو۔ بابا کو نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔'' پیچھے سے اللہ رکھی کی پریشان کن آواز ابھری اور سوڈھل نے بیلوں کی رسی کھینچ دی۔ بیل گاڑی ہولے سے چرچرا کر رک گئی۔ سوڈھل وہیں پیال پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کی جانب گھوما۔ اللہ رکھی ذرا پیچھے کو سرک گئی۔ سوڈھل نے ہولے سے رلی کا ایک سرا اپنے بیمار بھائی کے چہرے سے سرکایا تو چاند کی غبار آلود اور مدہم روشنی میں اسے اپنے بھائی کے جھریوں بھرے چہرے پر موت کی

زردی پھیلی ہوئی نظر آئی۔ اس کا دل دھڑکا، بیمار مٹھل کے چہرے پر جان کنی کے آثار عیاں تھے اور پھر وہ خود کو پُرسکون سا محسوس کرنے لگا۔ ''کم بخت بڑا ہی سخت جان ہے یہ مجھے شہر پہنچا کر ہی دم لے گا۔'' سوڈھل نے دل ہی دل میں اسے کوسا تھا۔

پھر معاً ایک سفاک خیال نے اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرا دی۔ جسے اللہ رکھی قطعاً محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ سوڈھل اپنے اندر اچانک ابھرنے والے اس سفاک خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اللہ رکھی سے بولا۔ ''دھیئے! تُو ایسا کر میری جگہ بیٹھ جا کر اور گاڑی سنبھال۔ میں جب تک مٹھل کے آہستہ آہستہ مالش کرتا ہوں۔ آجا...... شاباش۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف کو سرک گیا۔

اللہ رکھی بے چاری متذبذب سی سوڈھل چاچا کی جگہ آ گئی اور بیلوں کی رسی اس کے ہاتھوں سے لے کر خود تھام لی۔ چاچا سوڈھل اب پچھلی طرف آ گیا جدھر مٹھل لیٹا ہوا تھا۔ اللہ رکھی نے رسی کو ہولے سے جھٹکا دے کر مخصوص آواز میں انہیں ٹٹکارا اور پھر ایک ناگوار اور بیزار سی چرچراہٹ کے ساتھ بیل گاڑی کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

سوڈھل کا دل نہ جانے کیوں بے طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے بمشکل اپنی مرتعش کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ رلی کے اندر سرکایا پھر ناگ کے زہریلے پھن کی طرح سوڈھل کا ہاتھ اپنے جاں بہ لب بھائی کی اکھڑی گردن پر آ گیا اور اگلے ہی لمحے اس کا دباؤ گردن پر بڑھتا چلا گیا۔

ادھر بے چاری اللہ رکھی دل ہی دل میں اپنے چاچا سوڈھل کو دعائیں دیتی ہوئی کوچبانی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ جس شخص کو وہ فرشتہ سمجھ رہی تھی وہ ایک جلاد صفت شخص تھا جو موت کا فرشتہ بنا بڑے آرام سے عقب میں بیٹھا، اسے یتیم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

ادھر سوڈھل کے ہاتھ کے شکنجے نے بے سدھ اور نڈھال پڑے مٹھل کی گردن کو پوری طرح دبوچ کر تنفس کا رہا سہا کمزور سلسلہ بھی منقطع کر ڈالا تھا۔ جاں بہ لب پڑے مٹھل کے کمزور جسم نے بمشکل روح کا ساتھ چھوڑتے ہوئے تشنجی سا جھٹکا لیا اور ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

جلاد صفت سوڈھل نے اپنا کام مکمل کر کے ہاتھ رلی کے اندر سے باہر کھینچ لیا۔ سخت سردی کے باوجود اسے اپنی پیشانی عرق آلود سی محسوس ہوئی جسے اس نے فوری میلی قمیض کے دامن سے پونچھ ڈالا۔

"چاچا...... بابا...... ٹھیک ہے نا۔" دفعتہً اللہ رکھی نے اپنی معصوم سی لرزتی آواز میں پوچھا۔

"دھیئے! دھڑیں سائیں خیر کرے۔ بھائی کی آواز نہیں آرہی۔" سوڈھل فوراً تشویش سے بولا اور ساتھ ہی اپنا چہرہ متفکر سا بنالیا۔

اللہ رکھی دھک سے رہ گئی۔ اس نے فوری بیلوں کی رسی کھینچ لی اور جلدی سے پیچھے کی جانب پلٹی۔

سوڈھل اس کے باپ کے اوپر سے رلی ہٹا رہا تھا۔ مدہم روشنی میں مٹھل کی آنکھیں یک ٹک کھلی ہوئی تھیں۔

"بابا...... بابا...... اٹھ بابا۔" اللہ رکھی جذباتی انداز میں چیخی۔ غالباً اس پر یہ اذیت ناک انکشاف ہو چکا تھا کہ اس کا بابا اسے بھری دنیا میں تنہا چھوڑ کر ملک عدم سدھار چکا ہے۔

"چاچا...... چاچا دیکھو...... بابا اٹھ نہیں رہا۔" وہ سوڈھل سے مخاطب ہوئی جو بہ ظاہر غمگین چہرہ لئے اپنے مردہ بھائی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اللہ رکھی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی آواز کو گلوگیر بنا کر از راہ تاسف بولا۔ "میڈی دھی...... صبر کر تیرا بابا گزر گیا ہے۔ دھڑیں مولا کا یہی حکم تھا۔"

یہ سننا تھا کہ بے چاری اللہ رکھی وہیں اپنے باپ کی لاش سے لپٹتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "بابا تُو مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اب کس کے لیے کھیتوں میں روٹی لسی لے کر جاؤں گی بابا...... میرا کون ہے اب۔"

وہ بے چاری ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ مکار سوڈھل نے بڑی شفقت سے اللہ رکھی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "ایسا مت بول دھیئے...... ہم ہیں نا تیرے ساتھ۔ تیرا چاچا۔ تیری چاچی۔ ہم بھی تیرے ماں باپ کی جگہ ہیں اور پھر دھڑیں سائیں تیرے ساتھ ہے۔ چپ ہو جا دھیئے شاباش۔"

اللہ رکھی کے رونے کی آواز اب سسکیوں میں بدل گئی تھی۔ سوڈھل بہ آہستگی بیل گاڑی کے اگلے پھٹے پر آ بیٹھا اور رسی تھام کر بیلوں کو ٹٹکارتے ہوئے واپس گوٹھ کی جانب موڑنے لگا۔ دبیز کہر میں لپٹی رات دھواں دھواں ہو کر سسکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

☆======☆======☆

وقت بڑی عجیب شے ہے۔ زخم بھی دیتا ہے اور مرہم بھی خود ہی لگاتا ہے۔ بے

چاری اللہ رکھی بھی وقت کی اس دورخی پر لب سیئے زندگی کی گاڑی کھینچنے پر مجبور تھی۔ اس کے باپ مٹھل کو مرے آج مہینہ ہو چلا تھا، لیکن اللہ رکھی کو یوں لگتا تھا جیسے ابھی دروازہ کھلے گا اور اس کا بابا اندر آ کر اپنے مخصوص لہجے میں اسے پکارے گا۔

"رے میڈی آمڑ گودی...... میڈی دھی راڑیں...... آ...... آ جا تجھے سیر کرانے لے چلوں۔" پھر اسی اثناء میں باہر بیلوں کے بھی ڈکرانے کی آواز ابھرتی تو مٹھل پیار سے اللہ رکھی کو کہتا۔ "دیکھ دھیئے...... سانولا ہیرا بھی تجھے بلا رہے ہیں۔"

پھر جلد ہی غمزدہ اللہ رکھی کو یہ جاں گسل احساس ہوتا کہ وہ باپ کے مشفق سائے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے تو اس کی اذیت میں مزید اضافہ ہونے لگتا۔ مگر یہ سب کچھ اس سے بھلایا بھی تو نہیں جا رہا تھا۔ ماں کا سایہ تو بچپن سے ہی چھن گیا تھا۔ باپ نے اتنی محبت دی تھی کہ وہ باپ کو ہی سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ روز شام کو اس کا باپ کھیتوں سے کام کے بعد تھکا ماندہ لوٹتا اور آتے ہی اسے بیل گاڑی میں سیر کرانے لے جاتا۔

"بابا...... تُو تھکا ہوا آتا ہے۔ مجھے نہ لے جایا کر۔" اللہ رکھی معصومانہ تکلف سے اپنے باپ سے کہتی تو وہ پیار سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے شفیق لہجے میں کہتا۔

"دھیئے راڑیں! تجھے دیکھ کر میری ساری تھکن دور ہو جاتی ہے اور پھر کون سا میں تجھے آبڑیں سر پر بیٹھا کے لے جاتا ہوں۔ یہ ہیرا اور سانولا جو ہیں۔" وہ اسے مطمئن کر دیتا اور اللہ رکھی باپ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی۔

اللہ رکھی اب اپنے چاچا سوڈھل اور چاچی عنایتاں کے ساتھ مستقل آ کر رہنے لگی تھی۔ چاچی عنایتاں کا رویہ تب تک تو درست رہا جب تک اس کے شوہر سوڈھل نے اللہ رکھی کو مکمل طور پر اپنی ذمہ داری میں لینے اور بڑی چالاکی سے اس کا مکان فروخت کرنے کے بعد رقم اپنے تصرف میں لے لی تو پھر چاچی عنایتاں اپنی اصلیت پر اتر آئی۔ وہ پہلے ہی اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑی رہتی تھی۔ اب اللہ رکھی یعنی اپنی بھتیجی کی صورت میں اسے مفت کی بلکہ مالدار نوکرانی مل گئی تھی۔ لہٰذا اس نے سارے کام کا بوجھ بے چاری اللہ رکھی کے کاندھوں پر ڈال دیا لیکن اللہ رکھی نے کبھی گلہ شکوہ نہیں کیا تھا۔ وہ سراپا معصوم، منکسر المزاج، مثل اللہ میاں کی گائے تھی۔ حتیٰ کہ وہ چاچی عنایتاں کی جھڑکیوں کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتی اور حرف شکایت تک نوک زبان پر نہ لاتی۔ اللہ رکھی اب انہی لوگوں کو اپنا سب کچھ سمجھتی تھی۔

سوڈھل نے اللہ رکھی کی جانب سے یکسر اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تاہم کبھی کبھار

جب وہ یہ دیکھتا کہ اس کی بیوی عنایتاں کی زیادتی اللہ رکھی پر کچھ بڑھنے لگی ہے تو وہ اسے تنہائی میں بڑی چالاکی سے سمجھاتا۔

"اڑی چری...... اتنی سختی نہ کر اس پر۔ ایسا نہ ہو تنگ آ کر بھاگ ہی جائے یہاں سے۔ تو نہیں جانتی یہ ہمارے لئے سونے کی چڑیا ہے۔ سونے کی چڑیا۔"

"کیا مطلب سوڈھل ذرا کھل کر تو بتا۔"

عنایتاں نے کسی خیال کے تحت پوچھنا چاہا۔

"بتا تو دوں پر تم عورتیں لوگ پیٹ کی بڑی ہلکی ہوتی ہو۔" سوڈھل نے جیسے جواز پیش کیا۔ تو اس کی بیوی چالاکی سے بولی۔

"نہیں ڑے سوڈھل! میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گی۔ بتانا۔ مجھے بھی تو کیا عام عورتوں کی طرح سمجھتا ہے بھلا۔"

سوڈھل چند ثانئے بعد توقف سے۔ بولا۔ "سن ڑی...... دیکھ وہ تو نے دودے خاں کا نام تو سنا ہو گا ناں۔"

اس کی بات پر عنایتاں کچھ یاد کرتے ہوئے جواباً بولی۔ "ہاں...... وہی دودا خاں نہیں جو بڑا دولت مند ہے اور اس نے دو بیویاں بھی کر رکھی ہیں۔"

"ہاں ڑی وہی...... ٹھیک پہچانی تو۔"...... سوڈھل دبے دبے جوش سے بولا۔ پھر اس کا لہجہ قدرے سرگوشیانہ ہو گیا۔ کہنے لگا۔ "دیکھ ڑی عنایتاں! وہ تیسری شادی کرنا چاہتا ہے اب پتہ ہے کس سے بھلا۔ اپنی اللہ رکھی سے۔"

"کیا؟" عنایتاں ہک بک رہ گئی۔

"ہاؤ...... عنایتاں اور پتہ ہے وہ اس کے عوض پورے پچاس ہزار روپے دے گا۔ پچیس ہزار...... رامو کو دے کر قرضے سے اپنی گردن چھڑائیں گے اور پچیس کے باقی جیب میں۔ کیسا؟" سوڈھل نے کمینے پن سے ہنستے ہوئے کہا اور عنایتاں کی آنکھوں میں بھی حریصانہ چمک عود کر آئی۔ لہٰذا وہ بھی کمینے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"واہ رے سائیں...... ہمارے تو پو بارہ ہو گئے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں ڑی...... اللہ رکھی پر ابھی ہاتھ اپنا ذرا ہلکا رکھ۔" سوڈھل معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ہاں...... سوڈھل ایک بات اور بتا، وہ تو نے اللہ رکھی کے باپ کے مکان کا کیا کیا اسے بیچ کیوں نہیں دیتا۔ وہاں سے بھی پیسے آ جائیں گے چار۔" عنایتاں نے جیسے کچھ یاد

دلاتے ہوئے اپنے شوہر کو گرانقدر تجویز سے نوازا۔

اس کی بات سن کر سوڈھل مکاری سے اپنی دودھیا بھنوؤں کو سکیڑتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ "ہاؤ ڑی...... جلدی اچھی نہیں ہوتی ٹھنڈا کر کے کھا اور پتہ ہے شادی کا سارا خرچ پاڑیں بھی دودا خان ہی کرے گا، لیکن میں ذرا بہانے سے اللہ رکھی سے اس بات کا ذکر کر ڈالوں گا کہ اس کی شادی کے لئے اس کے باپ کا مکان بیچنا پڑے گا بیلوں کو پہلے ہی میں اپنے قبضے میں کر چکا ہوں۔"

"پر سوڈھل...... اللہ رکھی دودے خان سے مان جائے گی شادی پر۔ میرا مطلب ہے اس کی عمر بھی تو۔" عنایتاں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ کیونکہ سوڈھل نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اڑی چپ ڑی! بھلا مرد اور گھوڑے کی عمر کا کیا۔ باقی رہی بات اللہ رکھی کی...... تو اس کی فکر نہ کر وہ بالکل اللہ میاں کی گائے ہے۔ وہ انکار نہیں کر سکے گی۔"

عنایتاں شوہر کی بات پر مکارانہ انداز میں سر کو تفہیمی جنبش دینے لگی۔ "اچھا سوڈھل...... یہ سارا کچھ کب تک ہو جائے گا...... میں تو بیزار سی ہو گئی ہوں اس غربت ماری زندگی سے۔"

"بس...... اب ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔ ذرا بھائی مٹھل کا چالیسواں گزرنے دے۔ قبر کی مٹی سوکھے...... ورنہ پورا گوٹھ نہ صرف تھو تھو کرے گا ہم پر بلکہ بلکہ۔"

دفعتہً وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور عنایتاں نے دیکھا سوڈھل کی تنگ سی پیشانی پر باوجود سردی کے پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ وہ حیرت سے اس کا بوکھلایا ہوا چہرہ تکنے لگی۔ پھر سوڈھل کو جانے بیٹھے بیٹھے کیا ہوا۔ وہ ایک دم اپنی جھلنگا سی چارپائی سے اٹھا اور بوسیدہ سی ٹوپی اور اجرک سنبھالتے ہوئے درشت لہجے میں بیوی سے بولا۔ "چل اٹھ اب جا...... ساری باتیں ایک دم نہ اگلوا لیا کر...... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ کچے گارے مٹی کے کمرے سے نکل گیا۔

اس کا رخ گوٹھ کے اکلوتے چھپر ہوٹل کی طرف تھا۔ بل کھاتی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ہنوز اپنی بیوی عنایتاں کو دل ہی دل میں کوسے جا رہا تھا کم بخت...... کسی دن میرے منہ سے اگلوا کر ہی چھوڑے گی بے دھیانی میں کہ...... اپنے بیمار بھائی مٹھل کو میں نے گلا دبوچ کر مارا ہے۔ ورنہ...... وہ تو ویسے بھی مر رہا تھا۔ اس نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی۔

چھپر ہوٹل نزدیک آ رہا تھا دور مغرب میں آسمان نارنجی رنگ کا ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

گارے مٹی اور کہیں کہیں پختہ انیٹوں سے بنی اس قدیم طرز تعمیر کی حامل حویلی نما عمارت سے ملحقہ ایک کشادہ سی اوطاق میں گوٹھ جاگیرداد پور کا وڈیرا میر لکھ میر خان اپنی بھاری بھرکم شخصیت کے ساتھ، سرکنڈوں کے بنے ایک خاصے اونچے موڑھے پر براجمان اپنے سامنے پختہ فرش پر آلتی پالتی مارے ہاتھ جوڑے مفلوک الحال ہاریوں کی جانب، رعونت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہاں جتنے بھی بیٹھے تھے وہ سب وڈیرے میر لکھ میر خان کی زمینوں پر ''رہاکی'' کرتے تھے۔ وڈیرے کے داہنی جانب مصاحب خاص المعروف منشی میرل منگن ہار...... بڑے مستعد انداز میں کھڑا تھا۔ وہ سیاہ رنگت کا خاصا جاندار مگر پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں ایک موٹا رجسٹر تھام رکھا تھا۔ باقی دیگر خدمت گار اور چاکر وغیرہ بھی وڈیرے کے عقب میں مؤدبانہ کھڑے تھے۔

دفعتہً وڈیرے میر لکھ میر خان کی گونجیلی آواز ابھری۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے ایک ہاری کو مخاطب کیا۔

''اڑے...... موگو کیا بات ہے بابا...... اس بار تو نے چاولوں کی فصل بڑی دیر سے دی ہے۔ تجھے پتہ نہیں ہے اڑے کہ بیوپاری کو دیر سے فصل پہنچاؤ تو وہ نخرے کرتے ہیں اور سستا بھاؤ لگاتے ہیں۔''

موگو نامی ایک کمزور سا کسان میلی کچیلی صدری اور تہبند میں ملبوس ذرا آگے سرکا اور ہاتھ اپنے جوڑتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ''دسس...... سائیں بھوتار...... اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں۔ اس کی وجہ خشک سالی اور پانی کی کمی ہے سائیں اور جب پانی نہروں میں آیا تو وارے بندی سے ملنے لگا اسی لیے سائیں فصل اترنے میں دیر......''

''اچھا ہل بابا ہل...... بکواس چھوڑ اپنی اب...... یہ بتا کہ تجھے کتنی زمین ملی ہوئی ہے رہاکی کے لئے؟'' وڈیرے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے نخوت سے کہا۔

''سائیں وڈا...... بب...... بیس جریب (دس ایکڑ)۔'' موگو نے مختصراً کہا۔

''ہونہہ۔'' وڈیرے نے ہنکارا بھرا پھر اپنے معتمد خاص جو منشی گیری کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا میرل منگن ہار کو مخاطب کیا۔

''اڑے بابا...... میرل۔''

''حاضر سائیں وڈا۔'' وہ مستعدی سے یکدم بولا۔

''بابا اس موگو نے کتنے من چاول دیئے ہیں۔''

وڈیرے کی بات پر میرل نے جھٹ سے رجسٹر کھولا کان میں اٹکی ہوئی پنسل نکالی۔ پھر چند لمحے رجسٹر پر نظریں جمائے بولا۔ ''سائیں وڈا چار سو بوریاں دی ہیں۔''

''کیا؟ بیس جریب پر صرف چار سو من۔'' وڈیرا خشمگیں حیرت سے بولا اور موگو کو پھر غصے سے تکنے لگا۔ اس بے چارے نے فوراً اپنی گردن جھکا دی۔

''اور کھاد کس کی تھی؟'' وڈیرے نے دوبارہ منشی میرل سے پوچھا۔

''سائیں وڈا کھاد ساری ہماری تھی۔'' منشی میرل اپنی نظریں رجسٹر پر گاڑتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''ہوں۔'' وڈیرے نے دوبارہ مخصوص انداز میں ہنکارا بھرا۔

''اچھا بابا...... چنگا...... موگو کو پھر چاولوں میں سے تیسرا حصہ دے دے لگ بھگ ایک سو ساڑھے تینتیس من۔'' وڈیرے کی بات پر بے چارا موگو اتنا کم حصہ ملنے کی وجہ سے تاسف آمیز حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ وہ تو آدھے حصے یعنی پوری دو سو بوریوں کی آس لگائے بیٹھا تھا جو اصولی طور پر اس کا حق بھی تھا۔ تاہم وہ چپ نہ رہ سکا اور احتجاجاً بولا۔

''دسس...... سائیں بھوتار...... اتنا غضب نہ کرو ہم غریبوں پر...... سخت گرمیوں کی تپتی دھوپ میں ہم نے اپنے معصوم بچوں اور کمزور عورتوں کو لے کر بوائی اور پھر کٹائی کی۔ آخر کو آدھو آدھ فصل پر ہمارا بھی حق ہے سائیں بھوتار۔''

اس کی دادفریاد پر وڈیرا لکھ میر خان یکدم چراغ پا ہو گیا اور آنکھیں پھاڑتے ہوئے گھور کر موگو ہاری سے کرخت لہجے میں بولا۔

''اڑے تو کھاد بھی ہماری ہی تھی اور جو تو نے اتنی دیر میں فصل دی ہمیں تو کیا سمجھتا ہے کہ منڈی میں اب مہنگے داموں جائیں گے ہمارے چاول...... اڑے بابا ہمیں تو مول بھی ملنے کی امید نہیں ہے۔'' وڈیرا چند ثانیے تھما۔ پھر جیسے قطعیت سے بولا۔ ''بابا پھر تیری مرضی ہے...... میں دوسرے لوگ تلاش کر لوں گا۔ گوٹھ بھرا پڑا ہے میرے آدمیوں سے۔''

موگو غریب بے چارا وڈیرے کی بات پر لرز اٹھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے وڈیرے کی ''رہاکی'' سے انکار کر دیا تو بھوکوں مر جائے گا۔ دوسرے اس کا گوٹھ میں بھی رہنا دوبھر کر دیا جائے گا۔ لہٰذا اس نے اپنے ہاتھ جوڑ کر تقریباً گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''سائیں وڈا...... ہم آپ کے پرانے نمک خوار ہیں۔ آپ جتنا حصہ دو ہمیں قبول ہے سائیں...... ہمیں قبول ہے۔'' اس کے لہجے میں بے بسی اتر آئی تھی۔

اس کی بات پر وڈیرے میر لکھ میر خان کے تیور بھی ذرا نرم پڑ گئے اور وہ معتدل لہجے

میں موگو ہاری سے بولا۔ ''اڑے بابا...... تجھے ہم نے مزدوروں کی سہولت بھی تو دے رکھی ہے۔ پھر کیوں اپنے کٹنب کو خوار کرتا ہے۔ بابا ایک گھنٹے کی بوائی پر پانچ روپے ہمارا ذمہ ہے اب تم بولتا ہے کہ یہ بھی ہماری جیب میں جائے تو پھر۔'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شاید اسے غریب موگو کی مسکین صورت دیکھ کر خود اپنی بات کی منافقت کا اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ حسرت زدہ لوگ بھلا اپنی جگہ کسی کو مزدور رکھنے کی عیاشی کے متحمل کس طرح ہو سکتے تھے۔ ادھر موگو بے چارا خاموش رہا۔ وہ شاید اپنی مجبوری وڈیرے کو کبھی نہیں سمجھا سکتا تھا کہ جس گھر میں بیمار ماں باپ کے علاوہ جوان جہان اولادیں بھی ہوں اور غربت نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں اور ایسے میں اپنے کنبے سمیت تپتی دھوپ اور خون جلاتی گرمیوں میں وڈیرے کی بیس جریب (دس ایکڑ) زمین کا سینہ چیر کر اپنا خون پسینہ پلانے کے بعد آدھے کے بجائے تیسرا حصہ ملتا ہو۔ اتنی محنت شاقہ کے بعد اس ملنے والے تیسرے حصے...... یعنی ایک سو ساڑھے تینتیس من بوریوں میں سے بھی آدھا حصہ اس کے بھائی پریل کو جاتا ہو اور یوں صرف اسے لگ بھگ چھیاسٹھ بوریوں کو فروخت کر کے ٹیکس بھی خود بھرنا پڑے اور انہی میں سے ایک بڑی رقم وڈیرے میر لکھ میر خان کو کھاد کی ادائیگی کے سلسلے میں جائے تو ایسے میں بھلا یہ لوگ خود اپنی روزی پر لات مارتے ہوئے پٹے پر لی ہوئی وڈیرے کی چند جریب زمین پر بھاری مزدوروں کو کیونکر رکھ سکتے تھے۔

یہی پانچ روپے فی مزدور پر تین گھنٹے کے حساب سے تیس روپے بچیں تو اس رقم سے کئی مسائل حل ہو سکتے تھے۔ اسی اثناء میں وڈیرا لکھ میر خان دوسرے ہاری سے مخاطب ہوا۔ یہ سوڈھل تھا۔

''ہاں بابا...... سوڈھل...... یہ میرل تیرا بتا رہا تھا کہ تُو پٹے پر کچھ جریب ''رہا کی'' کے واسطے زمین اور لینا چاہتا ہے ہم سے۔ خیر تو ہے کیا دوسری شادی کر لی ہے تُو نے۔ دوسری بیوی کو بھی کھیت میں جوتے گا۔''

''نا سائیں وڈا نا...... دوسری اب اس نے کیا کرنی ہے۔ وہ تھا ناں سائیں...... مٹھل بے چارا مر گیا اس کی ایک ہی دھی تھی۔ اللہ رکھی، وہ اب اسی کے گھر آ گئی ہے۔ پورا گھر اس نے آتے ہی سنبھال لیا ہے۔ اب دو چار جریب زمین بھی سنبھال لے گی تو کیا قیامت آ جائے گی۔'' منشی میرل رجسٹر کو بغل میں داب اور پنسل اپنے کان میں اٹکاتے ہوئے اپنی معلومات وڈیرے کے سامنے پیش کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ادھر

سوڈھل...... اپنی ترجمانی منشی میرل کی زبان سے ہوتی دیکھ کر اپنی باچھیں پھیلائے احمقانہ انداز میں کھی...... کھی کرنے لگا۔

''ہالا بابا...... میرل! پھر دے دے اسے انگوٹھا لگوا کر جتنی جریب زمین مانگے رہا کی کے واسطے''۔ وڈیرے لکھ میر خان نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ پھر تیسرے ہاری کو سر کے اشارے سے سامنے آنے کو کہا۔

☆======☆======☆

''یہ کیا بابا سائیں! اتنی محنت کی سب نے، تُو نے، ماں نے ادی ہدایتاں نے اور اس کا معاوضہ بھوتار سائیں نے اتنا کم دیا'' موگو ہاری تھکا مارا گھر اپنے لوٹا تو جوان بیٹے ساون سے ہی نہیں بلکہ سب گھر والوں سے نظریں چراتا ہوا صحن میں بچھی کھری چارپائی پر ڈھے سا گیا۔ اس کے چارپائی پر گرتے ہی ساون نے باپ سے وڈیرے کی اوطاق میں بٹائی کے بارے میں پوچھا تھا اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ وڈیرے لکھ میر خان نے اس بار بھی انہیں ان کی محنت کا صلہ بہت کم دیا ہے تو حیرت اور غصے سے اپنے باپ سے بولا تھا۔ بیٹے کی بات پر موگو نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور دانت بھینچنے کے انداز میں اسے سرزنش کرتے ہوئے بولا۔

''ڑے آہستہ بات کر ہمارے مکان کی دیواریں چھوٹی ہیں کہیں باہر وڈیرے کے کسی آدمی یا چمچے نے سن لیا تو۔''

''تو کیا...... بگاڑ لے گا وڈیرا ہمارا...... بابا سائیں...... اپنے حق کے لیے بھی نہ بولیں تو لعنت ہے ایسی حیاتی پر۔ ہونہہ۔'' تیئس چوبیس کے سن کا گھبرو جوان ساون غصے سے اپنا پاؤں پٹختا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

پورے گھر میں ایک وہی کڑیل جوان تھا۔ جس سے اس کا باپ موگو ماں اور جوان بہن ہدایتاں، بری طرح خائف رہتے تھے۔ اس لیے کہ کہیں اس کی وڈیرے میر لکھ میر خان سے برگشتگی کی خبر حویلی تک نہ پہنچ جائے۔ ورنہ...... ورنہ...... یہ سوچ کر ان کا معصوم سا کمزور دل ہول سا جاتا تھا کیونکہ وہ پیر بخش کے بیٹے خیر بخش کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ بلکہ پورے گوٹھ کے لوگوں نے دیکھا تھا۔ جس نے بٹائی کے سلسلے میں وڈیرے میر لکھ میر خان کے آگے اکڑنے کی کوشش کی تھی اور آج تک اس کا پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ کہاں گیا۔ زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا مگر جاننے والے جانتے تھے کہ بے چارے پیر بخش کے بیٹے خیر بخش کو وہاں دھکیل دیا گیا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔

اس واقعے کو کافی سال بیت چکے تھے۔ ماں باپ دونوں اس کے اپنے جوان جہاں بیٹے کی گمشدگی پر پاگل ہوئے گوٹھ بستی بستی آج تک بے چارے دربدر ہوتے نظر آجاتے تھے۔ گوٹھ کے سادا لوح اور معصوم لوگ ان کی حالت پر آج بھی لرز اٹھتے تھے اور کمزور دل کی دیہاتن مائیں تو فوراً اپنے جوان بیٹوں کی بلائیں لینا شروع کردیتی تھیں۔ اگر کبھی ان کے لختِ جگر حویلی کے بارے میں کوئی ایسی ویسی باتیں منہ سے نکالتے۔

''ساون کے ابا مجھے تو ڈر لگتا ہے تجھے ابھی ساون بیٹے کو یہ نہیں بتانا چاہئے تھا۔ جا اس کے پیچھے کہیں وہ وڈیرے سائیں کے آدمیوں سے نہ منہ ماری کرلے۔'' ساون کے غصے سے گھر سے نکلتے ہی اس کی ماں نے اپنے شوہر موگو سے ازراہ تشویش کہا۔

''بابا...... میں کہتی ہوں ساون کو کام پر نہ لے جایا کر وڈیرے کی زمین پر اسے اس حساب کتاب کی بے انصافی سے دور ہی رکھ تو اچھا ہے۔'' ایک پرانی سی بوسیدہ اجرک کی چادر اوڑھے ساون سے ایک سال چھوٹی بہن ہداپتاں نے بھی اپنے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس نے سرخ رنگ کی کڑھائی والے گلے کی قمیض پہن رکھی تھی جبکہ شلوار کا رنگ مٹیالا سا تھا۔ بے چارا موگو کھری چارپائی پر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھا تھا۔

☆======☆======☆

اس بار ساون نے تہیہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ حویلی جاکر وڈیرے سے ضرور بات کرے گا اور اپنا پورا حق لے کر لوٹے گا۔ اس وقت شام کے سائے جھکنا شروع ہوگئے تھے چونکہ گرمیوں کی شام تھی اسی لیے ابھی گوٹھ کے چہار سوافق پر روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔

ساون کاندھوں پر اجرک ڈالے منگ اور چاولوں کے کھیتوں کے درمیانی کچے راستے پر چلا جارہا تھا۔ وہ ایک جوشیلا نوجوان تھا رنگت اس کی قدرے سانولی اور چہرے کے نقوش خالصتاً دیہاتی تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور چمکدار تھیں جسامت خاصی کسرتی تھی تاہم اس کی مجموعی شخصیت میں ایسی ایک خاص کشش تھی جو صنف نازک کو خاص طور پر اپنی جانب کسی غیر مرئی ڈور کے ذریعے کھینچنے کی قوت رکھتی تھی۔ مگر اس وقت غم و غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ ایک نہنگ کے درخت کے قریب سے گزرنے لگا، اچانک درخت کے عقب سے وہ پُراسرار سی اپسرا اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ''چھم'' سے اس کے سامنے آگئی اور ساون اسے دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گیا...... وہ سورٹھ تھی۔

اس کی چچازاد سورٹھ جو اکثر اس کے انتظار میں رہتی تھی وہ اب بڑی شوخ نگاہوں سے ساون کا راستہ روکے، اسے تکے جارہی تھی۔ اس وقت خنکی میں بتدریج اضافہ ہورہا تھا اور سرمئی سرمئی سا اندھیارا گوٹھ پر چھانا شروع ہوگیا تھا۔

''دیکھ سورٹھ! یوں اچانک میرے راستے میں نہ آیا کر...... کسی دن بری طرح لتاڑ کر رکھ دوں گا...... سمجھی...... ہٹ جا پرے......'' ساون اس کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے جارحانہ لہجے میں بولا۔

''اسی لئے تو تیرے آگے آتی ہوں۔'' جواں سال اور شوخ وشنگ سورٹھ نے ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کے انداز میں اور اپنی آنکھوں میں عجیب سا نشہ اتارتے ہوئے کہا...... اسے ساون کے جارحانہ لہجے نے گھائل کردیا تھا...... جسمانی نہیں بلکہ ذہنی طور پر...... جہاں دل ہوتا ہے...... جس میں ان گنت ناآسودہ خواہشوں اور جذبوں کی چنگاریاں سی دبی ہوئی ہوتی ہیں۔

ساون اکثر سورٹھ کے اس بے باکانہ طرز تخاطب پر ایک لمحے کو انگشت بدنداں رہ جاتا تھا۔ وہ اسے اس گوٹھ کی لگتی ہی نہیں تھی...... کم از کم گوٹھ کی الہڑ چھوکریوں کے ایسے لچھن نہیں ہوتے...... ''یہ...... یہ تو شہر کی چھوکری دکھائی پڑتی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو دانت پیس کر اندر ہی سورٹھ پر تبصرہ کرڈالتا۔

وہ اپنا راستہ بدلتے ہوئے خاموشی سے آگے بڑھنے لگا تو اسے عقب سے سورٹھ کی افسوس زدہ سی آواز سنائی دی...... ''رے ساون! تُو بتاتا کیوں نہیں...... کسے چاہتا ہے آخر تُو اتنا جو مجھ جیسی کو ہر بار یوں ٹھکرا کر چل دیتا ہے۔''

ساون کے چلتے چلتے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے...... وہ رک تو گیا مگر پیچھے سورٹھ کی طرف نہیں گھوما جو ہنوز اپنی ہی ترنگ میں بولتی ہوئی اس کے قریب آتی جارہی تھی۔

''میں تیری کھاتر روز روز اتنی محنت کرکے سنورتی ہوں...... اور...... اور...... یہ دیکھ''۔ وہ ساون کے دوبارہ سامنے آتے ہوئے اپنی کس کر باندھی ہوئی دونوں چوٹیاں دکھاتی، جن میں رنگین جھلمل اور چھنچھناتے ہوئے پراندے ڈالے ہوئے تھے۔

''اتنی کسوا کر یہ دونوں چوٹیاں بندھواتی ہوں کہ میری آنکھوں سے آنسو تک نکل آتے ہیں...... پر تُو ہے کہ......'' اس کے لہجے میں رقت سی اتر آتی۔

ساون اسے پھر بغور دیکھنے لگتا...... کہہ تو وہ درست رہی تھی...... اس کی سج دھج اگرچہ دیہاتی ہی انداز کی تھی مگر لگتا یہی تھا کہ وہ اپنے اسی دیہاتی طرز کے سولہ سنگھار میں کم

از کم آدھا دن ضرور گنوا دیتی ہوگی، لیکن باوجود اس کے ساون کو اس کے سرخی پاؤڈر سے تھپے ہوئے چہرے پر وہ بات ذرا بھی نظر نہ آئی جو...... اس سے آگے اس کا دل خود ہی کسی قسم کے تبصرے سے گریز کرنے لگتا۔

وہ پھر اپنا سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا...... اور سورٹھ...... اس بار اپنی جگہ کھڑی ساون کو جاتے ہوئے تکتی رہ گئی...... اس کے چمکیلے چہرے پر ٹھکرائے جانے کا تکدر امڈ آیا تھا۔

ساون تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بالآخر وڈیرے لکھ میر کی اوطاق میں پہنچا...... تو اس وقت وڈیرا لکھ میر خان موجود نہ تھا...... تاہم اسے وہاں اس کا منشی میرل منگن ہار مل گیا۔

''بھوتار سائیں نے میرے بابا کو فصل میں سے صرف تیسرا حصہ کیوں دیا ہے...... ہم کو تو آدھوا دھ ملنا چاہئے تھا...... ساری محنت ہم بھوگتے ہیں۔''

ساون اپنے کاندھوں سے اجرک اتار کر دوبارہ کاندھے پر دھرتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں بولا، تو منشی میرل ہی نہیں بلکہ وہاں موجود دیگر حویلی کے چاکر اور خدمت گار بھی ساون کی جرأت رندانہ پر دنگ رہ گئے تھے۔ تاہم منشی میرل تیکھی نظروں سے ساون کے جوش میں بھرے ہوئے چہرے کی طرف تکتا رہا پھر اس کے ذرا قریب آ کر کڑک دار لہجے میں بولا۔ ''ڑے ساون! اپنی اوقات میں رہ کر بات کر...... تو ہمارا ''رہاک'' ہے۔ ''اجارہ دار'' بننے کی کوشش مت کر......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اثنائے راہ ساون کا مجہول و مدقوق سا باپ موگو بھی پھولی ہوئی سانسوں کی ڈور پر قابو پاتا وہاں آن پہنچا۔ اس کے پیروں میں جوتیاں بھی نہ تھیں۔ صرف بوسیدہ سی تہبند اور میلی سی کمری پر سردی سے بچاؤ کے لیے پھٹی پرانی بوری ادھیڑ کر چادر کی طرح لپیٹ رکھی تھی۔ لگتا تھا وہ اپنے بیٹے ساون کا پیچھا کرتا بھاگتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔

باپ کو اچانک وہاں دیکھ کر ساون خفت سی محسوس ہونے لگی۔

''اچھا ہوا تو آ گیا موگو...... لے جا اڑیں اس جیوٹ پٹ ساون نوں...... اور سمجھا اسے ہر ''جگہ'' برسنے والی نہیں ہوتی ہے۔'' منشی میرل نے موگو کو مخاطب کرتے ہوئے سرسراتے لہجے میں کہا۔ اس کی تیز نظریں ہنوز ساون کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

موگو فوراً منشی میرل کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا لہٰذا ہاتھ جوڑتے ہوئے التجائیہ لہجے میں بولا۔ ''مم...... منشی سائیں، چھوکرا ہے...... بچہ ہے...... اسے ماپھ کر دے...... اس نے جو کہا...... میں اس کی آپ سے ماپھی مانگ لیتا ہوں پر، پر سائیں بھوتار وڈے کو اس بات

کا پتہ نہ لگے کہ میڈا اپٹ ساون ہتھے آیا تھا۔''

ساون کو باپ کے انداز چاکری پر خفت سی محسوس ہونے لگی اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولنا چاہا تھا کہ موگو نے اسے فوراً جھڑکتے ہوئے کہا...... ''چل چپ ہو جا...... تو جا گھر اس طرح یہاں اوطاق میں نہیں آتے...... وہ تو منشی صایئب اپنا آدمی ہے یہ بات بھوتار سائیں وڈے...... تک نہیں جائے گی...... ورنہ بھوتار سائیں بھی ناراج ہو گیا تو ہماری کھیر نہیں ہووے گی۔ چل...... جا گھر...... بھاگ۔'' موگو معصومانہ انداز میں یوں بولا جیسے ساون پانچ چھ سال کا ایک نادان بچہ ہو...... ساون خود کو اب بری طرح خجل سا محسوس کرنے لگا اور اس کی آنکھوں میں درشتگی سی اتر آئی تھی اور وہ اپنے باپ کی طرف ایک لمحہ تیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے اوطاق سے نکلتے ہی موگو ایک بار پھر اکڑے ہوئے کھڑے منشی میرل کے قریب آیا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑگڑانے والے انداز میں گویا ہوا۔ ''منشی سائیں! ایک بار پھر میری عرض گزارش ہے کہ بھوتار وڈیرے تک یہ بات نہ جائے...... تیری مہربانی ہو گی...... تو...... تو گڑتی نہ کر تین بوریاں چاولوں کی میں کھد اپنی کمر پر رکھ کر تیرے گھر دے جاؤں گا......'' اس کی بات پر منشی میرل کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں اور اس کا لہجہ بھی ذرا نرم ہوا۔ لہٰذا وہ آہستگی سے اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''دیکھ موگو...... میں تیرا سچا ہمدرد ہوں...... وڈیرے سائیں کے سامنے ہر وقت تیری سفارشی تعریفیں کرتا رہتا ہوں تا کہ تجھے زیادہ کام اور آسانی ملے، پر اڑیں ساون کو بھی لگام دے کر رکھ...... اب بتا بھلا یہاں خود وڈیرا سائیں موجود ہوتا تو چھوڑتا تیرے بیٹے کو......؟'' منشی کی بات پر موگو بے چارہ پُرتشویش انداز میں اپنا سر ہلانے لگا۔

☆======☆======☆

ادھر بے چاری اللہ رکھی چچا کے ہاں مشق ستم بنی لشتم پشتم اپنی زندگی گزار رہی تھی وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ دن بہ دن اس پر کام کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے گھر کے سارے کام کاج سے لے کر دن میں دو بار نہر سے پانی کے تین تین گھڑے بھر کے لانے کے ساتھ اب اس کو کھیتوں میں بھی کام کرنا پڑتا تھا، اس وقت بھی وہ شام گئے نہر سے تین گھڑے پانی سے لبالب بھر کر لا رہی تھی۔ دو گھڑے سر پر رکھے ہوئے تھے جبکہ تیسرا گھڑا اس نے اپنی لچکیلی کمر کو خم دے کر اٹھا رکھا تھا۔ وہ تھکن سے چور چور ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے گورے گورے پاؤں جوتوں سے بے نیاز تھے...... وہ تین پانی سے بھرے گھڑوں کا بوجھ اپنی نازک اور

کمزور جان پر سہارے بھربھری زمین پر بہ مشکل چل رہی تھی...... وجہ بھربھری مٹی میں چھپے ہوئے وہ جھاڑی دار کانٹے تھے جنہوں نے اس کے ننگے پیروں کو بری طرح زخمی کر دیا تھا اور نتیجتاً وہ تکلیف سے دہری ہوگئی تھی اور پانی سے لبالب بھرے ہوئے تینوں گھڑے نیچے آ رہے...... جنہیں وہ دوبارہ نہر کے کنارے بھرنے کے لیے لوٹی تھی...... گھڑے سر سے پھسلنے کی وجہ سے اس کے کپڑے بھی گیلے ہو کر اس کے بدن کے ساتھ چپک کر مشکل کا باعث بن رہے تھے...... گیلے ہونے کی وجہ سے اللہ رکھی کو ٹھنڈ بھی لگ رہی تھی اور پاؤں میں کانٹوں کی چبھن آمیز تکلیف اس پر سوا تھی، وہ بمشکل تیز تیز قدموں سے کچی پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔

معاً سامنے سے اسے کوئی تیز تیز آتا ہوا دکھائی دیا...... اللہ رکھی جلدی سے کچے راستے کے دوسرے کنارے کی طرف ہوگئی...... تاہم اس کی محتاط نگاہیں سامنے سے آتے ہوئے اس شخص پر جمی ہوئی تھیں جس کی شبیہ اب مدہم روشنی میں واضح ہونا شروع ہوگئی تھی وہ ساون تھا...... جو اللہ رکھی کو دیکھ کر اور اس کے قریب پہنچتے ہی رک گیا...... جانے کیا ہوا کہ اللہ رکھی بھی اسے دیکھ کر رک گئی...... دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں...... پھر یوں ہوا کہ ساون نے ایک نظر اللہ رکھی کے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بھیگے بدن پر ڈالی۔ اس کے بعد اس نے فوراً اپنے اوپر اوڑھی ہوئی موٹی سی سرمئی رنگ کی چادر اتار کر اس کی جانب بڑھائی اور قدرے اکھڑ لہجے میں بولا...... ”ڑی چھوکری تیرے پاس اگر اپنا بدن ڈھانپنے کے لیے چادر نہیں ہے تو پھر اتنا گیلا کیوں کرتی ہے تو خود کو...... لے یہ اوڑھ لے......“

اللہ رکھی یک ٹک کبھی ساون کو کبھی اس کی اپنی جانب بڑھائی ہوئی چادر کو تکنے لگی...... اسے ساون کے اکھڑ لہجے میں ایک جوش اور اپنائیت محسوس ہوئی تھی...... جانے پھر کیا ہوا کہ اللہ رکھی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے جو ساون کی نظروں سے چھپے نہ رہ سکے وہ ذرا بوکھلا سا گیا، وہ سمجھا شاید اس نے لڑکی کے ساتھ ذرا زیادتی کر دی ہے لہٰذا فوراً اپنے دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس کے سر پر رکھے گھڑوں کا بوجھ لینے کی غرض سے ذرا معتدل لہجے میں بولا...... ”لا...... ڑی...... رومت...... گھڑے مجھے پکڑا دے اور تو یہ چادر اوڑھ لے...... ٹھنڈ بھی ہے اور یوں تیرا بھیگنا اچھا بھی نہیں...... لا...... شاباش......“

اس نے اپنائیت سے کہا تو بے اختیار اللہ رکھی نے اپنی نگاہیں نیچے کر لیں...... ساون نے اس کا اقرار سمجھتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کے سر سے دونوں گھڑے اتار کر زمین پر رکھ دیئے پھر اسے اچھی طرح سے چادر اڑھانے کے بعد دوبارہ دونوں گھڑے باری باری اس کے

سر پر رکھوا دیئے...... دوسرا گھڑا سر پر رکھواتے وقت معاً وہ ذرا سا چھلک گیا اور ساون کا جسم بھیگ گیا ایک بار پھر دونوں کی نظریں بہت قریب سے چار ہوئیں اور اس بار دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کے دلوں میں اتر رہے ہوں...... چند ثانیے دونوں کو ایسے ہی گم صم کھڑے گزر گئے...... اللہ رکھی کو گھڑوں کا بوجھ اس انوکھی کیفیت کے دوران بالکل محسوس نہیں ہوا۔

پھر اللہ رکھی نے ہی محویت کے اس الفت آمیز سکوت کو توڑا...... ”تت...... تو بھی تو بھیگ گیا...... تجھے جو سردی لگ جائے تو......“

اس کی بات پر ساون چونک کر ذرا دور ہو گیا...... اس اتفاقی نزدیکی کے بیچ معاً فاصلہ آیا تو خرد نے ساون کو جیسے محتاط سا کر دیا...... دراصل وہ خود بڑا لئے دیئے رہنے والا شخص تھا...... تاہم اللہ رکھی کی بات پر پہلی بار ہولے سے مسکرا کر بولا...... ”میری خیر ہے...... جس کے جسم میں ہر وقت سر سے لے کر پاؤں تک گرم لہو آگ بن کر دوڑ رہا ہو...... بھلا یہ چند پانی کے چھینٹے کیا بگاڑ لیں گے اس کا...... جا اب تو“۔...... اس کا لہجہ ایکا ایکی آتشیں ہو گیا تھا جس کی تپش اللہ رکھی کو بھی محسوس ہوئی تھی...... ساون آگے بڑھ چکا تھا...... مگر اللہ رکھی وہیں کھڑے کھڑے کہیں اور پہنچ چکی تھی۔ بالکل الگ دنیا میں...... باپ کے مرنے کے بعد زندگی میں جس قدر کٹھنائیاں وہ اب تک جھیلتی آئی تھی...... ایک اجنبی جوان کے محض چند ہمدردانہ بول نے اس اذیت ناک لمحوں کے دیئے ہوئے زخموں پر مرہم کا کام کیا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ کسی کی تکلیف کا ایسا پُرخلوص احساس تو کوئی اپنا ہی کر سکتا ہے مگر......

مگر یہ نوجوان تو ایک اجنبی تھا...... اس کا چہرہ سرخ سا ہونے لگا، جسم کے گرد اوڑھی ہوئی بلکہ اجنبی نوجوان کے ہاتھوں اڑھائی گئی...... وہ چادر اللہ رکھی کو یوں محسوس ہونے لگی جیسے وہ نوجوان اس کے گیلے شریر سے قریب ہو۔

اس نے یک دم گھبرا کر اپنے قدم آگے بڑھا دیئے...... وہ گھر پہنچی تو چاچی عنایتاں جیسے ادھار کھائے بیٹھی تھی لگی لتے لینے۔

”ڑی چھوری! ادھر آ...... ذرا...... اتنی دیر لگا دی تو نے...... رات سر پر آنے کو ہے۔ باقی کا کام کیا تیرا باپ کرے گا قبر سے نکل کر......“ چاچی عنایتاں کا سخت لہجہ اللہ رکھی کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیتا...... اپنے مرحوم باپ کے طعنے پر وہ کلس کر رہ جاتی بے چاری...... تاہم وہ صبر کے گھونٹ بھرتے ہوئے خاموشی سے بوسیدہ اور کچے صحن کے ایک کونے میں رکھی لکڑی کی گھڑونچی کے قریب آئی اور اپنے سر سے گھڑے اتار کر اس پر رکھنے

لگی...... ادھر چاچی عنایتاں کی گھاگ نگاہیں اللہ رکھی کے سراپے کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں...... اس کی بدلی بدلی کیفیت چاچی عنایتاں سے چھپی نہ رہ سکتی تھی اس پر سوا وہ سرمئی رنگت کی چادر تھی۔

''اڑی...... ذرا ادھر تو آ......'' معاً چاچی عنایتاں نے سرسراتے لہجے میں اسے اپنی چارپائی کے قریب بلایا۔ اللہ رکھی جھجکتے ہوئے قریب آئی۔

''یہ...... چادر تیرے کون سے یار نے دی ہے تجھے......'' عنایتاں چاچی قدرے گہرے لہجے میں اس سے بولی۔ اس کی بات پر اللہ رکھی کے گھبرائے ہوئے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے، لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ حیرت انگیز طور پر کھرا اور سچا تھا۔

''چاچی...... میں راستے میں آ رہی تھی کوئی لڑکا ملا تھا...... اس نے اپنی یہ چادر اتار کر مجھے اڑھا دی تھی...... کیونکہ نہر سے پانی بھرتے ہوئے میں بھیگ گئی تھی......'' اتنا بتا کر اللہ رکھی نے اپنا سر جھکا لیا۔

چاچی عنایتاں۔ کے چہرے پر پہلے تو اپنی سیدھی سادی بھتیجی کی صاف گوئی پر حیرت کے ڈونگرے برسنے لگے...... پھر وہ نوٹنکی کے سے انداز میں اپنا ہاتھ نچاتے ہوئے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے بولی۔ ''ہائے ڑی...... میں قربان جاؤں، صدقے جاؤں...... تیری اس سسی پنوں والی کہانی پر...... ڑی اس اپنے پنوں...... کا نام تو بتا ناں...... ذرا......''

اللہ رکھی بے چاری سٹپٹا سی گئی...... چاچی کے منہ سے سسی پنوں...... کا نام سن کر وہ ایک لمحے کو چونکی تھی...... وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی...... ہاں البتہ جب اس کا بابا سائیں زندہ تھا تو اس نے گوٹھ کے پرانی اور سالخوردہ سی پیلے رنگ کی عمارت والے اسکول میں کھینچ کھانچ کر پانچ جماعتیں پڑھ ڈالی تھیں۔ اس زمانے میں اس نے سسی پنوں کی اور عمر ماروی کی لوک داستانیں پڑھی اور سن رکھی تھیں...... یہی وجہ تھی کہ جب چاچی نے اسے اور اجنبی نوجوان کے اس اتفاقی تعلق کو چاہے...... طنزاً یا تمسخرانہ ہی سہی تشبیہہ دی تو یکبارگی اللہ رکھی...... کے اندر عجیب سی مسرت نے سر ابھارا تھا۔

''ڑی...... چھوری...... کہاں چلی گئی...... کدھر کھو گئی تو......؟'' جہاندیدہ چاچی عنایتاں کی کھوجتی نگاہوں نے جیسے اللہ رکھی کے بدلتے چہرے کی مسرت آمیز کروٹوں کو بھانپتے ہوئے دوبارہ اور قدرے بلند آواز میں کہا تو اللہ رکھی جیسے زور سے چونک پڑی۔

''کک...... کیا...... مم...... میں...... کک...... کہیں نہیں گئی...... یہیں کھڑی ہوں۔'' بوکھلاہٹ میں اس کے ہونٹوں سے الفاظ جیسے پھسلے۔

''ہائے ڑی...... اماں...... گھوڑا ڑے...... چھوری تو تجھے ہو کیا گیا ہے......'' یہ کہتے ہوئے چاچی عنایتاں اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے یک دم چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ رائی کا پہاڑ بنانے والی عورتوں میں سے تھی...... بے چاری اللہ رکھی...... بری طرح سہم کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی...... اثنائے راہ...... عنایتاں کا شوہر سوڈھل کھانستا ہوا اندر داخل ہوا...... اللہ رکھی نے ہولے سے سلام کیا...... سوڈھل نے بھی شفقت بکھیرتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا...... پھر جیسے دونوں کو ہی مخاطب کرتے ہوئے بولا......'' یہ تم دونوں اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں بیٹھے ہو...... اندر آ جاؤ......''

''پہلے ذرا اپنی اس لاڈلی سدھوری کے کارنامے تو سن لے......'' چاچی عنایتاں تند لہجے میں اپنے شوہر سے بولی۔

''ہاں...... ہاں سن لوں گا...... پر تُو خواہ مخواہ میڈی دھی کے پیچھے نہیں پڑی رہا کر...... چل اندر تو آ جا......'' سوڈھل قدرے بیزاری کے ساتھ عنایتاں سے بولا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

چاچی عنایتاں بھی اس کے پیچھے تیز تیز چلتی ہوئی اندر آ گئی...... البتہ اللہ رکھی کو اس نے باہر صحن ہی میں کسی کام پر لگا دیا...... کمرے میں آتے ہی جب اس نے اللہ رکھی کی شکایت کرنے کے لیے اپنا منہ کھولا تو سوڈھل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا...... اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا......'' کیوں تو اپنی جان جلاتی ہے بلاوجہ...... تجھے سمجھایا بھی ہے میں نے کہ اسے زیادہ تنگ مت کر...... یہ سونے کی چڑیا ہے...... پھُر سے اڑ جائے گی کسی دن...... تھوڑا صبر کر لے...... میں اس کا سودا...... دودا خان سے کرنے ہی والا ہوں۔'' اس کا لہجہ آخر میں سرگوشیانہ ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے عنایتاں کے منہ سے ہاتھ بھی ہٹا لیا۔

''یہی تو تجھے بتانے لگی ہوں کہ جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لے...... کم بخت پر جوانی بھی ایسی آئی ہے...... ایسا نہ ہو گوٹھ کے کسی چھوکرے کے ساتھ ہوا ہو جائے...... آج یہی کیس تو ہوا ہے اس کے ساتھ۔'' بیوی کی بات پر سوڈھل قدرے چونکا۔

''کیا ہوا ہے......؟''

پھر مختصراً اس نے اللہ رکھی کی صاف گوئی سے بتائی ہوئی بات اپنے شوہر کو سنا دی سوڈھل یہ سن کر ہنس پڑا بولا...... ''اڑی تُو بھی کوئی چری مائی ہے، اللہ رکھی...... ایسی نہیں ہے''۔

''ہاؤ...... ہاؤ...... اب ایسی بھی ستی ساوتری نہیں ہے وہ...... پتہ ہے تجھے یہ ساری رام کہانی اس نے بڑے لذت بھرے انداز میں مجھے سنائی ہے...... جیسے عمر ماروی یا سسی پنوں کی داستان سنا رہی ہو......'' سوڈھل اس کی بات پر بدستور ہنستا رہا۔

☆======☆======☆

گرم لوہے پر گرنے والے پانی کے چھینٹے ''شائیں'' کی آواز نکالتے ہیں...... ساون جیسے کڑیل اور گرم جوش نوجوان پر جب محبت کی پہلی پھوار پڑی تو بے اختیار دل سے اس کے ''ہائیں'' کی صدا بلند ہوگئی۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا...... لیکن اب پہلے کی طرح اس کی قدموں میں تیزی نہیں رہی تھی...... آہستگی اور دھیما پن آ گیا تھا اس کی چال میں کیونکہ اس کا دل کہیں اور ہی اٹک گیا تھا...... کہنے کو وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا مگر پہنچ کہیں اور گیا تھا...... چلتے چلتے وہ سوچنے لگا...... ایسا کیا تھا آخر اس تین گھڑے اٹھائے ہوئے لڑکی میں...... اور بھی تو گوٹھ کی لڑکیاں میرے قریب سے گزرتی تھیں...... کئی ایک تو اس پر ''شرمیلا طوطا'' والی پھبتی بھی کس دیتی تھیں مگر وہ ذرا بھی ان سے متاثر نہیں ہوتا...... سب سے بڑی مثال اس کی چچازاد اور حسن دلآویز کی مالک سورٹھ تھی...... وہ کس قدر اس کے قریب آ جاتی تھی...... مگر پھر بھی اس کا دل سرد نہیں پگھلا تھا۔ اس معصوم اور سادہ سا حسن رکھنے والی لڑکی کو اپنی سرمئی چادر اڑھانے اور پھر اس کے پانی سے بھرے گھڑے اٹھانے والے چند ثانیے میں...... ساون کو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ عرصے سے اس کے سینے میں جما گلیشیئر رفتہ رفتہ پگھل رہا ہو...... وہاں اب کسی کی چاہت کی نو دمیدہ کونپل سی پھوٹنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ چہرہ ساون کو اپنی آنکھ کی پتلی بنا ہوا محسوس ہو رہا تھا جو ہٹائے نہیں ہٹ رہا تھا۔ گھر پہنچ کر اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ گھر سے...... کس عالم میں اور کیونکر نکلا تھا...... بس کھویا کھویا سا اپنے گارے مٹی کی دیواروں والے کمرے میں موجود رلی بچھی چارپائی پر گر سا گیا...... اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر کی کوئی شے راستے میں کہیں گرا سا آیا ہے...... کچھ ایسی ہی بے چینی طاری تھی اس پر۔ وڈیرے لکھ میر خان کی طرف سے ملنے والی کم بٹائی کا غصہ بھی جانے کہاں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا...... ماں بہن کو بھی وہ ویسا نظر نہیں آ رہا تھا جیسا کہ طیش کے عالم میں وڈیرے میر لکھ میر خان کی حویلی کی جانب روانہ ہوا تھا۔ کھانا بھی اس نے بے دلی کے ساتھ کھایا تھا...... ماں اس کی متفکر سی بیٹے کے پاس آئی۔ ''پٹ! خیر تو ہے نہ...... طبیعت چاک ہے...... وڈیرے سائیں سے کوئی بات تو نہیں ہوئی نا۔'' اس بے چاری کو وڈیرے کا خدشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں اس سے یا

وڈیرے کے آدمیوں سے اس کی منہ ماری تو نہیں ہوگئی۔

ساون ماں کی بات پر کھوئے کھوئے سے انداز میں چونکا...... ''آں...... ماں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تو کُڑتی نہ کر...... پر بابا سائیں کو حویلی میرے پیچھے نہیں آنا چاہئے تھا......'' اس نے بتایا۔

اسی وقت اس کی جوان مگر چھوٹی بہن ہدایتاں بھی بھائی کے لیے دودھ کا گلاس لیے اندر داخل ہوئی...... اس نے ساون کی بات سن لی تھی لہٰذا اس کی تائید میں بولی۔ ''میں نے بابا کو منع بھی کیا تھا کہ نہ جائے...... پر اماں نے......'' ماں کی جانب کن انکھیوں سے دیکھ کر وہ چپ ہو رہی۔

''میں اتنا خر مغز تھوڑا ہی ہوں...... جو حویلی جا کر وڈیرے سے منہ ماری کروں گا...... میں تو بس ایک بات کرنے گیا تھا...... ویسے وڈیرا نہیں ملا تھا...... منشی سے بھی صرف اتنا ہی کہا تھا کہ فصل سے ہمیں حصہ کیوں کم ملا ہے۔'' ساون نے کہا اور دودھ کا گلاس اپنی بہن ہدایتاں سے لے کر گھونٹ بھرا...... ساون کی ماں نے طمانیت بھری سانس خارج کی اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

''اری ہدایتاں!'' ماں کے کمرے سے نکلتے ہی ساون نے بہن کو مخاطب کیا۔

''ہاں ادا......!'' ہدایتاں بولی۔ ساون چند ثانیے خاموشی سے سوچتا رہا پھر بولا۔

''کچھ نہیں...... بس تو جا......''

ہدایتاں حیران حیران نظروں سے بھائی کو تکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور ساون رلی بچھی چارپائی پر اپنے دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں...... وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

☆======☆======☆

دودا خان کا یہ چھپر ہوٹل ایسا ہی تھا جیسا کہ دور دراز کے گوٹھوں میں ہوتا ہے، اس وقت نارنجی سورج دن بھر چمکیلی اور خوشگوار دھوپ...... نچھاور کرنے کے بعد تھکا ہارا دور مغربی ٹیلوں کے عقب میں آتشی گولے کی طرح لڑھک رہا تھا...... چھپر ہوٹل کے احاطے میں لکڑی کی بنچیں اور میزیں وغیرہ پھیلی ہوئی تھیں، ہوٹل کی گارے مٹی سے بنی ہوئی سالخوردہ سی عمارت میں ایک بڑا سا کوٹھڑی نما کچا کمرہ بھی تھا جہاں ہر وقت جوا اور شراب کا بازار گرم رہتا تھا۔

''کاؤنٹر'' نام کی ایک بڑی سالخوردہ میز کے عقب میں بیٹھا، خاکستری رنگت اور

چمرخ سا بوڑھا شخص اپنے ہوٹل میں چلنے والے ٹیپ ریکارڈر کی آواز اونچی کر رہا تھا...... جس میں لوک گلوکارہ ''مائی بھاگی'' ''دو بیڑو'' کا لوک گیت راگ ''گھڑو'' میں نغمہ سرا تھی۔

ذرا دور جو، گوار اور منگ کی لہلہاتی فصلوں کے کنارے کنارے جاں نثار محافظوں کی طرح صف بستہ کھوا ور نہنگ کے پیڑ کافی آگے تک چلے گئے تھے۔ اس وقت ہوٹل میں لوگوں کا رش نہ ہونے برابر تھا، چند ایک ہاری مزدوروں کی ٹولیاں ایک جانب کچہریوں میں مشغول تھے اور کچھ لوگ اندر کچی کوٹھڑی میں بیٹھے جوا کھیلنے میں مصروف تھے۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا وہ کالی رنگت والا بڈھا شخص بلاشبہ ہوٹل کا مالک دودا خان تھا، وہ ساٹھ سے اوپر کا تھا لیکن ابھی تک جوانی کے درپے تھا سفید بالوں کو اس نے سیاہ کر رکھا تھا۔ اس کا لمبوترا اور پتلا بدہیت سا چہرہ مزید سیاہ نظر آرہا تھا۔ اس نے شیشوں کے کام والی سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی اور مٹھی میں بیڑی دبائی ہوئی تھی...... معاً وہ اپنے ہوٹل کے احاطے میں ایک شخص کو آتے دیکھ کر چونک گیا...... اس نے جلدی سے ٹیپ ریکارڈ کی آواز دھیمی کی اور مذکورہ شخص کو وہیں ''دغل'' پر بیٹھے بیٹھے پکارا...... ''ڑے سوڈھل!...... بابا ادھر آ۔'' وہ سوڈھل ہی تھا اللہ رکھی کا چاچا جواب دودا خان کے پکارنے پر اسی کی جانب چلا آرہا تھا۔

''آبابا آ...... بھلی کرے آیو (خوش آمدید) بسم اللہ بابا...... آؤ بیٹھو......'' دودا خان نے خالصتاً مقامی انداز میں اس کا پُرتپاک استقبال کیا اور قریب ہی بوسیدہ سے کاؤنٹر کے پاس دھرے سرکنڈوں کے ایک مونڈھے پر سوڈھل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''دودا خان! کیسے ہو تم...... بال بچہ تو راضی خوشی ہے...... چاک ہیں نا سب......'' سوڈھل نے بھی رسمی کلمات کا جواباً تبادلہ کرنا ضروری سمجھا۔

''اور سناؤ......سوڈھل! یار آج کل تو تیری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے......'' دودا خان معنی خیز لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی ایک چھوکرے کو آواز دے کر ''کڑک چائے'' لانے کا کہا۔

سوڈھل دودا خان کا اشارہ سمجھ گیا تاہم تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''اپنی ایسی قسمت کہاں یار دودا خان...... بھائی مٹھل کے مرنے کے بعد تو الٹا بھتیجی کی ذمہ واری بھی میرے کمزور کاندھوں پر آن پڑی ہے۔''

''اچھا چھوڑ اس فضول تکرار کو...... مطلب کی بات کر میرے ساتھ......'' سوڈھل نے بالآخر کہا اور مٹھی میں دبی بیڑی کا کش لگا کر دھواں فضاء میں اُگلا، پھر چٹکی بجائی اور اپنے سامنے کاؤنٹر پر رکھی مختلف شیشے کی برنیوں میں سے ایک کو کھول کر کیک پیس نکالے

اور پلیٹ میں رکھ کر سوڈھل کی جانب بڑھا دیئے......'' لے یہ کھا جب تک چائے آتی ہے۔ اس کے بعد اصلی بیڑی پلاؤں گا تجھے۔''

سوڈھل پلاسٹک کی پلیٹ سے کیک اٹھا کر کھانے لگا اس دوران چائے بھی آگئی...... دودا خان ایک خاص نگاہ سوڈھل کے چہرے پر ڈالتے ہوئے...... گویا ایک ضرب لوہار کی لگاتے ہوئے قدرے جھک کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا......'' پھر کیا سوچا تُو نے؟ پچاس ہزار میں مجھے رشتہ دے گا اللہ رکھی کا......'' یہ سن کر سوڈھل کا دل اچھل کر حلق میں آگیا...... اگرچہ دودا خان پہلے بھی سوڈھل سے یہ بات کر چکا تھا...... اور خود سوڈھل کو بھی دودا خان سے اس بات کی توقع تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ تھا کہ سوڈھل آیا ہی دودا خان کے ہوٹل اسی مقصد کے لیے تھا...... اور ہر بار دودا خان کے منہ سے اللہ رکھی کے رشتے کے عوض پچاس ہزار کی رقم کا سن کر اس کا دل حلق میں آکر اٹکتا تھا...... لالچی اور خود غرض سوڈھل کو اس بات کی کوئی غرض نہ تھی کہ اس کی بھتیجی اللہ رکھی کسی طور بھی اس گدھ کے لائق نہ تھی جو اللہ رکھی کے باپ کیا بلکہ دادا کی عمر کا لگتا تھا۔ سوڈھل کو تو صرف ان روپوں سے غرض تھی جو دودا خان اسے اللہ رکھی سے شادی کے بدلے میں بطور ''خرچہ'' دے رہا تھا۔

سوڈھل کو کسی سوچ میں مستغرق پا کر دودا خان نے پھر ایک، بیڑی کا کش لگایا اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے دوبارہ بولا......'' سوڈھل بابا...... پہلے گرم گرم چائے کی چسکیاں لگا لے آرام سے تاکہ سردی سے جو تیرے دماغ کی نسیں سکڑی ہوئی ہیں وہ کھلیں۔ اڑے بابا سوچنا کیا۔ یار تُو بھی چریا ہے کوئی...... میری پیشکش ٹھکرانے سے تجھے کچھ نہیں ملے گا...... ویسے تیری مرضی...... زبردستی نہیں ہے...... تُو جانتا ہے مجھے...... گوٹھ میں ایک سے ایک رشتہ لڑکی کا مل سکتا ہے......''

''نہیں...... نہیں یار دودا سائیں! ایسی بات نہیں ہے...... میں بس ویسے ہی کچھ سوچ رہا تھا......'' سوڈھل فوراً بات بناتے ہوئے بولا کہ کہیں دودا خان جیسی اسامی ہاتھ سے نہ نکل جائے تاہم سوڈھل کو اس بات کا پورا پورا ادراک تھا کہ یہ بوڑھا گدھ اس کی بھتیجی اللہ رکھی سے ہر صورت شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ خاموشی سے چائے پینے لگا، دودا خان نے دانستہ سوڈھل کی حریصانہ فطرت کو مدنگاہ رکھتے ہوئے ہوا میں ایک تیر پھینکا تھا جو نشانے پر لگا تھا...... درحقیقت دودا خان کی نظر اس وقت سے ہی اللہ رکھی پر تھی جب اللہ رکھی کا باپ مٹھل زندہ تھا...... مگر مٹھل نے دودا خان جیسے بوڑھے گدھ کا رشتہ اپنی پھول سی بیٹی کے لیے نہ صرف ٹھکرا دیا تھا بلکہ آئندہ کے لیے بھی اسے خبردار کر دیا تھا کہ پھر کبھی ایسی بات وہ

زبان پر لایا تو پوری برادری سے اس کی شکایت کردے گا۔ دودا خان اپنا سامنہ لے کر رہ گیا تھا مگر باز پھر بھی نہ آیا۔ اس کے منصوبہ ساز دماغ نے ایک اور چال سوچی...... اس نے مٹھل کے بھائی سوڈھل سے راہ ورسم بڑھانے شروع کر دیئے اور اسے چند روپے بھی اس مد میں تھماتا رہا کہ وہ اپنے ٹیڑھی کھیر جیسی صفت رکھنے والے بھائی مٹھل کو اللہ رکھی کا رشتہ دینے کے لیے راضی کر لے۔

''دیکھ بھائی مٹھل...... آ پڑیں اللہ رکھی...... دودا خان کے پاس سکھی رہے گی...... بہت پیسہ ہے اس کے پاس......'' بالآخر ایک دن چند ٹکوں کے عوض بکنے والا سوڈھل دودا خان کے ایماء پر اپنے بھائی کے ہاں اس کا رشتہ لینے جا پہنچا۔ مٹھل اپنے بھائی کی بات پر بری طرح چراغ پا ہو گیا...... مگر چونکہ سامنے بھائی تھا اسی لئے ضبط سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

''بھائی سوڈھل...... مجھے آج تیری بات سن کر بہت رنج ہوا...... میں سمجھتا تھا کہ تُو میری بیٹی اللہ رکھی کو بھی اپنی بیٹی سمجھتا ہے...... مگر میرا یہ خیال آج غلط ثابت ہوا...... اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بول، اگر تیری اپنی کوئی بیٹی ہوتی تو کیا تو......'' مٹھل کی بات پر سوڈھل کو چپ لگ گئی اور وہ اپنا سامنہ لے کر آ گیا۔ اب جبکہ اللہ رکھی جسے سوڈھل سونے کی چڑیا سمجھتا تھا...... مکمل طور پر اس کے تصرف میں تھی اور ادھر دودا خان کو بھی اپنی مراد بر آنے کی امید پوری ہوتی نظر آنے لگی تھی۔

سوڈھل نے کیک اور چائے وغیرہ چٹ کرنے کے بعد دودا خان سے ندیدوں کی طرح بیڑی مانگی...... دودا خان نے بڑے تپاک کے ساتھ کاغذی پڑیا سے بابو بیڑی نکال کر اسے پیش کرتے ہوئے دیا سلائی کے ذریعے سلگانے کا فریضہ بھی خود ہی انجام دیا۔

سوڈھل نے بیڑی کا ایک طویل کش لیا تو اسے ٹھسکہ سا لگا اور وہ کھانسنے لگا...... پھر کچھ سوچتی ہوئی نظروں سے دودا خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا...... ''دودا خان! یار...... مجھے مہلت دے تھوڑے دنوں کی......''

''سوچنے کی نہیں دے سکتا مہلت...... کیونکہ اب سوچنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے......'' دودا خان جواباً عیاری سے بولا۔

''تُو ٹھیک کہتا ہے...... میں سوچنے کی نہیں، بس ویسے ہی تھوڑے دن اور دے دے مجھے...... بس میری کوئی مجبوری سمجھ لے۔''

''اچھا ٹھیک ہے سوڈھل!...... پر ایک بات سن۔'' دودا خان نے کہا اور اپنی بات

جاری رکھتے ہوئے گویا متنبہ کیا...... ''میں نے سنا ہے...... تُو نے اللہ رکھی کو بالکل ہی کولہو کا بیل بنا رکھا ہے...... گھر کی اور باہر کی ذمہ داریاں بھی تُو نے اس کے نازک کاندھوں پر ڈال دی ہیں...... ایسا نہ ہو...... اسے بالکل نچوڑ کر میرے حوالے کر دے...... مجھے وہ بالکل صحت مند چاہئے...... سمجھا......'' سوڈھل اس کی بات سن کر خاصا جز بز سا ہوا اور اسے چور نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے سیاہ باریک ہونٹوں کے عقب سے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں یار...... دودا سائیں! اب ایسی بھی بات نہیں ہے...... تُو بے پھکر رہ......'' سوڈھل مبہم انداز میں جواب دیتے ہوئے رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی دودا خان بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے تک اسے رخصت کرنے آیا۔

☆======☆======☆

وہ ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ جس پگڈنڈی نما کچے اور ناہموار راستے پر ساون اجرک اوڑھے چلا جا رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں کھیتوں میں کئی ہاری کٹائی میں مشغول تھے جن میں عورتیں مرد سب ہی شامل تھے...... معاً اس کی نگاہ ایک جانب کھیت میں کام کرتی ہوئی اللہ رکھی پر پڑی اور وہ ٹھٹک گیا۔

اگرچہ ساون کو اللہ رکھی کے نام کا علم نہ تھا مگر وہ پہچان چکا تھا اسے کہ یہ لڑکی وہی تھی جس نے اس کے اندر عجیب سی ہلچل مچا دی تھی...... اس نے چلتے چلتے ہی ایک نگاہ اطراف میں ڈالی، کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ بالخصوص جدھر اللہ رکھی اپنے کام میں مشغول تھی اس کے آس پاس چند ہی عورتیں تھیں جو اس سے خاصی دور تھیں۔ ساون کا دل یکبارگی ایک لمحے کو عجیب انداز میں دھڑکا۔ اس کی وجہ معاً اندر ابھرنے والی وہ خواہش تھی جسے وہ فوری عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا...... لہٰذا اس نے اپنے سر پر ٹوپی درست کی...... اجرک کو ایک بار اتار کر دوبارہ کاندھوں پر رکھا اور نپے تلے قدموں سے چلتا ایسے راستے پر آ گیا جو اللہ رکھی کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا...... وہاں ایک کیکر کا گھنا پیڑ بھی تھا...... دوسرا ایک خوش کن امر یہ بھی تھا کہ اللہ رکھی گٹھیاں بناتی ہوئی اس کیکر کے درخت کے قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر جیسے ہی وہ درخت کے ذرا قریب پہنچی...... ساون بھی وہاں آن پہنچا...... اب ایک جانب سے درخت انہیں آڑ فراہم کر رہا تھا، ساون نے دیکھا کہ اللہ رکھی نے اس کی دی ہوئی وہ سرمئی چادر اوڑھ رکھی تھی جس دن ان دونوں کا سامنا نہر والے راستے پر ہوا تھا اور اللہ رکھی کے ضرورت سے زیادہ بھیگے ہوئے جسم پر اس نے

اپنی یہی چادر اسے اڑھا دی تھی۔ یہ دیکھ کر ساون کو ایک مسرت انگیز احساس نے نہال سا کر دیا تھا۔ اسی وقت...... اللہ رکھی کی بھی اس پر نظر پڑ گئی...... دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو من ہی من میں یہ عقدہ کھلا کہ ان پیاسی نگاہوں کو تو یہی منظر درکار تھا جو ان دونوں کے اندر محبت کی ایسی جوت جگا چکا تھا جس نے انہیں بے تابی کی سرحدوں تک پہنچا دیا تھا اور کچھ یہی وجہ تھی کہ وہ کافی دیر تک اسی طرح گم صم دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے...... پھر اللہ رکھی کی مدھ بھری اور کھوئی کھوئی آنکھوں میں ساون کو سرمدی شاعری کے مصرعے اترتے دکھائی دے گئے جو بلاشبہ اللہ رکھی کے دل کی ترجمانی کر رہے تھے۔

نین اٹھا کر ناز سے مجھ کو ساجن نے جب دیکھا مات
ہوئیں سورج کی کرنیں، چاند لگا مرجھانے
دیکھتے ساتھ ہی بن گئے خادم، کہکشاں اور تارے
ہائے! جمال یار سے ہر ایک چیز لگی شرمانے

پھر جواباً ساون کی آنکھوں نے بھی اپنا پیام دیا۔

سب سے ہیں آنکھیں مقدم عشق میں
یار کی صورت سے ان کو پیار ہے
ہے مگر خوبی نہاں اس بات میں
جس پہ قائم عشق کا معیار ہے
پیار اس سے صرف آنکھوں کا نہیں
اک انوکھی لذت گفتار ہے
التجا جو کچھ بھی رکھتا ہے لطیف
خوب واقف اس سے وہ دل دار ہے

''ڑی تیرا نام کیا ہے؟'' معاً ساون نے اس کا نام پوچھا۔
''اللہ رکھی''...... اللہ رکھی نے بھی کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا اور پھر اس کا نام پوچھتے ہوئے بولی...... ''اور تیرا نام؟''
''ساون''...... اس نے جواب دیا، دونوں اب مزید ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے...... نظروں کی کمندیں ہنوز آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔
ٹھیک اس وقت فضا بندوق کے زور دار دھماکے سے گونج اٹھی اور ساتھ ہی اللہ رکھی...... کی چیخ بلند ہوتی چلی گئی۔

بارہ بور بندوق کے فائر کی زوردار آواز کے ساتھ ہی اللہ رکھی کی تیز چیخ نے ساون کو بری طرح چونکا دیا تھا۔ اس کا دماغ چند ثانیے جھنجھنا سا گیا مگر جب اس نے اپنے سامنے کانوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھے اللہ رکھی کو صحیح سلامت کھڑے دیکھا تو اسے ذرا اطمینان ہوا۔ اس نے تیزی کے ساتھ بڑی خونخوار نگاہوں سے فائر کی آواز کی سمت دیکھا تو اس کی آنکھوں میں الجھن آمیز درشتگی عود کر آئی۔ بندوق بہ دست وہ شخص دودا خان تھا۔ عمر رسیدہ اور اکہری جسامت کا مالک دودا خان جو بھاری بھرکم ڈبل بیرل بندوق سنبھالے ان دونوں کو شکرے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا...... درمیانی فاصلہ کے کم ہونے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اترنے والی کرختگی کو بخوبی بھانپ چکے تھے۔ ذرا دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے چند لوگوں نے بھی چونکتی ہوئی نگاہوں کے ساتھ ان کی جانب دیکھا تھا۔

''دودا خان......! اگر تُو نے یہ شرارت کے طور پر فائر کیا ہے تو اس عمر میں تجھے یہ زیب نہیں دیتا جس کی تجھے بہر حال مجھ سے معافی مانگنی پڑے گی۔ اگر یہ دشمنی کا آغاز ہے تو یقین رکھنا...... میں ہوائی فائر کرنے کا عادی نہیں ہوں...... للکار کر سینے کا نشانہ لوں گا۔''
ساون نے اسے دھمکاتے ہوئے کہا تو دودا خان بندوق سنبھالے چند قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا تھا۔ وہ ساون کو گھورتے اور بندوق کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کر کے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔ ''فی الحال تو میں صرف تجھے اتنا خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ...... یہ لڑکی میری منگیتر ہے...... اور اگر میں نے دوبارہ تجھے اسے گھورتے ہوئے دیکھ لیا تو اگلی بار مجھے تیری جوانی پر بالکل رحم نہیں آئے گا سمجھے......'' یہ کہتے ہوئے وہ بھناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اللہ رکھی بے چاری ہکا بکا ساون کا چہرہ تکنے لگی جو عجیب سی نظروں کے ساتھ اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔
''اللہ رکھی!...... یہ...... یہ کیا کہہ رہا تھا...... کیا واقعی تیری اس کے ساتھ منگنی ہوئی ہے۔'' ساون نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''نن...... نہیں...... یہ...... یہ جھوٹ بولتا ہے...... میں تو اس کو جانتی بھی نہیں......'' اللہ رکھی نے گھبرا کر جواب دیا تو ساون نے جیسے ایک لمبی اور پُرسکون سی سانس لی۔ وہ دودا خان کو اچھی طرح جانتا تھا...... اکثر اس کے چھپر ہوٹل پر چائے پینے جایا کرتا تھا اور دودا خان کے ایک جوان بیٹے علی بخش سے اس کی ایک حد تک دعا سلام بھی تھی۔ دودا خان نے دو شادیاں پہلے سے کر رکھی تھیں...... پہلی بیوی مر چکی تھی۔ علی بخش پہلی بیوی کے بطن سے تھا

جبکہ دودا خان کی دوسری بیوی جو حیات تھی، اس سے ایک بیٹا محرم خان اور دوسری بیٹی شمع تھی جو پاس کے کسی گوٹھ میں کافی عرصہ پہلے بیاہی جا چکی تھی۔ جب دودا خان نے ساون سے جھوٹ بولا کہ اللہ رکھی اس کی منگیتر ہے تو ایک لمحے کے لیے ساون خود کو دودا خان کے سامنے بالکل چھوٹا محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ گوٹھ کا یہ قدیم رواج تھا کہ جو لڑکی یا عورت اگر کسی مرد سے منسوب کی جا چکی ہو تو پھر کوئی مرد اس عورت کی طرف آنکھ اٹھانا اپنی بے عزتی سمجھتا تھا...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی چلن عام تھا کہ اگر کوئی مرد کسی لڑکی سے شادی کا خواہشمند ہوتا مگر بات ابھی تک پکی نہ ہوئی ہوتو تب بھی بعض مرد اس ''لڑکی'' کو ''اپنا'' سمجھ چکے ہوتے تھے اور ضرورت پڑنے پر اس کا اظہار بھی کر ڈالتے تھے جیسا کہ آج دودا خان نے اپنے اور اللہ رکھی کے ''خود ساختہ'' تعلق کا اعلان کیا تھا لیکن اس ''خود ساختہ'' تعلق کی کوئی حیثیت نہ تھی اور یہی بات لڑائی جھگڑے کی بنیاد ڈالتی تھی لہٰذا ساون اللہ رکھی کے اس انکار سے کہ اس کا دودا خان سے کوئی تعلق نہیں ہے، مطمئن ہو گیا تھا تاہم اسے دودا خان جیسے بوڑھے گدھ کی اس ڈھٹائی پر طیش بھی آ رہا تھا کہ وہ کس طرح دھڑلے کے ساتھ بے چاری اللہ رکھی جیسی معصوم لڑکی کو اپنی ملکیت تصور کر رہا تھا۔

''ساون اب کیا ہوگا......؟'' اللہ رکھی نے اچانک پوچھا۔ اس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

ساون نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''تُو فکر نہ کر...... یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... پر تُو مجھے یہ بتا کہ پہلے بھی تیرے گھر...... یعنی تیرے ماں پیو نے تجھ سے کوئی ایسی بات تو نہیں کی یا تُو نے خود سنی ہو کہ اس مردود سے تیرا......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اللہ رکھی کی آنکھوں سے ایک دم جھیر جھیر آنسو بہہ نکلے اور ساون اپنی آدھی بات کاٹ کر متحیر اور قدرے چونکتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہوا؟ اللہ رکھی! تو کیوں رو رہی ہے ڑی؟''

تب اللہ رکھی نے مختصراً اپنے بارے میں ساون کو سسکتے ہوئے سارا کچھ بتا دیا کہ وہ ایک یتیم ویسیر لڑکی ہے، اپنے چچا چچی کے ہاں کن حالات میں زندگی کی گاڑی کو کھینچ رہی ہے۔

یہ سنتے ہی ساون کے ذہن رسا میں لالچ میں گندھی ہوئی ایک ایسی مذموم سازش کا خیال آیا کہ ہوسکتا ہے بالا بالا ہی اللہ رکھی کے چچا سوڈھل نے خفیہ طور پر یہ طے کر لیا ہو کہ اللہ رکھی کو دودا خان کے ساتھ بیاہ کر سکے کھرے کر لئے جائیں۔ اس نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ سر دست اللہ رکھی کو اس مذموم ''سودے'' کی ہوا بھی نہیں لگائی گئی ہے۔

بہر طور...... ساون نے اللہ رکھی سے تو کچھ نہ کہا تاہم اسے یہ ہدایات ضرور دیں کہ

وہ ہوشیار رہے، اب جیسے ہی اس کے کانوں میں دودے اور اس کے بیاہ سے متعلق بھنک پڑے تو وہ اسے ضرور مطلع کرے پھر اس کے بعد دونوں آئندہ ملتے رہنے کا عہد و پیماں کر کے جدا ہوئے۔

واپسی پر ساون کو تو جیسے دنیا ہی بدلی بدلی ہوئی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ محبت بھی کیا چیز ہے۔ ہو جاتی ہے تو خود سے بیگانہ کر کے رکھ دیتی ہے اور اس عشق میں دل کی جو حالت ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ من ہی من میں محبت کے نازک اور کومل سے شگوفے نمو پانے لگتے ہیں اور انسان ہر سمے ایک سرشاری کی سی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ اللہ رکھی کا پیار پا کر ساون خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگا تھا...... پہلے جو اس کی طبیعت میں ہر وقت ابال اور جوانی کا جوش سا بھرا رہتا تھا اس میں اب قدرے ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اب وہ ہر ایک سے بڑے تپاک سے ملتا خوشدلی سے بات کرتا، چھوٹی چھوٹی باتوں کو درگزر کرتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کی بات بھی اب توجہ سے سنا کرتا اور اس پر عمل بھی کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی اس حیرتناک کایا کلپ کو اس کے باپ موگو، اس کی ماں اور بہن ہدایتاں نے بھی محسوس کیا تھا۔ ساون جانتا تھا کہ محبت جہاں انسان کو ان گنت قوس قزح کے دلنشیں رنگوں سے آشنا کرتی ہے وہاں اس راہ پُر خار میں ''کالے بیریوں'' بھی شب خون مارنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ انہی ''کالے بیری'' میں ایک دودا خان بھی تھا جو ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود اللہ رکھی جیسی معصوم لڑکی پر کسی گدھ کی طرح منڈلاتا رہتا تھا...... اور آج کے واقعے نے اسے بری طرح طیش بھی دلا دیا تھا۔ اسے رہ رہ کر دودا خان پر غصہ آ رہا تھا جو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اللہ رکھی پر اپنا حق جتا رہا تھا۔ اگر ساون کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ اس کی یہ بات محض ایک لغو بیانی ہے تو وہ اسی وقت دودا خان کو اچھی طرح سبق سکھا دیتا...... بہر طور اب اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب کبھی بھی اب اس کا سامنا دودا خان سے ہوگا وہ اس کے ساتھ اچھی طرح نمٹے گا۔

☆======☆======☆

موجودہ حالات کے پیش نظر دودا خان نے اللہ رکھی کے جلد سے جلد حصول کی خاطر اپنی پیش قدمی تیز کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک دن سر شام بہت سے پھل، گندم اور چاول کی ایک ایک بوری گدھا گاڑی پر لاد کر سوڈھل کے گھر جا پہنچا۔ یہی نہیں اس کا آج مصمم ارادہ تھا کہ وہ اللہ رکھی کے سلسلے میں بات پکی کر کے اٹھے گا اور اس مد میں وہ اپنے ساتھ

دس ہزار کی رقم بھی اپنی لاگ میں باندھ کر لایا تھا۔ سوڈھل اور اُس کی بیوی عنایتاں دودا خان کو یوں اچانک لدا پھندا اپنے دروازے پر دیکھ کر اس کے سامنے بچھ بچھ گئے ...... تاہم اللہ رکھی کو اس کا آنا انتہائی برا لگا تھا۔ یہی نہیں اسے یہ بھی برا لگا تھا کہ اس کے چاچا چاچی نے بڑے دھڑلے کے ساتھ کچے صحن میں رلی بچھی چارپائی پر دودے خان کو بٹھا دیا اور اللہ رکھی خاموشی کے ساتھ اپنا چہرہ اجرک میں لپیٹے کوٹھڑی میں آ گئی۔

''دودا سائیں ......! آج تو تُو نے میرے غریب خانے کو رونق بخش دی۔ پر جو تُو نے اتنی تکلیف کی ہے نا...... یہ تُو نے صحیح نہیں کیا ہے۔'' سوڈھل سرکنڈوں کے ایک بوسیدہ سے مونڈھے کو کھسکاتے ہوئے بولا۔ اس کا اشارہ اناج وغیرہ کی بوریوں اور پھلوں کے ٹوکروں کی طرف تھا۔ جن پر سے اس کی حریصانہ نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ اس کی بیوی عنایتاں بھی سلام دعا کے بعد ایک ٹوٹے پھوٹے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ گئی تھی۔

''ادا خوش ہے نا تُو......'' اس نے پوچھا۔

''ہاؤ...... بھاجائی! میں ٹھیک ہوں تُو تو چاک ہے نا......'' دودا خان نے کرخت سی آواز میں جواب دیا۔

''ڑی عنایتاں! جا کچھ مانی ٹکر پاڑیں کا انتظام کر۔'' سوڈھل نے اپنی بیوی سے کہا اور جب عنایتاں اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے لگی تو دودا خان فوراً ہاتھ کے اشارے سے اسے روک کر بولا۔

''نہیں...... اس کی لوڑ نہیں...... رہنے دے...... میں کھا پی کر ہی آیا ہوں بھاجائی......''

''اچھا چل...... چائے ہی لے آ جا کر......'' سوڈھل جیسے اپنی بیوی کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گیا تھا۔

بالآخر عنایتاں...... بڑبڑاتے ہوئے اٹھی۔ ''ایک تو مردار اس جوڑوں کے درد نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔''

''یار سوڈھل کیوں بھاجائی کو تکلیف دیتا ہے۔'' دودا خان مروتاً بولا۔

''ارے سائیں تکلیف کیسی، کون سا یہ خود کام کرے گی۔ اللہ رکھی جو ہے۔'' سوڈھل نے کہا اور پھر اچانک وہ تھوک نگل کر چپ ہو رہا اور نظریں چرانے لگا۔ مگر دودا خان بھی ایک کائیاں تھا بھانپ کر بولا۔

''ہوں...... اسی لئے تو اللہ رکھی کو گھر سے رخصت نہیں کر رہا، اس سے خوب اپنی

خدمتیں لے رہے ہو۔ دیکھ سوڈھل میں پھر کہہ رہا ہوں مجھ سے صاف بات کر...... بہت ہچر مچر کر لی تُو نے...... اب اللہ رکھی کو بیاہ دے میرے ساتھ۔''

سوڈھل کو اس کی بات پر غصہ تو آیا مگر وہ جانتا تھا غصہ دکھانے سے اللہ رکھی کے ذریعے جو مال ہاتھ آنے والا تھا اس سے محروم ہو جائے گا لہٰذا وہ جلد ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''نہیں سائیں! ایسی بات نہیں...... اللہ رکھی تمہاری ہی چیز ہے، جو ہمارے پاس امانت ہے۔ یہ فیصلہ تو ہو چکا ہے۔ اسی لئے ہم اب اللہ رکھی کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتے ہیں۔''

''اچھا چل رہنے دے...... سب جانتا ہوں میں۔'' دودا خان بے تکلفی سے بولا پھر اپنی لاگ کی گٹھ سے دس ہزار کے میلے کچیلے نوٹ جو دھاگے سے بندھے ہوئے تھے سوڈھل کے سامنے لہرائے اور لالچی سوڈھل کے دیدے نوٹوں کے ساتھ ہی متحرک ہونے لگے۔ اس نے یکدم دودا خان کے ہاتھ سے نوٹ یوں جھپٹ لئے جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں یہ رقم دودا خان واپس اپنی لاک میں نہ باندھ لے۔

''بس پھر منظور ہے نا تجھے...... چل اب مجھے تکڑا تکڑا تاریخ بھی دے دے...... میں ''جنج'' (بارات) لے کر آ جاؤں گا اور باقی کے چالیس بھی بعد میں تو کھرے کر لینا۔ ٹھیک ہے پھر......'' دودا خان نے فیصلہ کن لہجے میں اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا تو سوڈھل چند لمحے کے لیے متذبذب سا نظر آنے لگا۔ دس ہزار کے نوٹ ہنوز اس کے ہاتھ میں تھے۔ اسے دودے خان کو اللہ رکھی کا رشتہ دینے پر کوئی تامل نہ تھا لیکن وہ اپنی گندم کی بوری نما بیوی کی جانب سے متامل تھا کیونکہ وہ ابھی اور اتنی جلدی اللہ رکھی کو گھر سے دوسرے لفظوں میں اپنے چرنوں سے دور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ابھی وہ اس سے خدمت کروانا چاہتی تھی اور یہی بات عیار دودا خان نے اچھی طرح سے بھانپ لی تھی وہ جانتا تھا کہ اللہ رکھی اس گھر میں کس طرح چکی کے دو پاٹوں کی طرح پس رہی تھی۔ اسی لئے دودا خان جلد سے جلد اللہ رکھی کو بیاہ کر لے جانا چاہتا تھا تا کہ اللہ رکھی کا نوخیز حسن مرجھا نہ جائے۔

سوڈھل کو چپکا دیکھ کر دودا خان نے پھر تیر پھینکا۔ ''اچھا...... پھر مجھے یہ دس ہزار واپس دے...... اور اللہ رکھی کو بٹھائے رکھ اپنی بیوی کے چرنوں میں...... کوئی بات نہیں...... ساری عمر تم دونوں کی خدمت کرتی رہے گی۔''

''اڑے...... نہیں یار دودا...... ایک تو تُو ناراض بہت جلدی ہو جاتا ہے۔ یہ بھلا بات ہوئی کوئی...... دے دوں گا تاریخ بھی تجھے۔'' سوڈھل یکدم اس کے تیور بدلتے دیکھ

کر بولا۔ ''اچھا...... پھر میں کل شام تیرے ہوٹل آؤں گا۔ ایک کپ کڑک چائے اور بیڑی بھی پیوں گا اور تجھے تاریخ بھی دے دوں گا۔ بس اب تو خوش ہے نا......''

اسی اثناء میں اس کی بیوی عنایتاں اپنے بھاری وجود کے ساتھ چائے کے دو پیالے لے آئی۔ مگر دودا خان چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اڑے بابا...... چا میں وائیں تو پیتا جانا...... اتنی تکڑ کا ہے کو بھلا......'' سوڈھل اسے اٹھتا دیکھ کر بولا۔

''میری چائے تیرے پر ادھار ہی سوڈھل پھر کبھی آ کر پی لوں گا۔ چلتا ہوں...... اور کل اپنے ہوٹل پر انتظار کروں گا۔'' دودا خان یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اندر کچی کوٹھڑی کے سرکنڈوں والے دروازے کے ساتھ لگی آنسو بہاتی اللہ رکھی پر آج یہ بات پوری طرح سے عیاں ہو چکی تھی کہ جسے وہ اپنا چاچا سمجھ رہی ہے درحقیقت وہ دولت کا ایک ایسا پجاری ہے جو محض روپوں کی خاطر اسے...... یعنی اپنی بھتیجی کو ایک ایسے شخص کے ساتھ بیاہ رہا تھا جو اس سے دگنی نہیں بلکہ تگنی عمر کا تھا۔ سسکتی ہوئی اللہ رکھی کو آج بڑی شدت سے اپنا باپ یاد آنے لگا اور اسی تواتر سے اس کی گہری آنکھوں سے آنسو بھی چھم چھم برسنے لگے۔ وہ روتے ہوئے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ اگر آج اس کے لالچی اور خودغرض چاچے کی جگہ پر اس کا باپ ہوتا تو وہ اس بڈھے دودا خان کے منہ پر نوٹوں کی گڈی مار کر اسے سخت بے عزت کر کے گھر سے نکال دیتا...... لیکن یہاں تو اس کے سوڈھل چچا نے بالا ہی بالا اس کا سودا کر دیا تھا۔ اچانک، اللہ رکھی کے تصور میں اپنے محبوب ساون کا چہرہ گھوم گیا۔ اسے یکلخت یوں لگا جیسے وہ اب دنیا میں تنہا نہیں ہے۔ چچا اور چاچی جیسے خونی رشتوں پر اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ اب خدا کے بعد ساون اللہ رکھی کو اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ساون کی شبیہہ تصور خیال میں آتے ہی اسے یک گونہ سکون اور ایک حوصلہ سا مل رہا تھا...... ورنہ تو اللہ رکھی زندہ درگور ہوتا خود کو محسوس کرنے لگی تھی۔ دودا خان بھلا اسے کیا پسند آنا تھا اسے تو اب اپنے چاچا چاچی بھی بُرے معلوم ہو رہے تھے...... جنہوں نے اس کی بے لوث خدمتوں کا یہ صلہ دیا تھا...... معاً اسے پھر باہر چاچا سوڈھل اور چاچی عنایتاں کی آپس میں زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ شاید کسی بات پر آپس میں الجھ رہے تھے۔

''اتنی جلدی کا ہے کی ہے۔ اس بڈھے دودے کو تاریخ دینے کی......'' چاچی عنایتاں اپنے شوہر سے ہاتھ نچا کر کہہ رہی تھی۔ ''ذرا مجھے کچھ دن تو سکھ کے ساتھ گزار لینے

دے...... پر تجھے کیوں میرے آرام کا خیال آنے لگا۔ تجھے تو روپے ملنے چاہئیں بس...... میں جاؤں بھاڑ میں ہونہہ......''

اللہ رکھی نے پھر سوڈھل چاچا کی آواز سنی جو اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اڑی...... چری نہ بن...... دیکھ...... جب ہمارے پاس بہت سارو پیہ آ جائے گا نا تو میں تجھے نوکرانی رکھ دوں گا۔ ایک بار اللہ رکھی کو دودا خان کے حوالے کر کے اس سے مجھے پیسے اینٹھ لینے دے...... پھر ان پیسوں سے میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروں گا۔ وہ تُو نے نہیں سنا کہ پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر...... دودے کو لمبی تاریخ دے دینا۔'' عنایتاں بولی۔

''اپنی بات ہی کہے جائے گی سمجھے گی نہیں میری بات......'' سوڈھل زچ ہو کر بولا۔

''وہ بھی چالاک ہے۔ سمجھ جائے گا کہ کیوں تاریخ اتنی دور کی دے دی ہم نے۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے...... اسی مہینے چاند کی اٹھارہ تاریخ دے دوں گا دودا خان کو...... آج چوتھے پر ہے چاند...... باقی چودہ دن کروالے اپنی خدمت اللہ رکھی سے......'' پھر اللہ رکھی کو سوڈھل چاچا کے باہر جاتے قدموں کی آواز کے ساتھ ہی عنایتاں چاچی کی بھی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''اللہ رکھی......!'' معاً اللہ رکھی کو باہر سے عنایتاں چاچی نے پکارا اور وہ یکدم اپنی چادر کے میلے چیکٹ کنارے سے اپنا آنسوؤں بھرا چہرہ پونچھنے لگی اور پھر باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

☆======☆======☆

''سائیں بھوتار! موگو ہاری کا بیٹا...... ساون منہ کو آنے لگا ہے...... اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے ''ہاری زادے'' بھی ہمت پکڑنے لگے ہیں منہ کھولنے کی......'' منشی میرل منگن ہار نے اپنے سر پر شیشوں جڑی سرخ دھاگوں والی سندھی ٹوپی درست کرتے ہوئے سرکنڈوں کے مونڈھے پر براجمان وڈیرے میر لکھ میر خان سے کہا۔

جواباً وڈیرا اپنی خضاب لگی مونچھوں کے کونوں کو مروڑیاں دیتے ہوئے آنکھیں سکیڑے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے پُر خیال انداز میں سر ہلانے لگا۔ پھر چند ثانیے خاموشی کے بعد اوطاق کی بوجھل فضا میں وڈیرے کی بلغمی آواز گونجی۔ ''موگو ہاری پر کتنا قرض ہے، اس وقت......'' اس نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''سائیں وڈا......! پورے پندرہ ہزار آٹھ سو روپے۔'' منشی میرل نے زبانی بتایا۔

"ہوں...... اسے قرض دیتے رہو۔ اتنا دو کہ وہ بجائے اصل رقم کے سود ہی اتارتا رہے ساری عمر...... دیکھو میرل...... ان لوگوں کو کبھی سوکھی روٹی کھانے نہ دو، انہیں قرض کا سالن دو۔ اس میں بھگو کر روٹیاں کھائیں یہ۔ پھر کوئی آواز نہیں ابھرے گی۔" وڈیرے کی بات پر منشی دھیرے دھیرے اثبات میں اپنا سر ہلانے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی جیسے وہ اپنے سائیں "وڈے" کی بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہو۔ پھر بے اختیار اس کے منہ سے "برابر سائیں وڈا...... برابر" نکلا۔

☆======☆======☆

وہ دونوں روشنی کی رفتار سے بھی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کے نہ صرف قریب آتے چلے گئے بلکہ یک قالب دو جان بھی ہو چکے تھے۔ ساون سے ملاقات کرتے ہی اللہ رکھی نے اسے اپنے لالچی اور خود غرض چاچا سوڈھل اور بوڑھے دودا خان کے بیچ، اسے شادی کی آڑ میں فروخت کرنے کی جو کھچڑی پک رہی تھی، وہ ساری گوش گزار کر دی۔

"اب کیا ہوگا ساون! میں...... میں تو جیتے جی مر جاؤں گی اگر میری شادی دودا خان......" اللہ رکھی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور بے اختیار ہو کر سسکنے لگی۔

وہ دونوں اس وقت شام کے ملگجے میں جو اور منگ کی کھڑی فصلوں کے درمیان موجود تھے۔ ساون اللہ رکھی کے منہ سے یہ سن کر کہ اس کا چاچا پچاس ہزار کے عوض بڈھے دودا خان کے ہاتھ اسے بیاہ کی آڑ میں فروخت کر رہا ہے۔ وہ ایکا ایکی متفکر سا ہو گیا تاہم سسکتی ہوئی اللہ رکھی کو تسلی دیتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔ "اللہ رکھی! تو فکر کیوں کرتی ہے۔ میں ہوں نا...... سنبھال لوں گا سب...... اور اس دودے خان سے بھی نمٹ لوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے ساون کی آنکھوں میں خون سا اُتر آیا اور وہ دانت پیستے ہوئے دودے خان کے متعلق سوچنے لگا کہ اسے اب سبق سکھانا ہی پڑے گا۔

ساون کے خطرناک تیور دیکھ کر اللہ رکھی تڑپ کر فکر مند لہجے میں بولی۔ "ساون...... دودا خان سے نہ الجھنا۔ وہ بہت پیسے والا ہے، کہیں تجھے نقصان نہ پہنچا دے۔ دیکھ ساون میرا تیرے سوا کوئی نہیں۔" اللہ رکھی کے لہجے کی بے چارگی نے ساون کو ہلا کر رکھ دیا وہ بولا۔

"نہیں اللہ رکھی...... میرا یہ مطلب نہیں کہ میں دودا خان سے الجھ پڑوں۔ میں کسی اور طریقے سے اس کے ساتھ نمٹوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہمارے گوٹھ میں غربت کتنی بڑی کمزوری اور دولت مندی کتنی بڑی طاقت جانی جاتی ہے پر تُو حوصلہ رکھ...... اللہ ہمارے

ساتھ ہے۔" ساون نے آخر میں اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر ملائمت سے مسکرا کر اس کی سرمگیں آنکھوں میں اپنی محبت پاش نظروں کا جام الفت انڈیلتے ہوئے مزید بولا۔ "اللہ رکھی! ہماری محبت بھی تو ایک طاقت ہے...... ناقابل تسخیر طاقت...... بھلا کوئی بیری ہماری اس طاقت کو ختم کر سکتا ہے۔" ساون کی بات پر اچانک اللہ رکھی نے اپنی گھنیری پلکوں کی چلمن اٹھا کر اس کی سرمدی نظروں میں دیکھا تو وہاں اسے الفت کا ایک ایسا بحر بیکراں ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیا، جہاں ان کی معصوم محبت کا سفینہ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرتا ہوا اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔

☆======☆======☆

ساون نے دودا خان سے نمٹنے کا جو طریقہ سوچا تھا بظاہر وہ سیدھا سادہ تھا لیکن اس میں ایک مشکل آڑے آ رہی تھی اور وہ تھی روپوں کی...... لیکن اس سلسلے میں بھی اس نے روپوں کے بندوبست کا خاطر خواہ حل سوچ رکھا تھا...... لہٰذا ساون ایک دن پہلے اپنی ماں سے بولا۔ "امڑ گودی...... ! مجھے بات کرتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا لیکن......" ساون ذرا الجھ کر رکا تو اس کی ماں ممتا بھری حلاوت سے بولی۔

"ہاؤ پٹ! بول رک کیوں گیا۔ بھلا اپنی امڑ سے کیا ڈر ناراضگی کا۔"

"امڑ جنجیل! وہ ایک لڑکی ہے بے چاری غریب اور یتیم۔ وہ مجھے اچھی لگی ہے لیکن......" پھر ساون نے ماں کو اللہ رکھی سے متعلق ساری رام کہانی سنا ڈالی کہ...... وہ اللہ رکھی جیسی معصوم اور دکھیاری لڑکی کو اس کے لالچی چچا اور بڈھے دودے خان سے جلدی نجات دلانا چاہتا ہے...... جس کا طریقہ یہی ہے کہ وہ فوراً اللہ رکھی سے شادی کر لے۔

اس کی ماں نے یہ سب بغور سنا...... پھر چند ثانیے کچھ سوچتے رہنے کے بعد ساون کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "پٹ! یہ بات ہے تو...... پھر تُو گڑتی نہ کر میں آج ہی تیرے باپ سے بات کروں گی۔ مجھے یقین ہے اسے بھی اعتراض نہیں ہوگا اس بات پر...... لیکن......" وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

اس کی وجہ ساون فوری بھانپ گیا بولا۔ "امڑ! تُو پیسوں روپوں کی گڑتی نہ کر...... اس کا میں کہیں نہ کہیں سے انتظام کر لوں گا...... بلکہ پچاس ہزار سے دس بیس اوپر ہی کروں گا...... اور مجھے یقین ہے اللہ رکھی کا حریص چاچا سوڈھل دودے خان کو چھوڑ کر اپنی بھتیجی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے گا۔"

"لیکن پٹ ساون!...... اتنے روپوں کا تُو بندوبست کرے گا کدھر سے......؟"

ماں کی اس بات نے اسے فوراً لاجواب کر دیا تھا جس کا وہ فوری جواب تو نہیں دے سکا تھا مگر اس کے اندر کہیں اتنے سارے روپوں کے بندوبست کرنے کا حل موجود تھا......لیکن جب یہی سوال اس کے باپ موگو نے ساون سے کیا تو......ساون کو مجبوراً بتانا پڑا بولا۔

''وہ منشی......مم......میرل ہے نا......وہ قرض......''

''اس کا باپ کرجا (قرضہ) دے گا تجھے اپنی جیب سے ہیں......'' موگو جل کر بیٹے سے بولا۔'' ظاہر ہے منشی میرل وڈیرے بھوتار سائیں سے لے کر تجھے دے گا اور ایک بڑے سے رجسٹر پر تجھ سے انگوٹھا لگوائے گا......اور مجھے یقین ہے تو ساری عمر تک اتنی بڑی رقم وڈیرے کو نہیں لوٹا سکے گا۔ ہاں یہ ہوگا کہ عمر بھر کی غلامی کا طوق تو ہماری گردنوں پر لگوا کر ہمیں حویلی کے قیدیوں میں شامل کرا دے گا......اور تب بھی وڈیرے کا صرف سود ہی ادا ہو گا سمجھا تو......''

ساون باپ کی جلی کٹی گفتگو پر بری طرح زچ ہونے لگا مگر پھر پرعزم لہجہ اختیار کرتے ہوئے باپ کو جیسے قائل کرنے والے انداز میں بولا۔'' پیو! میں جوان ہوں تگڑا ہوں......میں خود اکیلا محنت کروں گا اور آہستہ آہستہ وڈیرے کا سارا قرض اتار دوں گا۔''

پینسٹھ سالہ موگو بیٹے کی اس خطرناک معصومیت بلکہ ''بے خبری'' پر دہل سا گیا بلکہ اسے ترس آنے لگا اپنے بیٹے ساون پر۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس عشق کے بھوت کی زد میں آئے ہوئے ساون کو یہ کیسے سمجھائے کہ اس نے اتنی عمر وڈیرے کی حویلی میں صرف ''حاضر سائیں وڈا'' ''برابر سائیں بھوتار'' کرتے ہوئے نہیں گزار دی ہے بلکہ وہ حویلی کے بلند و بالا در و بام کو نجات دہندہ سمجھ کر اس میں گم ہو جانے والے اپنے جیسے ان غریب اور معصوم ہاریوں کے عبرتناک انجام سے خوب واقف تھا۔ جو قرض کی زنجیریں اپنے گلے پر باندھے قیدیوں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ موگو......نے جست کے ٹیڑھے میڑھے کٹورے میں پانی لے کر کٹورے سے چند گھونٹ بھرے......اس کے بعد ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بیٹے سے بولا۔

''دیکھ میڈا پٹ ساون......! وڈیرے سائیں کا کرجا اتارنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تو سمجھتا ہے۔ میں مانتا ہوں تیری بات کہ تو سخت محنت مجدوری کر کے کرجا لوٹا سکتا ہے لیکن......لیکن......یہ جو وڈیرے سائیں کا کھاتہ ہے نا......جس میں اس کا منشی میرل انگوٹھے لگواتا ہے......شیطان کی آنت ہے۔ تو کرجے کی اگر دگنی رقم بھی لوٹا دے گا تو تب بھی اس منحوس رجسٹر میں تیرے ادا کئے ہوئے ایک پیسے کا بھی اندراج نہیں ہوگا اور بعد میں

تجھے پتہ چلے گا کہ تو تو ابھی سود ہی لوٹا رہا ہے......اصل رقم تو ابھی تک رجسٹر میں کرجے کے طور پر تیرے نام درج ہے سمجھا......'' بیٹے ساون کو اتنی صراحت کے ساتھ سمجھاتے ہوئے بے چارے موگو کا دم منہ کو آنے لگا اور فوراً قریب بچھی کھری اور جھلنگا چارپائی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اسے اب خشک کھانسی بھی شروع ہو گئی تھی۔ اسی اثناء میں ساون کی ماں اپنے شوہر کے لیے جست کے کٹورے میں پانی لئے بڑھی جو کافی دیر سے چپ کھڑی دونوں باپ بیٹوں کی گفتگو خاموشی سے سن رہی تھی۔ ساون خود کو خجل سا محسوس کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

دودا خان ساون کو دھمکانے کے بعد اس واقعے کو تقریباً بھول چکا تھا۔ وہ اس وقت اجرک کو بڑے سے رومال کی طرح کاندھوں پر رکھے......اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اس کا مکان کچی پکی اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک بڑا اور دو چھوٹے کمرے تھے جبکہ کچا صحن خاصا وسیع تھا۔ جہاں ایک جانب پھونس کے چھپر نما سائبان تلے دو بھینسیں کھرلی کے قریب کھڑی جگالی کر رہی تھیں اور ایک قدرے فربہی مائل پکی عمر کی عورت ذرا فاصلے پر نصب چارہ کاٹنے والی مشین کا گول بڑا سا پہیہ چلا رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے ہری ہری تازہ گھاس کا گٹھا مشین میں ڈال رہی تھی۔ دودا خان نے ایک اچٹتی سی نظر کام میں مگن اپنی بیوی خیراں پر ڈالی پھر صحن میں بچھی چارپائی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ خیراں نے بھی اپنے شوہر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنا کام ختم کر کے شوہر کی طرف آتے ہوئے بولی۔'' آج پھر میرے محرم کو ہوٹل میں چھوڑ آئے۔''

''ہاں......آج میں تھکا ہوا تھا سوچا آج گھر ہی جا کر روٹی کھاؤں اور ذرا آرام بھی کر لوں۔'' وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔

اس کی بات پر خیراں نے ذرا منہ بسورا اور سامنے ہی بنی رسوئی میں چلی گئی......تھوڑی دیر بعد اس نے ایک بڑے سے چھابے میں جوار کی روٹی اور دیسی گھی میں ساگ لا کر شوہر کے آگے رکھ دیا ایک چھوٹی سی تابنے کی کٹوری میں مکھن بھی تھا۔

''میرا پٹ! ہوٹل کی مانی نہیں کھاتا، پہلے بھی ایک دن تو اسے چھوڑ آیا تھا وہاں تو تیرے ہوٹل کی مانی کھا کر اسے تین دنوں تک دست لگے رہے تھے۔''

''کوئی قیامت تو نہیں آ جائے گی ڑی......اگر تیرا محرم خان ذرا دیر کو ہوٹل سنبھال لے گا تو اور ہاں......میرے ہوٹل کی روٹی کی برائی مت کیا کر......پورے داد پور میں

مشہور ہے میرے ہوٹل کا کھانا...... تیرے محرم کا معدہ ہی نازک ہے۔'' دودا خان نے قدرے چڑ کر بیوی سے کہا اور چھابے سے روٹی کا نوالہ توڑنے لگا۔ خیراں ایک بار پھر منہ بناتی ہوئی قریب رکھی گھڑونچی کی طرف بڑھ گئی اور جست کے ایک بڑے سے کھلے منہ والے گلاس میں پانی لے کر دودا خان کی چارپائی کے قریب ہی زمین پر رکھ دیا اور پھر اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آ پڑیں...... علی بخش کو بھی تو ذرا ہوٹل میں بٹھالیا کر...... ایک تجھے میڈا پٹ ہی نظر آتا ہے ہوٹل میں پھنسانے کو......'' خیراں کا لہجہ احتجاج والا ہوگیا تھا۔

دودا خان کو اگرچہ اپنی بیوی کا لہجہ تاؤ دلا رہا تھا مگر اس نے خود پر قابو پا کر رکھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گرمی دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں الٹا اپنی بھوک ہی مارے گا اور جب پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھائے گا تو پُرسکون نیند بھی نہیں لے سکے گا لہٰذا اپنے لہجے کو نرم رکھنے کی سعی کرتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دیکھ ڑی خیراں! محرم شروع سے میرے ساتھ ہوٹل سنبھالتا آیا ہے...... وہ سیانا ہے ذرا پھر پٹ علی بخش بے چارے کا تو تجھے پتہ ہی ہے...... جب سے اس کی ماں مری ہے، وہ خود کو بہت اکیلا اکیلا محسوس کرنے لگا ہے اسی لیے میں اس پر زیادہ سختی نہیں کرتا۔''

''میڈا پٹ محرم جو تجھے مل گیا ہے سختی کرنے کے لیے۔'' خیراں ترنت بولی۔

''کیا مطلب ہے تیرا...... کیا محرم خان میڈا پٹ نہیں ہے، مجھے اس سے پیار نہیں۔'' دودا خان نے نوالہ نگلتے ہوئے اپنی بیوی کو گھور کر قدرے درشت لہجے میں کہا اور مزید بولا۔ ''ایک باپ کے لیے دونوں اولادیں سانجھی ہوتی ہیں...... علی بخش نے اگر تیری کوکھ سے جنم نہیں لیا تو کیا تیری کوکھ سے پیدا ہونے والی اولاد مجھے کم عزیز ہوگی...... بے وقوف۔'' شوہر کے بگڑتے تیور دیکھ کر یکدم خیراں نے پانسہ پلٹا اور معتدل لہجے میں بولی۔

''سائیں! اب ایسی بات بھی نہیں کہ پٹ علی بخش نے اگر میری کوکھ سے جنم نہیں لیا تو مجھے اس سے پیار نہیں...... میں بھی اس بے چارے کا دکھ سمجھتی ہوں مگر میرے لیے جیسے میرا پٹ محرم خان ہے ویسا ہی علی بخش...... میں نے کبھی اسے اپنا سوتیلا پٹ نہیں سمجھا، سگا ہی سمجھتی ہوں پر میں ذرا چاہتی ہوں کہ وہ مصروف رہے، کسی نہ کسی کام میں تاکہ اس کا دل لگا رہے اور اکیلا پن محسوس نہ کرے۔''

اس کی بات سن کر دودا خان کے چنٹ دار اور سیاہی مائل چہرے پر متاثر کن لہریں سی ابھری تھیں اور وہ از راہ تفنن بیوی سے بولا۔ ''ہے تو تُو سیانی پر کبھی کبھار عقل تیری دماغ

سے سرکنے لگتی ہے۔ ویسے کہتی تو ٹھیک ہی ہے کہ علی بخش کو واقعی کسی کام میں مصروف رہنا چاہئے...... پر کیا کروں تجھے تو پتہ ہی ہے کہ کام میں لگ کر بیٹھتا ہی نہیں...... اٹھ کر یکدم پتہ نہیں کدھر نکل جاتا ہے۔'' دودا خان نے اپنی بات ختم کی اور خیراں نے زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجالی تھی جو اس بات کی غماز تھی کہ ابھی ذرا دیر پہلے اس نے شوہر سے اپنے سوتیلے بیٹے علی بخش کے لیے جن جذبات کا اظہار کیا تھا، وہ محض تصنع پر مبنی تھے۔

☆======☆======☆

وہ بادی النظر میں ایک نیم پاگل اور لاوارث سا نوجوان لڑکا دکھائی دیتا تھا مگر ایسا تھا نہیں البتہ اس نے شروع سے ہی جس ماحول اور جن حالات میں پرورش پائی تھی، وہ کچھ ایسے دگرگوں اور نامساعد رہے تھے جو بچپن سے ہی کسی انسانی نفسیات کو اس قدر حساس بنا دینے کے لیے کافی تھے جن میں خطرناک حد تک پیچیدگیوں کی گانٹھیں پڑ جانا ایک لازمی امر بن جاتا ہے...... ایسا انسان اپنے خول میں مقید ہو جاتا ہے، نفسیات کی رو سے ایسے افراد معاشرے کو اپنا مجرم گرداننے لگتے ہیں اور کسی بھی وقت اپنی خطرناک الجھی ہوئی نفسیاتی گرہ گزیدگی کا شکار ہو کر عام آدمی کو گزند پہنچانے سے بھی نہیں چوکتے اور ایسے ہی نفسیاتی مجرم جب کسی بڑے جرم کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں تو پہلے پاگلوں کی طرح ہنستے پھر قہقہے لگاتے اور بعد میں رونے لگتے ہیں۔ یہ علی بخش تھا جو دودا خان کی پہلی مرحومہ بیوی حضوراں بی بی کے بطن سے تھا، تئیس چوبیس سالہ اور قدرے دبلا پتلا سانولی رنگت کا یہ نوجوان علی بخش جس نے آنکھ کھولتے اور شعور سنبھالتے ہی اپنے گھر میں ہر سمے ایک عجیب ہنگامہ ہی بپا دیکھا تھا، ماں باپ کا آپس میں ہر وقت جھگڑا اور ہر سمے اٹھا پٹخ، چیخ و پکار ان سب عوامل نے اس کی زندگی میں ایک نفسیاتی ہلچل مچادی تھی، اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو باپ کے ہاتھوں پٹتے ہی دیکھا تھا، اس وقت علی بخش ایک معصوم بچہ تھا لیکن وہ ماں کے دکھ اور باپ کے مظالم کو سمجھتا تھا، جب اس کی ماں حضوراں بی بی تنہائی میں روتی تھی تو علی بخش اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہتا۔ ''آمڑ جی جی! پیو برا انسان ہے...... تجھے مارتا ہے بہت۔'' لیکن جب خلاف توقع اس کی ماں الٹا علی بخش کو ہی سرزنش کرتی۔

''نا پٹ! آ پڑیں پیو کو ایسا مت آکھ، بُری بات ہے یہ!'' تو علی بخش کا ننھا ذہن سخت حیرانگی کا شکار ہو کر رہ جاتا تھا شاید ماں کے اسی ایثار نے اسے ہاں...... نا...... برا اور بھلا کے بیچ جھلا کر رکھ دیا تھا...... وہ حیران ہو کر سوچتا تھا کہ باپ آخر ہے کیا شے...... جو ماں کو اتنا مارتا ہے، پیٹتا ہے لیکن پھر بھی ماں اسے بُرا نہیں کہتی اگرچہ دوران جھگڑا اس کے منہ

سے شوہر کے لیے غلط الفاظ نکل جاتے لیکن جب علی بخش تنہائی میں باپ کی برائی کرنے لگتا تو ماں اسے ڈانٹ دیتی، باپ کے خلاف بولنے سے۔ اکثر دونوں کو شیر وشکر اور ہنستے باتیں کرتے بھی دیکھا کرتا تھا مگر ایسا کم ہی ہوتا تھا...... علی بخش کو پھر اپنی ماں بھی بُری لگتی جو اس کے باپ کے ہاتھوں اتنی مار سہنے کے بعد بھی اسے بُرا نہیں کہتی تھی...... اب جب بھی دونوں کے درمیان جھگڑا ہوتا، علی بخش خوف زدہ ہو کر گھر سے بھاگ جاتا اور کئی گھنٹوں بعد لوٹتا ورنہ اکثر حضوراں بی بی کو ہی کسی نہر کے کنارے سے تو کبھی کھو کے پیڑ تلے بیٹھے گم صم علی بخش کو پکڑ کر لانا پڑتا تھا۔

پھر یوں ہوا اس کی ماں نے چارپائی پکڑ لی...... وہ بیمار رہنے لگی، اس کے چارپائی سے لگنے کی دیر تھی کہ علی بخش نے دیکھا اس کا باپ ایک دن بڑی سج دھج کے ساتھ ایک خوبصورت سی عورت گھر لے آیا اور ننھے علی بخش کو گھور کر بولا کہ یہ تیری چھوٹی ماں ہے، اس کی عزت کرنا۔ اپنے باپ دودا خان کے اس تحکمانہ انداز پر وہ سہم کر رہ گیا...... ادھر اس کی ماں مستقل بیمار رہ کر بالآخر اللہ کو پیاری ہوگئی، اس کا باپ دودا خان نئی نویلی بیوی میں گم رہنے لگا...... اسے ننھے علی بخش کی بھی پروا نہیں رہی تھی، جو ماں کے مرنے کے بعد ''تڑخ'' چکا تھا، علی بخش کے ننھے ذہن میں اکثر یہ بات اچنبھے کا باعث بنتی تھی کہ اس کا باپ اس عورت (سوتیلی ماں) کی بہت ناز برداریاں اٹھاتا ہے...... مارنا تو درکنار کبھی سخت لہجے میں اس سے بات بھی نہیں کرتا، اس کے آگے پیچھے گھومتا ہے، وہ معصومانہ حیرت سے سوچتا کہ آخر اس چھوٹی آمڑ میں ایسی کیا خوبی ہے جو اس کا باپ اس کے اتنے ناز اٹھاتا ہے جبکہ میری ماں سے ہر وقت لڑتا رہتا تھا۔ پھر اس کے بعد علی بخش، سوتیلی ماں کے مشق ستم کا نشانہ بنتا رہا...... ادھر جب علی بخش کے سوتیلے بھائی محرم خان اور سوتیلی بہن شمع نے اوپر تلے جنم لیا تو اپنی ماں کا بقیہ ادھار علی بخش پر اتارنے لگے اور وہ بے چارہ ملغوبہ بن کر رہ گیا، اب دودا خان جو اپنی دوسری اور نوخیز بیوی خیراں کے عشق میں گم تھا، دو بچوں کی پیدائش کے بعد جب اس کی چاہت میں فطری ٹھہراؤ آیا تو اسے احساس ہوا کہ علی بخش جو اب مکمل جوان ہو چکا تھا، کے ساتھ بہت زیادتی ہوگئی لہٰذا تب اس کے دل میں اپنے پہلے بیٹے کا درد جاگا لیکن تب تک وہ خود بوڑھا ہو چکا تھا اور علی بخش بے چارہ نفسیاتی مریض سا بن چکا تھا مگر اب پھر دودا خان کو تیسری شادی کا شوق چرایا تھا اور وہ بھی اللہ رکھی سے جو خود اس کی بیٹی شمع کی عمر کی تھی مگر دودا خان یہ بھول چکا تھا شاید کہ وہ اللہ رکھی نامی جس معصوم لڑکی کو شادی کے نام پر اس کے لالچی چاچا سوڈھل سے مبلغ پچاس ہزار میں بیاہ کر اپنے گھر لا رہا

ہے، کیا ان کے دل اور ذہن اپنے سے کم عمر کی ''لڑکی'' کو ''ماں'' تسلیم کر لیں گے۔ شاہ لطیفؒ نے سچ کہا ہے۔

مثل مردار ہے جہاں کہ یہاں
ہم نے دیکھی بشر میں خوئے سگاں

☆======☆======☆

علی بخش گوٹھ کی شکستہ اور گرد آلود گلیوں میں آوارہ گردی کرنے کے بعد جب گھر پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اندر کمرے میں اس کی سوتیلی ماں خیراں اور بھائی محرم خان چارپائی پر بیٹھے ایک ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ علی بخش چند ثانیے گھر کے کچے صحن میں کھڑا بے تاثر سی نظروں سے اندر کمرے میں دیکھتا رہا پھر ہولے سے کھنکارا۔ دونوں ماں بیٹے کھانا کھاتے ہوئے اسے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے ذرا چونکے...... مگر انہوں نے اس پر خاص توجہ نہ دی۔ آج سردی قدرے کم تھی۔ علی بخش نے صرف اجرک ڈال رکھی تھی اپنے جسم پر...... جسے یونہی سنبھالتا ہوا وہ اپنے دوسرے کمرے میں آ گیا۔ ویسے بھی علی بخش پر بیرونی موسموں کا کم ہی اثر ہوتا تھا پوری سردیاں وہ ایک اجرک لپیٹے ہی گزار دیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ اس کا وجود شروع ہی سے اپنے اندرونی تیز وتند موسموں کی زد پر رہتا تھا۔ جن کی شدت بھی بیرونی موسموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ ایک بے نام سی تپش اس کے اندر لہریں سی مارتی رہتی تھی۔ ہر سمے...... اور اس کے بے تاثر اور پُرسکوت چہرے سے یہی لگتا تھا جیسے وہ اپنے اندر ایک خاموش طوفانِ بلاخیز چھپائے ہوئے ہے۔

وہ کمرے میں آتے ہی چارپائی پر گر سا گیا۔ چند ثانیے یونہی بلب کی پیلی روشنی میں نہائی ہوئی کمرے کی کچی دیواروں کو گھورتا رہا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اسے کچھ زیادہ ہی بھوک لگی تھی وہ چارپائی کو زور سے چرچراتے ہوئے اٹھا اور باہر نکل کر ساتھ والے کمرے کی چوکھٹ پر دیوار بن کر کھڑا ہوا گیا۔ اس کے چوڑے جثے نے چوکھٹ کا خلا پُر کر دیا تھا۔ سامنے دونوں ماں بیٹے ہنوز کھانے میں مشغول تھے۔

''مجھے بھوک لگی ہے۔ روٹی کھانی ہے میں نے۔'' وہ عجیب سے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔

''صدقے ونجاں...... تیرے حکم تے۔ دو ہی تو تیرے کام ہیں۔ سارا دن باہر آوارہ گردی کرنا اور کھانے کے وقت آ کر روٹی دینے کا حکم چلانا۔'' اس کی سوتیلی ماں خیراں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

خیراں کی تضحیک آمیز نظروں کی طرف علی بخش نے صرف ایک لمحے کے لیے اپنی خاموش سرسراتی نظروں سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ پھر خاموشی سے جب وہ اپنے کمرے کی جانب لوٹنے لگا تو عقب سے اسے ماں کی بیزار کن آواز سنائی دی۔ ''بیٹھ جا ذرا جا کر...... روٹی پہلے کھا لیں ہم...... بعد میں لاتی ہوں تیرے لیے بھی...... مصیبت...... ہونہہ۔''

ایک بار پھر وہ تضحیک آمیز لہجے کا نشانہ بنا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے اس نے اپنے اندر ایک تاریک قبر بنا لی ہو۔ جہاں وہ اپنی سوتیلی ماں کے لہجے کی کڑواہٹ اور طعن و تشنیع کا زہر اتارتا رہتا تھا، لیکن اس کی سماعت سے ٹکرانے والے آخری لفظ ''مصیبت'' پر وہ غور کرنے لگا۔ جو ظاہر ہے اس کے لیے حقارت آمیز انداز میں کہا گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا ''مصیبت'' وہ خود تھا یا اس کی سوتیلی ماں خیراں جو بذاتِ خود ایک بڑی ''مصیبت'' بن کر اور اس کی ماں کے حق پر ڈاکہ ڈال کر ان کی ہنستی بستی زندگی پر نازل ہوئی تھی۔ علی بخش کیسے بھول سکتا تھا یہ بات کہ جب سے اس کے باپ نے اس کی مرحومہ ماں حضوراں بی بی پر خیراں جیسی چنڈال سوتن بٹھائی تھی تب سے وہ بیمار رہنے لگی تھی اور ان دونوں (حضوراں بی بی اور علی بخش) ماں بیٹوں کی خوشگوار زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ گئی تھی۔ جو آخر کار اس کی ماں کی اذیت ناک موت پر منتج ہوئی تھی۔ علی بخش اپنی ماں حضوراں بی بی کی موت کا ذمہ دار پہلے اپنے باپ دودا خان اور پھر اپنی سوتیلی ماں خیراں کو سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی ماں سے ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ نئی نویلی تھی لہٰذا دودا خان بھی اسی کی حمایت کرتا تھا۔

وہ کافی دیر تک بھوکے پیٹ چارپائی پر لیٹا کھانے کا منتظر رہا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی ماں خیراں بڑبڑاتی ہوئی ایک بڑا سا چھابہ اٹھائے اندر داخل ہوئی اور اس کی جانب اس طرح بڑھایا جیسے اگر علی بخش یکدم اٹھ کر فوری تھام نہ لیتا تو وہ چھابہ خیراں نے اس پر اچھال ہی دیا ہوتا۔

''لے کھا مر لے اور سن، روٹی کے وقت سے ذرا پہلے آ مرا کر۔ نوکرانی نہیں ہوں تیرے باپ کی کہ تیرے لئے بعد میں روٹی چنتی پھروں۔'' پھر وہ بھناتی ہوئی واپس لوٹ گئی اور علی بخش خاموشی سے روٹی کھانے لگا۔

چاولوں کی روٹی پر ساگ رکھا ہوا تھا۔ علی بخش جانتا تھا کہ گھر میں دیسی گھی اور مکھن وافر مقدار میں موجود ہے اور وہ دونوں ماں بیٹے چپڑی کھاتے تھے جبکہ اسے سوکھی دیا کرتے۔ اس پر بھی وہ خاموش ہو رہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ جب کبھی اتفاق سے اس کا باپ دودا خان اور یہ خود ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہوتے تو اسے بھی چپڑی مل جایا کرتی

تھی، لیکن اس وقت بطور احتجاج وہ بغیر چپڑی روٹی کھاتا۔

ابھی اس نے روٹی کے چند ہی نوالے حلق سے اتارے ہوں گے کہ کمرے میں اس کا سوتیلا بھائی محرم خان داخل ہوا۔ وہ علی بخش سے چھوٹا تھا۔ جسم خاصا گٹھا ہوا اور قد قدرے کوتاہ تھا۔ چہرے پر مروڑیاں دی ہوئی مونچھوں نے اس کی سیاہ آنکھوں میں درشتگی اور چہرے کی نخوت میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بھرائے دار لہجے میں بولا۔ ''مجھے ابا نے کہا تھا کہ روٹی کھا کر بعد میں ہوٹل آ جانا۔ پر میں نہیں جاؤں گا مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم روٹی کھا کر ہوٹل چلے جانا۔'' وہ گویا حکم صادر کر کے چلا گیا۔

علی بخش کھانے میں مشغول رہا لیکن محرم کی بات اسے قدرے ناگوار گزری تھی۔ تاہم کھانے سے فارغ ہو کر اس نے ہوٹل جانے کا قصد کیا اور اجرک اوڑھے باہر نکل آیا۔ سردیوں کے موسم میں گوٹھ کے کچے پکے گلیارے سنسان ہو جاتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہوٹل پہنچا تو وہاں لوگ باگ خاصی تعداد میں ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھے۔ ٹی وی بلیک اینڈ وہائٹ تھا کوئی پروگرام ہو نہ ہو۔ مگر لوگ ٹی وی کے آگے بیٹھے ضرور رہتے تھے اور پورے بارہ بجے ہوٹل بند ہو جایا کرتا تھا۔ علی بخش نے دیکھا اس کا باپ ''دخل'' پر بیٹھا روپے گن رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے قریب رکھے ایک اونچے سے چوبی اسٹول پر جا بیٹھا۔ دودا نے اس کی آمد پر چونک کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''محرم...... نہیں آیا؟''

جواباً علی بخش نے محرم خان کی بات دہرا دی۔ جسے سن کر دودا خان کے چہرے پر قدرے ناگواری کے آثار پھیلے۔ پھر وہ اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ ''پٹ علی بخش تو بھی ذرا کام کاج کیا کر اور کچھ نہیں ہوٹل میں ذرا آ جایا کر...... تیرے بھائی محرم پر بھی کام کا بوجھ ذرا بٹ جایا کرے۔''

جواباً علی بخش نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ تو ہر وقت اپنے چہرے پر چپ کیوں سجائے رکھتا ہے۔ کچھ بات چیت کیا کر۔'' دودا خان نے اچانک کہا اور علی بخش نے ایک بے نام سی نظر سے باپ کو دیکھا۔ اس کی باریک مگر چھدری مونچھوں تلے لبوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا پھر جب وہ بولا تو یوں لگا جیسے سناٹے چیخ رہے ہوں۔

''بابا...... مجھ سے ایسی گہری باتیں نہ پوچھا کر۔ ایسا نہ ہو کہ میرا کوئی گہرا جواب تجھے برا لگے۔ ویسے تو جانتا ہے اس طرح میرے لب کیوں سل گئے ہیں۔''

بیٹے کی بات پر دودا خان ذرا گومگو سا ہو گیا۔ اسے جانے کیوں اپنے بیٹے علی بخش کے لہجے میں عجیب صوفیانہ سا جلال محسوس ہوا۔ تاہم وہ آپس کے بوجھل پن کو رفع دفع کرنے کی نیت سے بات بدل کر بولا۔ ''دیکھ......میڈا پٹ...... میں چاہتا ہوں تو مصروف رہے۔ ہنسے بولے۔ خیر اچھا......تُو بیٹھ......دخل سنبھال۔ میں چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے دودا خان اپنے اونچے اور قدرے چوڑے لکڑی کے اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بلند آواز سے ہوٹل میں چائے وغیرہ سرو کرنے والے ایک پیش گار چھوکرے کو پکارا۔ ''اڑے منٹھار......ادھر آ ذرا۔''

اگلے ہی لمحے ایک دبلا پتلا لڑکا کاندھوں پر میلی چیکٹ صافی رکھے قریب آ گیا۔

''اڑے بابا......سن میں جا رہا ہوں۔ علی بخش یہاں موجود ہے باقی گاہکوں کا حساب کر کے علی بخش کو دے دینا اور سن ہوٹل بند نہ کرنا آج رات۔ باقی چھوکروں کو جانے دینا۔ تُو ادھر ہی سو جانا۔''

''خیر تو ہے سائیں...... کیا آج وزن پارٹیں (شراب، جوا وغیرہ) کا ارادہ ہے؟'' منٹھار اپنی ایک آنکھ میچ کر معنی خیز لہجے میں قدرے بے تکلفی سے بولا تو دودا خان خود کو بیٹے کے سامنے خجل سا محسوس کرنے لگا اور چور نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے منہ پھٹ پیش گار چھوکرے منٹھار کو جھڑک کر بولا۔

''زیادہ بکواس نہ کر۔ جا دفع ہو جو کہا ہے وہ کرنا چل جا۔'' وہ اپنا سر کھجاتا ہوا چلا گیا۔

علی بخش غیر محسوس انداز میں مسکرایا تھا۔ دودا خان چلا گیا۔ علی بخش دخل سنبھال کر بیٹھ گیا۔ اندر ہوٹل کے احاطے میں لکڑی کی بنچوں پر گوٹھ کے لوگ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ سامنے ایک گارے مٹی کے اونچے سے چبوترے پر مختلف دیگچے چولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔ جن میں انواع و اقسام کا سالن موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی تنور بھی تھا۔ جدھر ایک اکہری جسامت والا ''تھپا تھپ'' روٹیاں لگا رہا تھا۔ ٹی وی میں آخری وقت کی خبریں نشر ہو رہی تھیں جس کی آواز بہت بلند تھی۔ علی بخش نے کاؤنٹر پر لگی گھنٹی بجائی۔ اسے ٹی وی کی اس قدر بلند آواز بُری لگ رہی تھی۔

''جی سائیں......؟'' ایک پیش گار چھوکرا قریب آ کر بولا۔ اس نے روٹی کی چھابی تھام رکھی تھی۔

''ٹی وی کی آواز آہستہ کرو جا کر۔''

''اچھا سائیں......!'' کہتا ہوا وہ چلا گیا پھر علی بخش کاؤنٹر نما شوکیس کے نیچے خانے کی جانب جھکا اور اپنی پسند کی ایک آڈیو کیسٹ نکالی۔ یہ ایک بہت مشہور گلوکار سرمد سندھی کے گانوں کی کیسٹ تھی۔ علی بخش نے ٹیپ ریکارڈر میں لگا دی۔

''جب اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے...... ہم بھی بہتیروں کو۔ بہتیروں کو ہم بھی۔ اشکوں میں بھگو چلیں گے۔ جب اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ جب اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔''

سرمد سندھی کی پُرسوز آواز میں گیت جاری تھا اور علی بخش گانے کے دل سوز بول میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک کسی نے اسے پکارتے ہوئے چونکا دیا۔ یہ ساون تھا۔ ''اڑے آیار......ساون کیا حال چال ہے بھئی۔'' علی بخش اسے پہچان کر دوستانہ لہجے میں بولا اور ساتھ ہی اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے بھرپور طریقے سے معانقہ اور بعد میں مصافحہ کیا اس کے بعد علی بخش نے ساون کو اپنے قریب ہی ایک دوسرے اسٹول پر بیٹھنے کو کہا۔ ساتھ ہی اس نے ٹیپ ریکارڈر کی آواز بھی کم کر دی۔

''اور سناؤ علی بخش کیسے ہو۔'' ساون نے رسماً احوال پوچھا۔

''میں چاک ہوں......تُو سنا۔'' علی بخش خوشدلی سے بولا پھر اس نے ایک پیش گار کو چائے لانے کا کہا۔

گو وہ دونوں کم ہی یوں ساتھ بیٹھتے تھے، لیکن باوجود اس کے ان کی دوستانہ گرمجوشی میں کمی نہیں آئی تھی۔ تاہم علی بخش کے لئے ساون کا اتنی رات گئے اس کے ہوٹل آنا اچنبھے کا باعث بنا تھا اس نے بغور ساون کا جائزہ لیا۔ وہ اسے کچھ الجھا ہوا نظر آیا۔ جیسے کچھ بتانا چاہ رہا ہو، لیکن قاصر ہے۔ بہرطور علی بخش نے یوں ہی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''یار ساون! خیریت تو ہے نا...... یوں رات کو کوئی کام ہے تو بول۔''

اس کی بات پر ساون نے ایک لمحے کو پُرخیال نظروں سے اس کی جانب دیکھا پھر بولا۔ ''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں بس گزر رہا تھا۔ تو تیرے ہوٹل سے سرمد سندھی کے گیت کی آواز سنائی دی۔ قریب آیا تو ''دخل'' پر تو موجود تھا مجھے حیرت ہوئی سو چلا آیا۔ میں نے سوچا مل بھی لیتے ہیں۔''

''اچھا کیا۔'' علی بخش دوستانہ خوشدلی سے بولا۔ اس دوران پیش گار چھوکرے نے دودھ پتی چائے کی کیتلی اور کپ رکھے تو علی بخش نے گلے سے بیس روپے نکالے اور پیش گار چھوکرے سے بولا۔ ''ڑے چھورا...... جا......شمن بھنگ موالی کی مانڈلی سے گولڈ لیف کا

آدھا پیکٹ لے آ، کھلا ہوگا ابھی تک جا تکڑا۔‘‘ پھر ساون سے مخاطب ہوا۔ ’’یار لے چائے پی۔ آج تو لگتا ہے جاڑا اچانک ہی اتر آیا ہے سگریٹ تنور کے پاس بینچ رکھ کر پیئں گے۔‘‘

سردی واقعی ایک دم بڑھ گئی تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہوٹل بند ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کچھ لوگ گھر جانے کے لیے پر تول رہے تھے تو کچھ مزید ٹی وی دیکھنے کے بہانے اور چائے وغیرہ کا آرڈر دے رہے تھے۔ ساون خاموشی سے چائے پینے لگا۔ اتنے میں چھوکرا سگریٹ کا آدھا پیکٹ لے آیا۔ دونوں اپنی چائے ختم کر چکے تھے۔

’’چل آ...... ساون آگ کے پاس سگریٹ پیتے ہیں۔‘‘ علی بخش نے ’’دخل‘‘ چھوڑتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دونوں دوست تنور کے قریب رکھی لکڑی کی بینچ پر آ بیٹھے۔ یہ حصہ ہوٹل کے چھپر تلے تھا علی بخش نے ایک سگریٹ ساون کو پیش کی۔ دوسری اپنے ہونٹوں میں دبا کر ماچس سے اس نے سلگائی۔ پھر وہی دیا سلائی ساون کے قریب کی۔ جب ساون بھی اپنی سگریٹ سلگا چکا تو دونوں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔

’’سردی کے موسم میں چائے کے بعد سگریٹ پینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔‘‘ علی بخش ایک ترنگ میں بولا۔ اب اس کے کھلے کھلے چہرے سے ذرا بھی یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے یہی لڑکا چپ چپ تھا، لیکن یہ بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہ سوائے اپنے گھر والوں کے باہر کے لوگوں کے ساتھ نارمل انداز میں ہی پیش آتا تھا اور ساون سے تو اپنے دل کا حال کہہ کر اسے زیادہ سکھ نصیب ہوتا تھا۔ گو ان کی دوستی اتنی پرانی نہیں تھی، لیکن بہر کیف اتنی پرانی ضرور تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کا حال کہہ سن لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علی بخش کے گھریلو حالات، سوتیلی ماں اور بھائی کا ناروا سلوک۔ باپ کی طرف سے بے توجہی، ان سب باتوں سے ساون آگاہ تھا اور یہ بھی واقعی امر تھا کہ اب جب کہ ساون نے علی بخش کو اپنے دل کا حال سنانے کا ارادہ کیا تھا تو اس کی زبان پر چپ سی لگ گئی تھی مگر علی بخش اس کے چہرے کے کھنچاؤ سے بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ ساون آج اس سے کوئی خاص بات کرنے آیا ہے۔

’’چل بول۔ اب جھجک چھوڑ۔ نہ تیری مجھ سے چھپی ہوئی ہے نہ میری تیرے سے۔ بول کیا بوجھ ہے تیرے سینے میں۔‘‘ بالآخر علی بخش سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے ساون سے بولا۔ ساون جان گیا اب چپ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تاہم پھر بھی وہ محتاط ہو کر بولا۔

’’یار...... علی...... بس یوں سمجھ کہ مجھے ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔‘‘

ساون کا خیال تھا کہ علی بخش اس کی بات پر ہنسے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس نے محسوس کیا

علی بخش اسے بغور دیکھ رہا ہے۔ تنور کی آگ کی تپش دونوں کے وجود کو گرما رہی تھی۔

’’اب بھی تُو نے پوری بات نہیں کی دوست۔‘‘ علی بخش سگریٹ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے پُرخیال لہجے میں بولا۔ اس کے پُراسرار لہجے پر ساون نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک رنگ سا آ کر محو ہو گیا۔

’’ہاں...... تُو سچ کہہ رہا ہے۔ تجھ سے کوئی اور ہی بات کہنی ہے۔ مگر......‘‘ ساون کہتے کہتے رک گیا۔

’’دوستی کے درمیان ’’مگر‘‘ کی گنجائش مت رکھ ساون۔‘‘ علی بخش بولا۔

’’معاف کرنا علی بخش...... ہماری دوستی زیادہ پرانی نہیں۔ ہوسکتا ہے ابھی ہمارے اندر اتنی دوستانہ وسعت نہ پیدا ہوسکی ہو اور میری کوئی بات تمہیں بری لگ جائے۔‘‘ ساون نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے پرے اُچھال کر متانت سے کہا۔

’’ساون!...... شاید تیری بات ٹھیک ہو لیکن میں آج تک جن حالات سے گزرتا آیا ہوں انہوں نے ضرور میرے اندر ہر ناگوار بات سن کر اسے گوارا کرنے کا بھی حوصلہ پیدا کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے تم کہہ دو مجھ سے جو کہنا ہے۔‘‘

ساون نے اس کی بات پر سوچتی ہوئی نگاہوں سے چند لمحے اسے دیکھا پھر بتانے لگا۔ ’’علی بخش...... پتہ نہیں تم کیا سمجھو لیکن‘‘ ...... ساون پھر اٹکنے لگا۔ مگر علی بخش کو خاموش پا کر بالآخر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔ ’’تمہارا باپ دودا خان...... تیسری شادی کر رہا ہے۔‘‘ یہ بتا کہ ساون علی بخش کا چہرہ تکنے لگا۔ جہاں گہرے سناٹوں کا راج تھا۔

’’یہ میرے باپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ ویسے میں ابھی تک تیری بات نہیں سمجھ سکا ہوں۔‘‘ علی بخش گونجیلی آواز میں بولا تو ساون بھانپ گیا کہ یہی نازک لمحہ ہے پوری بات کہنے کا۔ لہٰذا بولا۔

’’علی بخش...... میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ جس لڑکی سے شادی کر رہا ہے اس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ سال ہے اور...... اور اس لڑکی سے میں خود شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔‘‘

ساون رکا تو علی بخش سناٹے دار لہجے میں بولا۔ ’’بولتے رہو ساون رکو نہیں...... میں سن رہا ہوں۔‘‘

ساون نے دوبارہ کہنا شروع کیا...... ’’وہ لڑکی بہت معصوم اور حالات کی ستائی ہوئی

ہے۔ اپنے ظالم اور لالچی چاچا کے پاس رہتی ہے جو اسے پچاس ہزار کے عوض۔''

''بس ساون!'' علی بخش اس کی بات کاٹتے ہوئے جھٹکے دار لہجے میں بولا...... ''تو اب جا...... میں سب سمجھ گیا ہوں۔''

ساون نے دیکھا علی بخش کا چہرہ عجیب سے ارتعاش کا شکار تھا۔ ساون نے بھی مزید رکنا پسند نہ کیا اور وہاں سے فوری چلا آیا۔ واپسی میں جانے کیوں اسے رہ رہ کر ایک کسک سی ہونے لگی، وہ سوچنے لگا کہ اسے یہ بات علی بخش سے نہیں کرنی چاہئے تھی۔ یہ یقیناً دونوں باپ بیٹوں کے بیچ فساد کا سبب بنے گی مگر پھر اس کا دل کہتا کہ اس نے جو کیا درست کیا...... محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے...... بے شک اس میں خود اس کی اپنی غرض شامل تھی، لیکن بہر طور ایک معصوم اور سادہ لوح لڑکی کی زندگی کا بھی سوال تھا جو بوالہوسی کا شکار ہو کر زندہ درگور ہونے جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

سہ پہر کا وقت تھا...... اللہ رکھی بے دلی کے ساتھ اپنے دونوں بیلوں، سانولے اور ہیرے کے لیے کھرلی میں ''کتر'' کیا ہوا چارہ ڈال رہی تھی...... درحقیقت اسے کام نمٹانے کی عجلت تھی...... وہ غمزدہ بھی نظر آ رہی تھی...... چاچا سوڈھل باہر گیا ہوا تھا...... اور چاچی عنایتاں اندر کوٹھڑی میں حسب معمول اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑی ہوئی تھی۔ اللہ رکھی کو آج کل ساون سے ملنے کی بڑی جلدی ہوتی تھی اور وہ تقریباً روز ہی اس سے ملاقات کرتے ہی سب سے پہلے یہی پوچھتی تھی کہ ''اب کیا ہوگا......؟''

بے چارہ ساون کیا جواب دیتا...... بجز کبیدۂ خاطر ہونے کے...... اللہ رکھی روزانہ اس امید کے ساتھ اس سے ملتی کہ شاید اس نے کوئی ''حل'' ڈھونڈ لیا ہو...... بے چاری اللہ رکھی کو جب سے اپنے لالچی چاچا کے ''عزائم'' کا پتہ لگا تھا اس کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں۔ مگر وہ ایک مجبور، سادہ لوح معصوم سی لڑکی تھی...... بڑوں کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے والی...... اس میں اپنے چاچا کی سرتابی کرنے کی ہمت نہ تھی اور نہ ہی وہ اس ظلم پر صدائے احتجاج بلند کر سکتی تھی کہ اسے کیوں ایسے شخص کے ساتھ بیاہا جا رہا ہے جو اس سے دگنی نہیں بلکہ تگنی عمر کا ہے۔ بہر طور اللہ رکھی کو آج بھی ساون سے ملنے کی جلدی تھی۔ لہٰذا اس نے جلدی جلدی کام نمٹایا۔ صحن کے ایک کونے پر رکھی گھڑونچی سے خالی گھڑے اٹھائے اینڈوا سر پر دھرا بعد میں اوپر تلے دو مٹکے رکھے اور تیسرا کمر پر رکھ کر گھر سے باہر نکل آئی۔ باہر کچے پکے مکانوں کی منڈیروں پر ٹھٹھرتی شام پر تولے کھڑی تھی...... ماسٹر محمد حسین کی

آٹے کی چکی کی مخصوص آواز اب ماند پڑ چکی تھی۔ اللہ رکھی تیز تیز قدموں سے گوٹھ کی کچی پکی اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں سے ہوتی ہوئی لہلہاتے کھیتوں کے درمیان سے گزرتی سانپ کی طرح بل کھاتی پگڈنڈی پر ہو لی...... اب اس کے دائیں بائیں سرسوں اور تلوں کے کھیت تھے...... گوٹھ کی گلیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ پھر جب پگڈنڈی کے سرے پر ایستادہ آسریں...... کے ایک چھتنار پیڑ تلے سے گزری تو مذکورہ پیڑ کے تنے کی اوٹ سے دودا خان شکرے جیسی نظروں سے اللہ رکھی کو جاتے دیکھنے لگا...... پھر اگلے ہی لمحے وہ موٹے تنے والے پیڑ کے عقب سے نکلا اور محتاط روی سے اللہ رکھی کے تعاقب میں ہو لیا۔

ادھر اللہ رکھی اپنے تعاقب سے بے خبر تیز تیز چلی جا رہی تھی...... اب اسے ذرا ہی فاصلے پر سامنے نہر کا کراڑ دکھائی دینے لگا تھا۔ جدھر کانٹے دار خودرو پودوں کی بہتات تھی وہاں اسے کچھ عورتیں اور لڑکیاں بھی پانی سے بھرے مٹکے سروں پر کمر پر اٹھائے لوٹتی نظر آئیں...... اللہ رکھی دانستہ ایسے وقت میں پانی بھرنے جاتی تھی جب دوسری لڑکیاں اور عورتیں واپس لوٹ رہی ہوں......

''اڑی...... اللہ رکھی...... تجھے ہر روز دیر ہو جاتی ہے...... خیر تو ہے نا...... کوئی ''راز'' تو نہیں......'' اس کے قریب سے گزرتی ہوئی من چلی حسنہ نے معنی خیز انداز میں لفظ ''راز'' پر زور دیتے ہوئے اللہ رکھی سے کہا تو اللہ رکھی ایک ثانیے کو گڑبڑا سی گئی...... اس کی نظروں کا چور عیاں ہونے لگا...... تاہم وہ بمشکل مسکرا کر رہ گئی...... اللہ رکھی اب کراڑے پر چڑھ چکی تھی اور ساتھ کن انکھیوں سے اپنے اطراف میں بھی دیکھنے لگی...... جہاں آس پاس نہ صرف قد آدم خودرو جھاڑیوں کے جھنڈ تھے بلکہ کہیں کہیں لئی اور ببر کے پیڑ بھی تھے...... اللہ رکھی اب نہر کے کنارے بیٹھ کر مٹکوں میں پانی بھرنے لگی...... تب اسے نہر کی شفاف سطح پر کسی کا ہیولا لہریں مارتا نظر آیا...... اللہ رکھی نے یکدم اپنے عقب میں دیکھا اور غیر متوقع طور پر سامنے دودا خان کو پا کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ عالم اضطراب میں مٹکے چھوڑ کر کھڑی ہوئی...... دو مٹکے تو گیلی مٹی میں دھنسنے لگے جبکہ تیسرا مٹکا پانی کے ساتھ بہہ گیا...... انجانے خوف سے اللہ رکھی کا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا...... وہ بے اختیار دودا خان سے ذرا چند قدم پیچھے ہٹ گئی تھی...... دودا خان اسے خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا...... اس کے ایک ہاتھ میں بارہ بور کی بندوق دبی ہوئی تھی...... اللہ رکھی پر سخت گھبراہٹ سی طاری تھی اسے اور کچھ تو نہ سوجھا...... نیچے جھکی...... زمین پر رکھے اینڈوے کو سر پر رکھا پھر دونوں مٹکے سنبھالتی ہوئی اٹھنے لگی تو اس کی سماعت سے دودا خان کی آواز ٹکرائی...... ''اللہ رکھی......!

توں پاڑیں بھڑاں نہ آیا کر......'' اللہ رکھی نے صرف ایک لمحے کے لیے اس کی بات پر ٹھٹکتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر خاموشی سے تیز تیز چلتی ہوئی آگے ہولی۔ وہ اتنی ہراساں ہوگئی تھی کہ اس نے اپنے عقب میں بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ آیا دودا خان اس کے تعاقب میں ہے یا نہیں...... معاً پھر جب وہ آگے ایک آسریں کے پیڑ کے نزدیک سے گزرنے لگی تو ٹھٹک کر رک گئی...... سامنے ساون اجرک اوڑھے کھڑا مسکرا رہا تھا...... اس کے کاندھوں پر کلہاڑی ٹکی ہوئی تھی...... ساون نے جب اللہ رکھی کے بھولے بھالے حسین چہرے پر گھبراہٹ اور وحشت کی لہریں محسوس کی تو اسے تشویش ہوئی۔

''کیا بات ہے اللہ رکھی!...... تُو اتنی پریشان کیوں ہے......؟'' اللہ رکھی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مضطرب سی نگاہوں سے اپنے عقب میں دیکھا تو وہ مزید ہراساں نظر آنے لگی...... ساون نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو اسے دودا خان نظر آ گیا۔ تب اسے خود ہی اپنے سوال کا جواب مل گیا کہ اللہ رکھی کیوں اتنی ہراساں ہو رہی تھی۔

''سس...... ساون تُو چلا جا...... یہ تجھے مار نہ دے......'' معاً اللہ رکھی پُرتشویش لہجے میں ساون کو مخاطب کرتے ہوئےبولی۔

دودا خان کو اللہ رکھی کے تعاقب میں آتے ہوئے دیکھ کر ساون کی آنکھوں میں ایکا ایکی خون کی سرخی اتر آئی تھی پھر یونہی اس کا ہاتھ اپنے کاندھوں پر ٹکی کلہاڑی کے دستے پر رینگ گیا...... اسی اثناء میں دودا خان بھی دور سے ہی ساون کی جانب گھورتا ہوا قریب آ گیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے گرجدار آواز میں ساون سے بولا۔ ''اللہ رکھی کا راستہ کیوں روک رکھا ہے تُو نے......''

اس کے غصیلے لہجے نے ساون کے تن بدن میں جیسے آگ بھر دی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ بھی بلند آواز میں گرج کر بولا تو اس کے لہجے سے شعلے لپکتے محسوس ہونے لگے۔ ''دودا خان...... میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں لیکن...... تیری پیرسنی کا خیال آتا ہے...... مجھے ورنہ......''

ساون کے لہجے کی دھمکی پر دودا خان جیسے آگ بگولہ ہوگیا...... اور اس نے اپنی بندوق ساون پر سیدھی کرلی یہ دیکھ کر اللہ رکھی دھک سے رہ گئی...... ساون اپنی جگہ ''کیل'' بنا دودا خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے شعلہ بار نظروں سے تک رہا تھا...... اللہ رکھی کے حلق سے ایک چیخ نکلی اس نے پانی سے بھرے مٹکے پھینک دیئے اور یکدم ساون کے آگے آ کر

دودا خان کی طرف ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''نہیں دودا خان...... تیکوں رب دا واسطہ...... خون خرابہ نہ کر...... ساون بے قصور ہے۔''

''اللہ رکھی آگے سے ہٹ جا تُو...... آج اس بات کا فیصلہ ہو لینے دے...... یہ تجھے اپنی ملکیت کب سے سمجھنے لگا ہے۔'' ساون غیظ آلود لہجے میں دودا خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا...... اور ساتھ ہی اس نے اللہ رکھی کو ایک ہاتھ سے اپنے سامنے سے پرے ہٹا دیا۔

ساون کی ''ملکیت'' والی بات پر دودا خان کی آتش ناک آنکھوں میں ایک لمحے کو الجھن سی تیر گئی...... تاہم وہ کھرکھراتے ہوئے لہجے میں بولا...... ''اللہ رکھی کو میں اس کے وارثوں سے اپنے نام کرا چکا ہوں...... یقین نہیں آتا تو پوچھ لے اس کے چاچا سوڈھل سے...... لیکن اگر اس کے مالکوں سے پوچھنے کے بعد بھی تُو اللہ رکھی کے سامنے آیا تو...... تو سمجھ جائیں تیرا کیا حشر کروں گا......'' آخری جملہ اس نے قدرے توقف سے ادا کیا اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ساون کے وجود میں ایکا ایکی مزاحمتی جنبش ابھری لیکن اللہ رکھی نے اس کے جسم کا ارتعاش محسوس کرتے ہوئے اسے روک دیا۔

''نہیں ساون! دھڑیں واسطے جانے دے اس مردودے کو......''

''اللہ رکھی! بس اب بہت ہو گیا...... مجھے اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑے گا......'' ساون فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

اللہ رکھی بے چاری زمین پر ٹوٹ کر بکھرے ہوئے مٹکوں کو دیکھنے لگی تو ساون کا دل بے اختیار اس کی معصوم اداسی پر بھر آیا...... ''اللہ رکھی......! چل میں تجھے ابھی سانگی کی ہٹی سے مٹکے لے دیتا ہوں...... ورنہ چاچی تیری خفا ہو گی تجھ پر۔''

اللہ رکھی ساون کے ملائمت بھرے لہجے پر مسرور سی ہوگئی اور وہ معصومیت سے سوچنے لگی کہ اس کے ساون کو اس کا کتنا خیال ہے۔

''کیا سوچنے لگی اللہ رکھی......؟'' اسے خاموش پا کر ساون اس کے صبیح چہرے کو دیکھتے ہوئے محبت پاش لہجے میں بولا...... تو اللہ رکھی کا دل جانے کیوں پسیج گیا...... اور وہ بے اختیار لہجے میں بولی۔

''ساون'' میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتی...... مجھے اس دودا خان سے بچا لو...... وہ مجھے خریدنا چاہتا ہے۔ کیا...... ساون...... تمہارے پاس اتنے بھی پیسے نہیں ہیں کہ تم اس مردود دودے خان سے بڑھ کر بولی لگا کر مجھے میرے چاچا سے خرید لو......؟''

ساون اللہ رکھی کی بات سن کر دنگ رہ گیا...... اللہ رکھی کے لہجے کی بے بسی و بے چارگی

پر اس کا دل کٹنے لگا...... وہ بے اختیار ہو کر محبت بھرے جذبات سے لبریز...... مگر مضبوط لہجے میں بولا...... ''اللہ رکھی تُو فکر نہ کر میرے جیتے جی تو کسی ''کالے بیری'' کے ہتھے نہیں چڑھ سکتی۔ تجھے پانے کے لیے تو میں ساری دنیا کی دولت لا کر تیرے چاچا کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا اور تجھے اپنا بنا لوں گا...... لیکن اللہ رکھی...... اس کا یہ مطلب نہیں کہ تیرا مول یہ روپے ہیں...... تُو تو ان مول ہے اللہ رکھی...... ساری دنیا کی دولت تیرے آگے ہیچ ہے۔''

''ہاں ساون! میں جانتی ہوں...... مگر میرا چاچا ایک نہایت حریص انسان ہے...... مجھے یقین ہے ساون...... اگر تُو نے اس مردود دودے خان سے دس بیس ہزار زیادہ دے دیئے تو وہ فوراً میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دے گا......'' اللہ رکھی نے جیسے اسے گراں قدر مشورے سے نوازا...... اور ساون اس کی بات پر دھیرے دھیرے پُر خیال انداز میں اپنے سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دینے لگا۔

اللہ رکھی سے ملنے کے بعد اب ساون نے مصمم ارادہ باندھ لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ اللہ رکھی کو حاصل کرنے کے لیے وڈیرے سے قرض ضرور مانگے گا...... یہ فیصلہ کرتے ہوئے اس کے دماغ میں باپ کی تنبیہہ بھی گونجنے لگی کہ جو ایک بار وڈیرے کا قرض دار ہو جاتا ہے تو وہ ساری عمر قرض کے ''پٹے'' سے اپنی گردن نہیں چھڑا سکتا۔ لیکن اس نے اس کی بھی پروا نہیں کی اور سیدھا وڈیرے کی اوطاق میں پہنچا...... حسب توقع اسے منشی میرل منکن ہار...... نظر آ گیا۔ وہ سرکنڈوں کا ایک کشادہ پشت گاہ رکھنے والے مونڈھے پر تنا ہوا بیٹھا رجسٹر گود میں پھیلائے اندراج میں مگن تھا۔ سامنے اس کے چند مجہول اور مفلوک الحال ہاری پکی اینٹوں کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''سلام علیکم منشی سائیں۔'' ساون اس کے روبرو آ کر بولا تو منشی میرل نے چونک کر سر اٹھایا اور اپنی چھچھوندر جیسی آنکھوں سے موٹے کالے فریم والا چشمہ اتارا تو ساون کو اپنے روبرو پایا تو اس کے خاکستری مائل باریک ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی...... اور وہ لہکتی ہوئی آواز میں ساون کے سلام کا جواب دیتے ہوئے مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے بولا۔

''آؤ...... آؤ ساون...... بسم اللہ...... کیسے آنا ہوا؟''

وہاں فرش پر بیٹھے دوسرے ہاری ساون کی منشی میرل کے ہاتھوں اس عزت افزائی پر جل سے گئے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ساون کا باپ موگو بھی انہی کی طرح کا ایک عام غریب ہاری ہے۔ یہی نہیں اس نے ساون کو اپنے قریب میں ایک دوسرے مگر قدرے چھوٹے مونڈھے پر بیٹھنے کو بھی کہا...... ساون چپ چاپ بیٹھ گیا...... چند ثانیے منشی میرل

خاموش اور کھوئے کھوئے بیٹھے ساون کو اپنی چندھی آنکھوں سے گھورتا رہا پھر بولا......

''ساون...... بابا تجھے جلدی تو نہیں ہے نا...... میں پہلے ذرا انہیں فارغ کر دوں پھر تجھ سے بھی حال احوال کرتے ہیں...... ٹھیک ہے نا بابا۔ ویسے لگتا ہے تو آج کوئی اہم بات کرنے آیا ہے۔'' بالآخر منشی نے دل کی بات ساون سے کہہ ہی ڈالی اور ساون قدرے چونک کر اس کا لمبوترا چہرہ تکنے لگا۔ منشی میرل نے پھر جلدی جلدی سامنے بیٹھے ہاریوں سے کچھ پوچھ تاچھ کر کے ان کے ہاتھ کا ایک ایک انگوٹھا رجسٹر پر لگانے کے بعد...... اپنی بیش قیمت کپڑے کی بنی ہوئی کمری کی اندرونی جیب سے چند بڑے نوٹ نکال کر انہیں تھماتے ہوئے رخصت کر دیا۔

''ہاں بابا...... ساون...... کیا بات ہے...... بولو۔'' وڈیرے کے ساتھ رہ رہ کر منشی میرل منکن ہار کا لہجہ بھی اسی جیسا ہو گیا تھا...... یا پھر دانستہ طور پر اس نے ایسا لہجہ اپنا لیا تھا۔

''منشی...... مجھے روپے چاہئیں تھے...... کچھ......؟'' ساون نے جھجک بولا۔

اس کی بات پر منشی دھیرے سے عجیب انداز میں مسکرایا تھا...... ''کتنے چاہئیں؟'' اس نے بھی بولنے میں دیر نہیں کی تھی۔

''پچاس ہزار۔'' ساون نے کہا تو منشی میرل بھک سے ہو گیا اس کا خیال تھا کہ ساون یہی کوئی دس پندرہ ہزار مانگے گا اس نے ایک نظر بغور ساون کو دیکھا یوں جیسے اندازہ کرنا چاہ رہا ہو...... کہ آیا جتنی مالیت کا وہ قرض مانگ رہا ہے اتنی...... ادائیگی کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

''پچاس ہزار۔'' منشی میرل کے منہ سے نکلا...... ''کیا کوئی زمین خرید رہا ہے؟''

''شادی کرنی ہے میں نے......'' ساون بولا۔

''شادی کے لیے اتنے روپے؟ کیا کوئی پری بیاہ رہا ہے۔'' منشی تحیر آمیز طنز سے بولا تو ساون کو قدرے ناگوار گزری اس کی بات...... یہی وجہ تھی کہ فوراً اسی لہجے میں بولا۔

''منشی! یہ میرا معاملہ ہے...... تُو تفصیل میں کیوں جاتا ہے...... اگر دینا چاہتا ہے تو بات کر...... ورنہ تیری مرضی۔''

''واہ سائیں صدقے ونجاں تیری ڈھٹائی کے...... قرضہ بھی مانگنا ہے تو کلہاڑی کی دھار پر......'' منشی بدستور طنزیہ لہجے میں بولا

''مفت میں نہیں مانگ رہا...... سود پر لے رہا ہوں......'' ساون نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''کب تک چاہیے؟''منشی بالا بولا۔

''جتنی جلدی ہو سکے۔'' ساون جواباً بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے...... تُو ایسا کر...... وڈیرا سائیں ابھی یہاں نہیں ہے...... میں کل تک اس سے بات کرلوں گا تو کل اس سمے یہاں اوطارے میں آجانا...... کوشش کروں گا تیرا کام کرنے کی......''منشی کی بات پر جب ساون اٹھ کر جانے لگا تو منشی میرل نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور بولا۔

''ساون بابے...... میری کمیشن تو دے گا نا......؟''

''ہاں...... تجھے خوش کروں گا......'' ساون نے مختصراً کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

سارے راستے اس کا دماغ بوجھل سا محسوس ہو رہا تھا...... اگرچہ اسے یہ سب عجیب اور مشکل بھی لگ رہا تھا مگر...... جب اللہ رکھی کا معصوم اور خوبصورت چہرہ اس کے پردۂ تصور میں ابھرتا اور اس کی نوخیز جوانی کی معصوم مہک اس کے روم روم میں اترتی محسوس ہوتی تو وہ ہران خدشات اور اندیشوں سے خود بخود یکسر بے نیاز ہوتا چلا جاتا...... جو اسے اس کے مصمم ارادے سے متزلزل کرنے لگتے تھے......

وہ گرد آلود راستے پر چلا جا رہا تھا...... پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی البتہ موسم میں سردی کی یخ بستگی عنقا تھی...... گھر میں اس وقت صرف ایک ماں موجود تھی مگر وہ بھی اس کی منتظر تھی...... وہ رسوئی سے باہر نکل رہی تھی بیٹے کو دیکھتے ہی بولی۔''پٹ ساون! چنگا تھیا توں آ گیا...... تو گھر میں بیٹھ میں ماسی حلیماں سے مل کر آتی ہوں ذرا...... پتہ نہیں بے چاری بیمار شیمار ہوگئی ہے......''

''اچھا آمڑ...... تُو جا بے شک......'' یہ کہتے ہوئے ساون کشادہ مگر کچے صحن میں بچھی کھری چارپائی پر جوتوں سمیت پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا...... ساون کی ماں اتنے میں اندرونی کوٹھڑی سے سفید رنگ کا چنٹ دار گھیر والا ٹوپی والا برقعہ لے آئی اور اسے اوڑھ کر باہر چلی گئی۔

گارے مٹی سے لپٹی ہوئی کچی دیواروں نے صحن کے گرد وسیع احاطہ سا بنایا ہوا تھا...... جس کی ایک جانب بالترتیب تین کمرے نما کچی کوٹھڑیاں بھی بنی ہوئی تھیں...... کمروں کے سامنے رخ پر دیوار کے ساتھ ساتھ باورچی خانہ اور ذرا سا آگے غسل خانہ تھا۔صحن کے وسط میں بیری کا گھنا پیڑ تھا...... دوسری جانب دیوار کے کونے والی جگہ پر پھونس کے چھپر تلے دو بھینسیں جگالی کر رہی تھیں۔جبکہ ان کے سامنے کھرلی کُٹ سے بھری

ہوئی تھی...... دیواروں پر جا بجا اپلے بھی تھپے ہوئے تھے۔

ساون چارپائی پر اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجے ملائے سر کے نیچے دیئے چت لیٹا آسمان کو تکے جا رہا تھا۔وہ کسی عمیق سوچ میں غلطاں تھا کہ اچانک اس کی سماعت سے ایک کھنکتی ہوئی شوخ سی ہنسی ٹکرائی اس نے چونک کر آواز کی سمت گردن موڑ کر دیکھا تو سامنے والی دیوار سے اس کی چچازاد سورٹھ کا گورا چٹا چہرہ نظر آیا۔وہ اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔''اکیلا ہے گھر میں تو۔چاچی کہاں گئی؟''

ساون کے چہرے پر بیزاری سی پھیل گئی تاہم جی کڑا کر کے بولا......''آمڑ...... ماسی حلیماں کے ہاں گئی ہے......''

''میں بھی آج گھر میں اکیلی ہوں ادا گل محمد اور پیو شہر گئے ہوئے ہیں...... اماں بھی نہیں ہے تُو ایسا کر''کھاٹر سے آجا میرے پاس، باتیں کرتے ہیں، بڑا مزہ آئے گا......''

سورٹھ نے بتایا تو ساون کو جیسے چپ سی لگ گئی...... اسے کبھی کبھی سورٹھ کی ایسی دیدہ دلیری پریشان کرنے لگتی تھی...... بلکہ اکثر تو وہ اس کی آزادانہ روش پر خوف زدہ بھی ہو جاتا تھا۔تاہم وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔

''دیکھ سورٹھ! میں ذرا دوسرے مزاج کا لڑکا ہوں۔میرے ساتھ زیادہ باتیں بنانے کی کوشش نہ کیا کر جا...... ہٹ یہاں سے......''اس کی جھڑکی کارگر ثابت نہ ہو سکی تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے سورٹھ اس کے درشت لہجے کی پروا کئے بغیر بولی۔

''اسی لیے تو تُو مجھے اچھا لگتا ہے کہ تُو''دوسرے مزاج'' کا لڑکا ہے۔''پھر چند ثانیے توقف کے بعد ساون کا موڈ بنانے کی سعی کرتے ہوئے بولی......''اچھا چل تُو نہیں آتا تو نہ آ...... میں خود''کھاٹر''(دیوار میں نصب آدم گزار کھڑکی) سے آجاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے سورٹھ کا چہرہ منڈیر سے غروب ہو گیا...... ساون اس کی بات پر بھک سا رہ گیا...... اسے جان چھڑانا مشکل ہو رہی تھی...... وہ فوراً چارپائی سے اٹھا اور دیوار کی جانب بڑھا جہاں آدم گزار کھڑکی نصب تھی۔اس کے پار دوسری طرف ساون کے چاچا پیرل کا گھر تھا...... عموماً دیوار میں بنی اس دروازہ نما کھڑکی سے دونوں گھروں کی عورتیں آیا جایا کرتی تھیں...... دوسری جانب پیرل اپنے بیوی بچوں گل محمد اور بیٹی سورٹھ کے ساتھ رہتا تھا...... بہت عرصہ پہلے جب دونوں بھائیوں یعنی موگو اور پیرل کے بچے ابھی جوان نہیں ہوئے تھے...... تو یہ دیوار جس میں آدم گزار کھڑکی نصب تھی...... موجود نہ تھی اور یہ سب ایک خاندان کی صورت میں رہتے تھے، لیکن پھر دونوں بھائیوں کے دلوں میں کیا سمائی کہ انہوں

نے درمیان میں دیوار اٹھا دی لیکن اندرونی حصے میں آمدورفت کی خاطر یہ کھاٹر بنا دی...... اور اب سرکش سورٹھ ساوان کے پاس آنے کے لئے پر تول رہی تھی ...... مگر ساون ابھی کھڑکی تک پہنچا ہی تھا کہ اندر سے کنڈی چڑھا دے۔ ایک کھڑاکے کی آواز سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے اور شوخ و چنچل سورٹھ شیشوں کے کام اور کڑھائی کئے ہوئے بھاری بھرکم لباس میں چھم سے اندر کود آئی اور اپنی ہی رو میں آگے بڑھتی ہوئی ساون سے جا ٹکرائی......

زرق برق لباس کی چھپا چھپ پر خوبصورت پراندے میں گندھی ہوئی کالے بالوں کی چوٹی کی چھنا چھن نے ایک ثانیے کو کیا بلکہ کئی لمحوں تک ساون کے ہوش و حواس متزلزل سے کر دیئے اور ساون نے زور سے سورٹھ کو پرے دھکیل کر خود کو علیحدہ کر دیا...... اور وہ بے چاری گرتے گرتے بچی...... ایک لمحے کو اس کا چہرہ غصے میں سرخ ہونے لگا مگر پھر بتدریج اس کا رنگ معمول پر آ گیا۔ مگر جب وہ تنک کر بولی تو اس میں غصے کی آمیزش ضرور شامل تھی۔

''ہے...... چھورا اتنی زور سے ایک کمزور لڑکی کو دھکا دیتا ہے...... شرم کر مجھے چوٹ لگ جاتی تو......''

ساون اس کی ڈھٹائی پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ تاہم جواباً وہ بھی غصے سے بولا......

''تجھے بڑی شرم ہے...... پرائے چھوکرے پر گرتی ہے تو۔ جا واپس......''

''تُو پرایا کب ہے ساون......'' سورٹھ عالم بے خودی کے زیر اثر بولی، اس کی آواز میں صدیوں پرانی یادوں کی کھنک تھی۔ ''ساون پتہ ہے...... جب ہم سب ساتھ رہتے تھے...... اور جب یہ دیوار نہیں تھی...... تب سے...... ہاں تب سے ساون۔ میں نے تجھے اپنے دل میں بسایا ہوا ہے......''

ساون کو جانے کیوں اس کی بات پر بے اختیار ہنسی آ گئی اور بولا۔ ''ہے چھوری!...... اس وقت تُو اتنی چھوٹی ہو گی تو تجھے بھلا کیا پتہ ان باتوں کا......''

''نا ساون! مذاق نہ اڑا میری محبت کا...... یقین مان...... میرے دل میں شروع ہی سے تیری صورت بسی ہوئی ہے......'' سورٹھ پھر دھیرے دھیرے اس کے قریب آنے لگی اور ساون کا جی پھر گھبرانے لگا...... وہ بولا۔

''اچھا بہت باتیں ہو گئی ہیں اب تُو جا یہاں سے کوئی آ گیا تو یونہی باتیں بنیں گی خاندان میں......''

''ہماری باتیں کوئی نہیں بنائے گا ساون...... ہم دونوں...... تو...... مجھے شرم آتی ہے۔''

سورٹھ نے یک دم اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لئے اور ساون پہلے اس انوکھی لڑکی کی

جرأت رندانہ اور پھر شرم سے سرخ ہونے پر متحیر سا ہوا۔ عجیب سرکش نظر آنے لگتی ہے اور کبھی شرم سے چھوئی موئی بننے لگتی ہے۔ وہ حیرت سے سوچنے لگا۔ سورٹھ جواب ساون کے قریب آ چکی تھی بولی...... ''تُو اتنا بے خبر کیوں رہتا ہے...... تجھے یہ بات کیوں نہیں معلوم کہ...... میرا باپ گل محمد کے لئے تیری بہن ہدایتاں کا رشتہ لینے آنے والا ہے...... اور...... اور پھر ظاہر ہے کہ...... چاچا، چاچی بھی تیرے لیے میرا ہی ہاتھ...... مانگیں گے۔'' سورٹھ نے جیسے ساون پر بم گرا دیا...... وہ سورٹھ کی بات سن کر اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔

سورٹھ کی دھماکہ خیز اطلاع نے ساون کو جیسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا...... سورٹھ نے صاف طور پر محسوس کیا کہ ساون کو اس ''پیشگی اطلاع'' پر خوشی نہیں ہوئی بلکہ وہ الٹا پریشان نظر آنے لگا تھا۔

''کیوں ساون تجھے خوشی نہیں ہوئی...... تُو...... تُو مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا......!'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

''ابھی میں نے شادی کا نہیں سوچا ہے......'' ساون نے گڑبڑاتے ہوئے مبہم سا جواب دیا...... پھر اس سے گویا جان چھڑانے والے انداز میں بولا...... ''سورٹھ! تُو اب چلی جا یہ اچھا نہیں کہ کوئی ہمیں اکیلا یہاں دیکھ لے...... میں ذرا اس وقت پریشان ہوں۔''

''آخر ایسی گڑتی والی کیا بات ہے...... جو مجھ سے بھی نہیں کرتا۔'' سورٹھ قدرے الجھ کر بولی تو ساون نے ایک لمحے کو سخت نظروں سے اسے گھورا۔

''تُو نہیں جاتی تو کھڑی رہ ادھر...... میں چلا جاتا ہوں اندر......''

یہ کہتے ہوئے ساون اپنی کوٹھڑی کی جانب بڑھ گیا...... اور سورٹھ درماندۂ دل کے ساتھ چند ثانیے جہاں کی تہاں کھڑی رہنے کے بعد ایک تکلیف دہ آہ کھینچ کر کھڑکی نما دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

☆======☆======☆

''سائیں وڈا......! پھر کیا خیال ہے...... موگو ہاری کے پٹ ساون کو قرضہ دے دیں!'' منشی میرل اجازت طلب لہجے میں بولا...... سامنے آسریں کی بنی مضبوط نقشین پایوں والی رلی بچھی چارپائی پر گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے وڈیرا میر لکھ میر خان حقے کی نَے تھامے بیٹھا تھا...... اس وقت اوطاق میں دونوں تنہا تھے...... میرل چارپائی کے قریب ہی وڈیرے کے سامنے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ وڈیرے نے منشی کی بات سن کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ دنیا کا احمق ترین آدمی ہو...... پھر وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔

''اڑے منشی تُو بالکل بے وقوف ہے...... اڑے بابا...... ترنت قرضہ دے دے ساون کو...... یہ وہی چھوکرا ہے نا جو زیادہ شور مچاتا تھا بٹائی کے وقت......''

''ہا سائیں......! وہی ہے......'' منشی نے اثبات میں جواب دیا۔

''بس تو بابا پھر قرضے کا پٹہ ڈال دے اس کی گردن میں۔ جوانی کی ساری گرمی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی اس کی......''

''مگر سائیں بھوتار...... وہ تو...... دس بیس نہیں پورے پچاس ہزار قرض مانگ رہا ہے......''

منشی میرل نے انکشاف کرتے ہوئے کہا تو وڈیرا پھر فوراً بولا ''اڑے بابا...... لاکھ مانگے تو لاکھ دے دے...... جتنا قرضہ زیادہ لے گا اتنا اس کی گردن میں پٹہ تنگ ہوتا جائے گا بابا...... پچاس ہزار بھی تھوڑا۔''

''اچھا سائیں برابر...... آج وہ آئے گا پھر...... انگوٹھا لگوا کر...... روپے اس کے حوالے کردوں گا......'' منشی میرل جواباً بولا۔

چند ثانیے اوطاق میں گہری خاموشی طاری رہی اس کے بعد وڈیرا لکھمیر خان نے حقے کا ایک طویل کش لے کر فضا میں دھواں اگلا اور کچھ سوچتے ہوئے گہرے لہجے میں منشی سے بولا...... ''ویسے منشی......''

''حاضر سائیں۔''

''بابا یہ...... ساون اتنا پیسہ لے کس واسطے رہا ہے......؟'' وڈیرے کی بات پر پہلی مرتبہ منشی میرل کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''سائیں...... بھوتار...... چھوکرا...... کوئی حور پری بیاہ رہا ہے۔''

''ہالا......!'' وڈیرے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاؤ سائیں...... ظاہر ہے...... پچاس میں...... ملنے والا سنگ تو......'' منشی نے اپنی بات کی معنی خیزی بڑھانے کی غرض سے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''منشی میرل۔'' معاً وڈیرا لکھمیر خان گونجیلی آواز میں بولا اور ساتھ ہی تن کر بیٹھ گیا...... اس کی ستونوں جیسی موٹی ٹانگیں اب چارپائی سے نیچے جھول رہی تھیں جس کی وجہ سے اس کی ریشمی لاگ (تہبند) رانوں تک اونچی ہوگئی تھی۔

''حاضر سائیں بھوتار......'' منشی گڑبڑا کر یکدم بولا۔

''ہماری پوری جاگیر میں دس پندرہ ہزار سے زیادہ بڑھ کر کوئی ایسا سنگ (لڑکی کا

رشتہ) ہے ہی نہیں...... یہ پچاس ہزار والا کدھر سے آگیا...... اور جسے حاصل بھی ایک معمولی ھاری کا بیٹا ساون کر رہا ہے۔''

''اسی بات پر تو میں خود حیران ہوں سائیں وڈا......'' منشی نے اپنے لہجے میں حیرت سمیٹتے ہوئے کہا۔

''اڑے تُو نے کیا بھنگ چڑھا رکھی تھی پھر......'' وڈیرا دھاڑا...... لیکن پھر فوراً نیچی آواز سے بولا...... ''اچھا سن...... ذرا پتہ کر...... وہ حور پری کون ہے...... کس کی بیٹی ہے...... میری حویلی کی دیواریں کیا اتنی نیچی ہوگئی ہیں کہ مجھے وہ ہیرا نظر نہ آسکا۔'' وڈیرے کا لہجہ آخر میں پُراسرار حد تک گمبھیر ہوگیا تھا...... اور منشی میرل کی چندھی آنکھوں میں عجیب سی تصور آمیز چمک لہرانے لگی۔

☆======☆======☆

آج خلاف توقع سوڈھل دوپہر کا کھانا کھاتے ہی اپنی کوٹھڑی میں آرام کی غرض سے چلا گیا تھا۔ شام کو اٹھا تو اندھیرا پھیلنے کو تھا...... اللہ رکھی اس کے لیے چائے کا پیالہ لے آئی۔

''اللہ رکھی!'' سوڈھل نے اللہ رکھی کو پکارا...... جو چائے کا پیالہ رکھنے کے بعد لوٹ رہی تھی۔ چاچا کے پکارنے پر وہ رک گئی۔

''جی چاچا......'' وہ مدھم لہجے میں بولی۔

''تجھے کوئی کام تو نہیں ہے نا...... میرا مطلب ہے چاچی کا تو کوئی کام نہیں کرنا ہے تو نے......'' سوڈھل نے کسی خیال کے تحت پوچھا پھر جیسے خود ہی اپنی بات پر مسکراتے ہوئے بولا...... ''میں ہی پاگل ہوں...... بھلا تیری چاچی کا کوئی کام ختم ہونے والا ہے...... چل تُو بیٹھ...... ادھر تیرے سے مجھے بات کرنی ہے ضروری......''

اللہ رکھی اس کی بات پر چند ثانیے کو ٹھٹکی تھی...... پھر خاموشی سے سر جھکائے سامنے کی جھلنگا چارپائی پر پاؤں لٹکائے اور سر جھکائے بیٹھ گئی...... کمرے میں بلب کی زرد بیمار سی روشنی پھیلی ہوئی تھی...... اللہ رکھی کا دل جانے کیوں دھڑکنے لگا...... سوڈھل نے گرم گرم چائے کی چند چسکیاں بھریں...... پھر بولا...... ''اللہ رکھی...... تُو میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے...... اور مجھے بیٹیوں کی طرح عزیز ہے...... میں تیرا چاچا ضرور ہوں...... مگر باپ کی حیثیت بھی رکھتا ہوں...... بھائی مٹھل کو رب سائیں جنت نصیب کرے...... اس کے گزرنے کے بعد تیری ذمہ داری مجھ پر آگئی...... یہ میں نے تجھ پر کوئی احسان تھوڑا ہی کیا

ہے...... یہ میرا فرض تھا۔'' اتنا کہہ کر وہ چند لمحے تھما۔

اللہ رکھی کو اپنے ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے وہ چپ تھی...... ''توں سن رہی ہے نا...... دھیئے اللہ رکھی......'' سوڈھل نے اسے پکارا۔

''ہاؤ چاچا سائیں...... سن رہی ہوں میں......'' اللہ رکھی چونک کر بولی۔

سوڈھل اب بغور اپنی آنکھیں اپنی سکیڑے اللہ رکھی کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور کچھ متذبذب بھی نظر آنے لگا...... یوں لگ رہا تھا...... جیسے اسے کوئی اہم بات کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہو...... تاہم وہ بولا۔ ''اللہ رکھی...... بیٹیاں پرائی ہوتی ہیں۔ گھر تو انہیں نہیں بٹھانا ہوتا نا...... اب ظاہر ہے یہ ذمہ داری بھی مجھی کو نبھانی ہے...... تیری چاچی کو بیماری نہیں چھوڑتی...... ورنہ یہ بات وہ تجھ سے کرتی...... دیکھ اللہ رکھی...... میرا حال بھی تیرے سامنے ہے...... جمع جتھا میرے پاس ہے نہیں...... وڈیرے کی ''رہا کی'' کرتے کرتے میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب خیر سے تجھے بیاہ دوں تو سکون سے آنکھیں بند کرلوں......'' آخر میں سوڈھل کے لہجے میں مکارانہ رقت سی اتر آئی تھی جس پر اللہ رکھی نے ہولے سے سر اٹھا کر سوڈھل کی جانب دیکھا تھا...... جانے کیوں اللہ رکھی کو ترس سا آنے لگا...... مگر وہ چپ رہی۔

اسی وقت...... باہر سے چاچی عنایتاں کی آواز ابھری...... وہ اللہ رکھی کو پکار رہی تھی...... ''اڑی کاں...... مرگئی...... ادھر آ...... ذرا میرے گھٹنوں میں آ کے ناڑے باندھ دے۔ درد سے مری جارہی ہوں۔''

بیوی کی بے وقت کی پکار پر سوڈھل جھنجھلا گیا اور وہیں سے ہی چلا کر بولا۔ ''اڑی منحوس ذرا ماٹھ کر لے تھوڑی دیر...... میں اللہ رکھی سے ضروری بات کر رہا ہوں اس وقت جان چھوڑ ہماری......'' اس کی جھڑکی نے فوراً اثر دکھایا کیونکہ پھر دوبارہ عنایتاں کی آواز نہیں آئی تھی۔

''ہاں...... تو دھیئے اللہ رکھی! میں کہہ رہا تھا۔'' سوڈھل نے اپنا سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہنا شروع کیا...... ''کہ میں چاہتا ہوں مرنے سے پہلے تیرے فرض سے آزاد ہو جاؤں ورنہ مٹھل بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ تو دھیئے...... میں نے تیرا رشتہ دیکھ لیا ہے اور بات بھی تقریباً پکی کر لی ہے...... اسی چاند کی اٹھارہ تاریخ دینا چاہتا ہوں...... سوچا جہاں اتنے فرائض پورے کیے وہاں آخر میں تجھ سے پوچھنے...... میرا مطلب ہے...... تجھے بتا بھی دوں۔'' سوڈھل نے چند ثانیے توقف کیا اور ساتھ ہی اپنی آنکھیں سکیڑ کر کمینے پن

سے اللہ رکھی کا معصوم چہرہ تکنے لگا کہ کہیں اسے میری بات سے اختلاف تو نہیں ہو رہا...... مگر سردست اسے وہاں ایسے کوئی آثار نظر نہ آئے بجز اس کے کہ اللہ رکھی کا چہرہ ذرا الجھن آمیز انداز میں تمتماتا سا محسوس ہوا۔ جسے حریص سوڈھل نے درخورِ اعتنا نہ گردانتے ہوئے پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''دودا خان نام ہے تیرے ہونے والے مرد کا...... بڑا رئیس اور شوں کار (دولت مند) ہے...... تُو بہت سکھی رہے گی...... ہے بھی اسی گوٹھ کا رہنے والا...... مجھے پورا یقین ہے دھیئے تو آپڑیں مرحوم باپ کی روح کو خوش رکھنے کے واسطے اور میری عزت کا خیال رکھتے ہوئے انکار نہیں کرے گی......'' بالآخر عیار سوڈھل نے فطری جذباتی کمزوری کا پتا پھینکتے ہوئے آخر میں اپنی بات ختم کی اور اللہ رکھی کا وجود جیسے تلپٹ ہو کر رہ گیا...... ایک بھنور تھا جس نے کالے ناگ کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا...... وہ کچھ...... بلکہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی سوڈھل چاچا سے...... لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی...... وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ چاچا تم اپنے فرض کا بوجھ اتار رہے ہو سر سے یا میرا ایک بڈھے کے ساتھ سودا کر رہے ہو...... اس کی خاموشی کو سوڈھل اپنے تئیں رضامندی سمجھتے ہوئے اپنی چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر ''شاباش دھیئے'' کہتا ہوا زبردستی اللہ رکھی کے سر پر ہاتھ پھیر کر فوراً باہر نکل گیا...... اللہ رکھی کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا...... اس نے اپنی گھٹی گھٹی سسکیوں پر بمشکل قابو پا رکھا تھا۔

☆======☆======☆

''تُو اس بڈھے دودے سے اللہ رکھی کی شادی کر تو رہا ہے...... پھر اللہ رکھی کا وہ مکان تو اپنے نام کرا لے......'' یہ اس رات کا ذکر تھا جب دونوں میاں بیوی سوڈھل اور عنایتاں اپنے کچی کوٹھڑی نما کمرے میں آمنے سامنے چارپائیوں پر براجمان تھے...... سوڈھل نے آج شام اللہ رکھی سے ہونے والی اپنی ''بات'' کا ذکر بیوی سے کر دیا اور ساری بات سننے کے بعد عنایتاں نے اس کے مکان کی بات چھیڑ دی تھی جو کب کا خالی پڑا تھا...... شوہر کو خاموش پا کر عنایتاں دوبارہ ذرا پُرزور لہجے میں بولی۔ ''ایسا نہ ہو شادی کے بعد یہ بڈھا دودا خان اس پر قبضہ کر لے۔ میں تو کہتی ہوں وہ مکان ہی بیچ ڈال۔''

''اڑی...... تُو بھی بے وقوف ہے...... تجھے پتہ ہے زمین وڈیرے کی ہے...... مکان بیچنے کا گوٹھ میں کسی کو بھی اختیار نہیں ہے...... ہاں اسے اپنے نام کروا کر کرائے پر ضرور اٹھا سکتے ہیں۔''

''میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں یہ سب کام اللہ رکھی کی شادی سے پہلے پہل نمٹا لے

......اور ہاں...... وہ دونوں بیل؟'' عنایتاں نے جیسے یاد دلایا۔

دونوں میاں بیوی دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے...... سوڈھل نے کہا......

''بیلوں کی فکر ہی نہ کر تو، انہیں میں بیچ دوں گا یا پھر ہل کے لیے اپنے پاس ہی رہنے دوں گا......بس ھک وری پیسہ ہتھ آ جاوے...... پھر دیکھ اپنے مزے......'' عنایتاں خوش آئندہ تصور میں ہولے ہولے سر کو اثباتی جنبش دینے لگی...... باہر زور کا جاڑا اترا ہوا تھا۔

☆======☆======☆

''آ بابا...... آ جا...... ساون میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا خوش ہو جا...... میں نے تیرا کام کر دیا ہے۔'' ساون کو اوطاق کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر منشی میرل فوراً بولا...... سوئے اتفاق وہ اس وقت اکیلا ہی سرکنڈوں کے بنے ایک چوڑے پشتے والے مونڈھے پر رجسٹر سنبھالے براجمان تھا...... ساون خاموشی سے اس کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا...... پھر منشی کو جیسے گھورتے ہوئے بولا۔

''منشی......! میرا کام کر دیا ہے تو...... پیسے میرے حوالے کر کے آ پڑیں رجسٹر پر انگوٹھا لگوا لے میرا۔''

''اڑے بابا...... انگوٹھا بھی لگ جائے گا...... پیسے بھی مل جاویں گے تجھے، گڑتی کس بات کی ہے بابا...... تُو ذرا بیٹھ ابھی بھوتار سائیں آنے والا ہے...... پیسے وہی تیکوں دے گا۔'' منشی میرل اپنے پلاسٹک کے سیاہ موٹے اور بھدے فریم والے چشمے کے عقب سے اپنی چندھی آنکھیں ساون کے چہرے پر جمائے جمائے بولا...... اس کی بات پر ساون کو ذرا اچنبھا سا ہوا اور ایک قریبی چارپائی پر خاموشی سے بیٹھ گیا تاہم اس کا چہرہ عجیب احساس اور جذبے کے تحت تمتما رہا تھا۔ اس دوران منشی میرل نے جانے کب اوطاق کے ایک خدمت گار چاکر کو چائے کی پیالی لانے کے لیے بھیج رکھا تھا جو ذرا ہی دیر بعد ایک چھوٹی سی طشتری میں ساون کے لیے چائے کی پیالی لے آیا۔

''لو بابا ساون چائے پیو...... ابھی بھوتار سائیں آنے والا ہے......'' منشی نے کہا۔

ساون حیران ہوا کہ آخر اس پر اتنی مہربانی کیوں؟ درحقیقت وڈیرے کی اوطاق میں کسی غریب ہاری کو چائے پیش کرنا غیر معمولی التفات میں شمار ہوتا تھا...... جو تقریباً ناممکن تھا۔ بہرطور ساون بے دلی کے ساتھ چائے پینے لگا...... وہ کسی گہری الجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔ عیار منشی میرل کی چشمے کے عقب سے جھانکتی ہوئی چھچھوندر جیسی آنکھیں جانے کیوں مسلسل ساون کے ژولیدہ چہرے کا طواف کر رہی تھیں...... وہ ساون کے کسی اندرونی

انتشار کے کھوج میں تھا...... بہرطور پر چند ثانیے بعد بولا...... ''ساون! تو فکر نہ کر بابا...... میں نے کہا نا تیرا کام سمجھو ہو گیا ہے...... بس وڈیرے سائیں کو آ لینے دے حویلی سے...... اچھا ایک بات تو بتا بھلا...... وہ کون خوش نصیب ہے جس کا رشتہ تُو پچاس ہزار میں لے رہا ہے...... کس کی بیٹی ہے وہ...... دیکھ برا مت منانا میں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں...... دعا ہی دوں گا تم بالکوں کو...... آخر میں بھی تمہارے بڑوں جیسا ہوں۔''

منشی میرل کی بات پر ساون ذرا چونکا...... لیکن پھر مبہم سے لہجے میں بولا۔ ''ابھی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں اچھی طرح کہ آیا پچاس ہزار روپے میں بھی میرا کام ہوتا ہے...... یا...... خیر چھوڑ منشی...... میرا کام ہو جائے...... تجھے خود ہی پتہ لگ جائے گا......'' ساون نے جیسے بات کو یہیں دفن کرنے کی غرض سے کہا...... پھر منشی بھی کسی خیال کے تحت چپ ہو رہا۔

تھوڑی دیر بعد وڈیرا میر لکھمیر خان بھی اپنے چند مصاحب خاص کے ہمراہ اندر داخل ہوا...... ''سلام سائیں......!'' ساون نے وڈیرے کو دیکھتے ہی چارپائی سے اٹھ کر سلام کیا...... وڈیرے نے اپنے سر کے خفیف اشارے سے سلام کا جواب دیا...... منشی میرل بھی رجسٹر بغل میں دبائے اٹھ کھڑا ہوا تھا...... وڈیرا، ساون کو عجیب نگاہوں سے گھورتا ہوا ایک مونڈھے پر براجمان ہو گیا۔

''ہاں بابا...... میرل...... کیا کہتا ہے یہ چھورا۔'' وڈیرے نے استفسار طلب لہجے میں منشی سے پوچھا۔

''سائیں بھوتار کی خیر ہووے...... چھوکرے کو روپے چاہئیں......'' منشی خوش آمدانہ لہجے میں بولا۔

''ہاں بابا ٹھیک ہے...... دے دوا سے...... پھر قرضے کی شرائط اور سود وغیرہ سے اسے آگاہ کر دیا ہے تو نے......'' وڈیرے نے گمبھیر لہجے میں پوچھا...... ساتھ ہی اس نے کھڑے ہوئے ساون کو ہاتھ کے اشارے سے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا...... پھر ساون کے بیٹھتے ہی منشی حسب عادت جلدی سے رجسٹر کھول کر پڑھنے لگا، پھر مستعدی سے بولا۔

''سائیں بھوتار...... ابھی بتاتا ہوں۔'' اس کے بعد وہ ساون سے مخاطب ہوا۔

''ساون...... تجھے پچاس ہزار قرض چاہئے یا دستی......'' ساون منشی کی بات پر ذرا گڑبڑایا مگر پھر اسے ایک روایتی پوچھ تاچھ پر محمول کرتے ہوئے جواباً مختصراً بولا۔ ''قرض!''

''کتنے دنوں کے لیے...... ہا۔'' منشی نے چشمے کے پیچھے سے ساون کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا......

اس کی اس بات پر ساون ذرا خاموش ہوگیا...... اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دے...... کیونکہ اس سے پہلے اس نے پچاس ہزار تو کیا پچاس روپے تک قرض نہیں لئے تھے اور دوسرے وہ قرضہ بھی اپنے باپ کو بتائے بغیر لے رہا تھا۔

''اڑے بابا چھوکرا...... سوچتا کیا ہے...... کتنے دنوں کے لیے تجھے چاہیے پچاس ہزار...... چھ مہینے کے لیے...... سال کے لیے...... دوسال کے لیے......؟'' اس بار وڈیرے لکھ میر خان نے ساون سے کھرکھراتے لہجے میں پوچھا...... تاہم اس کی گھورتی ہوئی عقابی نگاہیں ہنوز ساون کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''سس...... سائیں وڈا...... ایک سال کے لیے......'' ساون کے منہ سے نکلا۔

''دیکھ لے بابا...... سوچ کر ایک ہی بار قرضے کی واپسی مدت بتا، کیونکہ اس پر تجھے ویاج (سود) بھی دینا ہوگا...... دیر کرے گا تو ویاج کی رقم بڑھتی جائے گی......'' وڈیرے لکھ میر خان نے اب ساون کو خود ہی قرضے وغیرہ کی تفصیل بتانی شروع کردی تھی...... جبکہ منشی اپنا کام وڈیرے کو کرتا دیکھ کر چپ کھڑا تھا۔

''سائیں وڈا...... درحقیقت بات کیا ہے کہ...... میں نے پہلے کبھی قرضہ لیا نہیں ہے...... اسی لیے ذرا......'' ساون مرتعش سے لہجے میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تو وڈیرے کے جہاندیدہ چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ کھنڈ آئی وہ بولا۔

''اڑے بابا...... اس میں کیا مشکل ہے...... پورا گوٹھ قرض لیتا ہے...... دیتا ہے...... خود تیرے پیو موگو نے پندرہ ہزار روپے لے رکھا ہے...... اچھا سن...... قرضہ جتنی کم مدت کا ہوگا جتنی بڑی قسط کا ہوگا اتنا ویاج کم لگے گا...... سمجھا...... اب بتا۔'' وڈیرا خاموش ہوا تو ایک بار پھر ساون کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ اسے جانے کیوں انجانے اندیشوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، لیکن پھر اللہ رکھی کا معصوم چہرہ آنکھوں میں گھوم جاتا تو اسے پھر اپنے سارے خدشات اور اندیشے بے معنی نظر آنے لگتے۔

''اچھا بابا...... پھر مجھے ہی بتانا پڑے گا...... سن......'' بالآخر وڈیرے لکھ میر خان نے کہا۔ ''دیکھو ساون...... ایسا کرو پورے سال کے لیے ہی قرضہ لے لو...... اور بجائے ہر مہینے قسطوں میں اتارنے کے سال بعد یکمشت ادا کر دینا...... اور اوپر پندرہ ہزار ویاج دے دینا پینسٹھ ہزار...... کیا سمجھے......؟'' ساون کو اس وقت اللہ رکھی کو حاصل کرنے کی دھن سوار تھی لہٰذا اس نے فوراً ہامی بھرتے ہوئے رجسٹر پر اپنا نام لکھ دیا اور انگوٹھا بھی منشی میرل نے لگوا دیا...... آخر میں جاتے جاتے...... ساون نے وڈیرے سے قدرے لجاجت

سے کہا۔

''سائیں! ایک عرض ہے میرے پیو کو اس کی خبر نہ ہووے۔''

''ہالا بابا ہالا۔ جاب تو......''

''اڑے میرل!'' ساون کے اوطاق سے نکلتے ہی وڈیرے نے منشی کو مخاطب کیا۔

''حاضر سائیں وڈا......!'' وہ مستعدی سے بولا۔

''اڑے بابا اس چھوکرے نے کچھ بتایا کہ کون سی حور کو پچاس ہزار میں بیاہ کر لا رہا ہے؟'' وڈیرے نے معنی خیز لہجے میں استفسار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں سائیں! ابھی تو کچھ نہیں بتایا ہے...... بڑا پکا ہے......'' منشی نے آنکھیں بھینچتے ہوئے پُر خیال لہجے میں جواب دیا...... وڈیرے میر لکھ میر خان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی تھی......

☆======☆======☆

پچاس ہزار قرض لینے کے بعد ساون کو فوری طور پر دو مسئلوں نے گھیر لیا...... پہلا تو اتنے بہت سارے روپوں کی حفاظت کا مسئلہ درپیش تھا دوسرے اللہ رکھی کے رشتے کے سلسلے میں اس کے چاچا سوڈھل سے کس ذریعے سے بات کی جائے......؟ اسی دوران ساون کو اچانک ایک اور بات کا بھی خیال آیا کہ اللہ رکھی کو حاصل کرنے کے لیے دودا خان نے بھی سوڈھل کو پچاس ہزار روپے ہی دینے کا وعدہ کیا ہے...... پھر سوڈھل اس کے پچاس ہزار کو بھلا کہاں خاطر میں لائے گا...... یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ وہ دس پندرہ ہزار روپے اوپر کر کے سوڈھل کو پیش کرے تو اس کے حق میں بات بن سکتی ہے...... لیکن ساتھ ہی اسے ایک اور بات کا بھی یکبارگی خیال آیا کہ اگر وہ یکمشت سوڈھل کو اتنے روپوں کی جھلک دکھا دے تو ہوسکتا ہے لالچی سوڈھل یک دم اتنے بہت سے روپوں کو سامنے دیکھ کر اپنا فیصلہ اس کے حق میں بدل دے۔ لہٰذا یہ سوچ کر ساون نے فوری اور خود ہی سوڈھل سے ملاقات کر کے بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔

☆======☆======☆

باہر ٹھٹھرتی شام نے اپنے گیسو دراز کرنے شروع کر دیئے تھے...... ایک کچی کوٹھڑی کی پیشانی پر لگے بلب کی مدہم اور پیلی روشنی نے صحن میں ایک ناگوار سا ناکافی اجالا کر رکھا تھا۔ ایک کونے میں پھونس کے چھپر تلے ''ہیرے اور سانولے'' کو سردی سے بچانے کی غرض سے اللہ رکھی بطور ''لحاف'' ان پر خالی بوریاں ڈال رہی تھی وہ دونوں بیل اللہ رکھی کو

اپنی کالی اور ابھری ہوئی معصوم نظروں سے گھورتے ہوئے جگالی میں مصروف تھے۔ صحن میں سگ داسی چاولوں کی خوشگوار مہک پھیلی ہوئی تھی جو اللہ رکھی نے کچھ دیر پہلے ہی دم پر رکھے تھے۔ چاچا سوڈھل اور عنایتاں دونوں اپنی کوٹھڑی میں موجود تھے...... معاً دروازے کی کنڈی کھٹکی...... اللہ رکھی ذرا چونکی۔

''اڑی ذرا دیکھ اللہ رکھی کون ہے در پر......'' اندر سے چاچی عنایتاں کی چلاتی ہوئی آواز بلند ہوئی اور اللہ رکھی باآواز بلند ''اچھا چاچی'' کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''کیرآ......؟'' (کون ہے) دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پوچھا۔

''سوڈھل چاچا سے ملنا ہے۔'' جواباً باہر سے آواز ابھری اور اللہ رکھی دھک سے رہ گئی...... وہ ساون کی آواز کو پہچان چکی تھی ایک لمحے کو ہکا بکا کھڑی رہ گئی...... پھر اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا...... سامنے پرانی اونی چادر اوڑھے ساون موجود تھا۔

''سس...... ساون تم!'' اللہ رکھی کے منہ سے نکلا۔

''چاچا ہے تیرا اندر......'' ساون نے چوکھٹ سے اندر آتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... اندر کوٹھڑی میں...... پر تُو۔'' اللہ رکھی کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تُو کیوں گڑتی کر رہی ہے۔ روپے لایا ہوں...... پورے پچاس ہزار، میں خود تیرا رشتہ لوں گا...... اندر آنے دے مجھے راستے سے ہٹ......'' ساون یہ کہتا ہوا اندر آ گیا۔

''کون ہے اللہ رکھی؟ کس سے باتیں کر رہی ہے تُو......'' اندر سے سوڈھل کی آواز سنائی دی۔

اللہ رکھی عجیب پریشان اور حیران کن صورت حال سے دوچار تھی۔ سوڈھل کو جواب دینے کے لیے اس کے لب محض ہولے سے کپکپا کر رہ گئے...... ساون اس دوران صحن میں آ چکا تھا اور خود ہی اندر کوٹھڑی کی طرف اپنا رخ کرتے ہوئے سوڈھل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''چاچا سوڈھل...... سلام کہتا ہوں...... میں ہوں ساون......! موگو ہاری کا بیٹا۔''

اسی لمحے ساون کو اندر سے چارپائی کے اس زور سے چرچرانے کی آواز سنائی دی...... جیسے کوئی جلدی میں ایک جھٹکے سے چارپائی سے اٹھا ہو...... اس کے عقب میں اللہ رکھی پریشان چہرہ لئے کھڑی تھی......

''اڑے چھوکرا...... کیا حال ہے ڑے تیرا...... اچھا چل ساتھ والی اوطاق میں بیٹھ جا کر، میں ابھی آتا ہوں''۔ سوڈھل ساتھ والی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

ساون بے دھڑک دوسری کوٹھڑی میں داخل ہو کر اندر ایک طرف رلی بچھی چارپائی پر براجمان ہو گیا...... اس کے بیٹھنے کی دیر تھی کہ چاچا سوڈھل بھی اندر آ گیا اور چارپائی کے عین سامنے پرانے سے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

''ہاں بابا اور سنا...... گھر والے تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا...... تیرے...... موگو کیسا ہے؟...... آتا ہی نہیں ہے...... عرصہ ہوا تاش کی بازی لگائے۔''

''ہاں چاچا بس ابا کچھ بیمار رہنے لگا ہے...... اسی لئے۔'' ساون نے مختصر جواب دیا اور سوڈھل کی طرف دیکھا جو بغور اس کے چہرے کی طرف اپنی نظریں جمائے ہوئے تھا...... ساون کی بات پر اس نے یونہی دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ پھر بولا۔

''اچھا یہ بتا...... کیا پیئے گا...... سردی بہت ہے آج...... میرا خیال ہے چائے ٹھیک رہے گی......''

''نہیں چاچا اس کی فکر نہ کر۔'' ساون بولا۔

''اڑے فکر کی کیا بات ہے...... آپڑاں بچہ ہے تُو...... اچھا خیر تو ہے نا...... کیسے آیا ہے۔'' سوڈھل بالآخر چائے وغیرہ کی بات ٹلتی دیکھ کر بولا...... تو ساون کے چہرے پر جھجھک آمیز خاموشی طاری رہی چند ثانیے...... پھر وہ سوڈھل کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''چاچا ایک ضروری بات کرنے آیا تھا تجھ سے...... پتہ نہیں تجھے کیسا لگے۔ یوں تو آنا میرے ماں پیو کو چاہئے تھا...... پر۔''

ساون کہتے کہتے رک گیا اور سوڈھل کی جہاندیدہ نگاہوں نے فوراً ساون کے چہرے کا ارتعاش اور اس کے جملوں کا پس منظر کھوجنا شروع کر دیا...... پھر وہ ساون کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولا...... ''ہاں ہاں بول...... میں نے کہا نا...... آپڑاں بچہ ہے تُو...... بول کیا کہنا ہے۔'' اس کی بات پر بالآخر ساون بولا۔

''چاچا...... دیکھ تجھے اگر میری بات اچھی نہ لگے تو بھلے میرے سر پر جوتا مار دینا پر مجھ سے ناراض نہ ہونا...... میں پھر کہتا ہوں کہ میری کوئی مجبوری ہے جو میں ماں باپ کو نہیں لا سکا ساتھ......''

''اڑے بابا...... بول تو سہی تُو...... کیا بات ہے میری گود میں کھیلا ہے تُو...... تو کوئی بات کر یا نہ کر تجھے میں پھر بھی جوتا مار سکتا ہوں...... اتنا میرا حق قائم ہے اب بھی گوٹھ کے سارے لونڈے لپاڑوں پر...... لیکن موگو تو میڈا بھائی ہے اور تُو بھی میڈے بچوں جیسا

ہے...... چل اب بول دے...... سن رہا ہوں میں......'' سوڈھل فنکارانہ شفقت سے بولا۔

پھر چند ثانیے توقف کرتے ہوئے ساون نے اپنی قمیض کی اندرونی کمری کی بڑی سی جیب میں سے پچاس ہزار کی رقم نکال کر اٹھتے ہوئے سوڈھل کے قدموں پر رکھ دی ہے اور جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں بجائے التجا کے گہری متانت تھی...... ''چاچا مجھے اپنے لئے اللہ رکھی کا سنگ چاہیے۔''

سوڈھل کیا جواب دیتا...... اتنے سارے نوٹوں کو اپنے قدموں میں دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں...... ساون نے اس سے کیا کہا تھا...... اگرچہ سوڈھل سن رہا تھا مگر اس کی نظروں کی سوئی روپوں پر اٹک کر رہ گئی تھی۔

''کک...... کتنے ہیں یہ......'' سوڈھل نے حریصانہ لہجے میں سرگوشی کی۔ ساون کو ذرا حوصلہ ہوا لہٰذا وہ بے دھڑک بولا۔

''پورے پچاس ہزار ہیں...... چاچا......'' ساون کی بھی آواز دھیمی تھی۔

''مگر دودا خان......؟'' سوڈھل نے تھوک نگلتے ہوئے کہنا چاہا۔

وہ فوراً مطلب کی بات پر آ گیا تھا۔

''چاچا تو اُس کی گڑتی نہ کر...... میں اس سے نمٹ لوں گا......'' ساون نے تمتماتے ہوئے لہجے میں کہا...... اس کی آنکھوں میں درشتی اتر آئی تھی کوٹھڑی میں چند لمحے کے لیے سکوت چھا گیا...... سوڈھل کے تنفس کی ڈور ایک دم اتنے نوٹوں کو دیکھ کر بے ترتیب ہوئی جا رہی تھی جبکہ ساون کا دل اس فیصلہ کن گھڑی کو جلد از جلد اپنے حق میں کرنے کی خاطر بے طرح دھڑک رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوڈھل کو اپنے بے ترتیب سانسوں کی بازگشت اور ساون کو اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کی گونج صاف سنائی دے رہی تھی۔

پھر چند ثانیے بعد جیسے سوڈھل اپنی سنسنی خیز کیفیت پر قابو پاتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں بولا...... ''سوچ لے ساون...... دودا خان ذرا ٹیڑھا آدمی ہے...... بے شک وہ بڈھا نظر آتا ہے۔ مگر کاٹھ کا پکا ہے...... اگر اس نے اپنی غیرت کا مسئلہ بنا لیا تو۔''

''بس چاچا سوڈھل۔'' ساون اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے قطعیت سے بولا۔ ''مجھے اب آخری بار ہاں یا ناں میں جواب دے......'' یہ کہتے ہوئے ساون نے اٹھ کر سوڈھل کے پیروں تلے بکھرے نوٹ سمیٹنے چاہے تو حریص سوڈھل نے فوراً ساون کا شانہ تھام لیا...... ساون ذرا رکا...... پھر سوڈھل ساون سے بولا...... ''اڑے بابا! بات تو سن...... اتنی گرمی کی کیا ضرورت ہے...... چائے پی...... سوچتے ہیں تیرے لئے بھی کچھ......''

ساون قدرے مطمئن ہو کر دوبارہ چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ سوڈھل نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنے پیروں پہ رکھے نوٹ اٹھائے اور دوبارہ مونڈھے پر براجمان ہو گیا پھر نوٹ اپنی گود میں ڈال لیے۔

''چائے تو پیئے گا نا تو......'' سوڈھل نے یکبارگی پوچھا۔

''نہیں چاچا بس تُو مجھے جواب دے دے یہی تیری مہربانی ہے...... کیا کہتا ہے پھر تُو......'' ساون نے کہا۔

بلب کی کمزور زرد روشنی میں ساون نے بغور سوڈھل کا چہرہ دیکھا تو وہاں اسے ایک عجیب سا تغیر نظر آیا...... جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکا...... سوڈھل نے ایک طویل سانس حلق سے خارج کی اور بولا۔ ''ساون! تیری بات مان لوں تو ظاہر ہے دودے سے مجھے بھی مخالفت مول لینی پڑے گی...... پھر خیر میں اسے دیکھ لوں گا، لیکن ساون! دودا خان بھی سنگ کے پچاس ہزار دے رہا ہے۔ تیری بھی اتنی ہی رقم ہے۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ مجھے دونوں طرف سے برابر ہی رقم مل رہی ہے...... پھر بھلا میں کیوں اس جنجال میں پڑوں...... میرا خیال ہے تُو میری بات سمجھ رہا ہے۔'' سوڈھل نے آخر میں ساون کو عیارانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مکاری سے کہا تو ساون اس کی بات سمجھ گیا تاہم وہ مدافعانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''تیری بات برابر چاچا سوڈھل!...... پر تُو یہ بھی تو دیکھ کہ میں نے یکمشت پورے پچاس ہزار تیرے قدموں میں ڈال دیئے ہیں جبکہ مجھے یقین ہے کہ دودے نے ابھی تجھے کچھ بھی نہیں دیا ہوگا۔'' ساون اتنا کہہ کر رکا...... سوڈھل نے دانستہ مکارانہ چپ اختیار کر رکھی تھی اور ساون اسے اپنی بات کی اثر پذیری پر محمول کرتے ہوئے مزید پُرزور لہجے میں بولا...... ''دیکھ نا چاچا! حق تو میرا ہی بنتا ہے نا پہلے رشتہ لینے کا......''

''اچھا ٹھیک ہے پھر...... تو بھلے روپے اپنے سارے لے جا...... میں جب تجھے تاریخ دینے آؤں گا تو...... پیسے لے لوں گا......'' حریص سوڈھل نے چال بازی سے کہا...... جس پر حسب توقع ساون فوراً بولا۔

''نہیں چاچا...... یہ کیسی بات کرتا ہے تُو...... تیری زبان پر مجھے بھروسہ ہے...... یہ پیسے رکھ لے تو بے شک...... میں تیرا انتظار کروں گا...... میں پھر...... تیری ہاں اپنے حق میں سمجھوں نا۔''

ساون نے اٹھتے ہوئے آخر میں گویا اپنی تسلی چاہی...... تو سوڈھل بھی اپنی گود میں رکھے

روپوں کا ڈھیر سمیٹتے ہوئے بولا...... ''اس میں کوئی شک ہے کیا...... حق تیرا ہی بنتا ہے...... ویسے تو مجھے ذرا ایک بات بتا تیرے ماں باپ تو خوش ہیں ناں مجھ سے سنگ لینے پر......''

اس پر ساون کے چہرے پر ذرا الجھن آمیز خاموشی سی چھا گئی...... بہرطور چند ثانیے بعد بولا...... ''چاچا...... وہ سب راضی ہیں...... بات دراصل یہ ہے کہ میں نے یہ رقم بہ طور قرض لی ہے سود پر...... منشی میرل منگن ہار سے...... میرا پیو اس بات پر راضی نہ تھا...... لہٰذا ابھی میں نے اسے یہ بات نہیں بتائی ہے کہ......''

''اچھا...... اچھا میں سمجھ گیا'' چاچا سوڈھل اس کی بات کاٹ کر اور بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے بولا...... ''چلو بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا...... پرسن...... تو مجھ سے کل یاد سے...... کادو جکھرانی کے ہوٹل پر ملنا......''

''کیوں چاچا خیر تو ہے نا'' ساون نے پوچھا۔

''تو وہاں آنا تو سہی...... تجھے بتاؤں گا وہیں پر...... ابھی تجھے بھی دیر ہو رہی ہو گی۔''

سوڈھل چالاکی سے ساون کو اپنے گھر سے رخصت کرنے کی غرض سے بولا اور ساون اپنے تئیں مطمئن ہونے کے باوجود متذبذب سا وہاں سے نکل آیا۔

☆======☆======☆

ساون جب سوڈھل کے گھر سے روانہ ہوا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اگرچہ سردی میں اتنی کاٹ نہیں تھی تاہم وہ قدرے تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی جانب چلا جا رہا تھا...... تاروں سے بھرا آسمان بالکل صاف تھا...... جن کی مدہم روشنی میں ساون کو کوئی مشکل درپیش نہیں آ رہی تھی...... ساون یوں تو سوڈھل کے گھر سے مطمئن ہو کر نکلا تھا لیکن جانے کیوں اس کے دل میں ایک عجیب اور بے نام سی ''کھٹک'' بار بار سر ابھار رہی تھی...... اسے اب رہ رہ کر اس بات کا قلق ہو رہا تھا کہ اسے ابھی یک دم اتنی بڑی رقم اور وہ بھی ساری کی ساری سوڈھل کو دینی نہیں چاہیے تھی...... بے شک سوڈھل ایک جانا پہچانا شخص تھا...... لیکن بہرطور وہ فرشتہ نہیں تھا...... مگر ساون نے اپنے اس خام خیال کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ...... یہ سب ضروری تھا...... سوڈھل کا اعتماد بحال کرنے کے لیے اور فیصلہ اپنے حق میں کرانے کے لیے...... جس پر اسے خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی تھی...... ورنہ دودا خان نے سوڈھل سے اللہ رکھی کا سنگ لینے کے لیے پچاس ہزار ہی معاوضہ مقرر کیا تھا یہ الگ بات تھی کہ ساون نے یکمشت اکٹھے ہی روپے سوڈھل کے آگے رکھ دیئے تھے...... لہٰذا اس نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا اور موجودہ حالات کی نازک روش کو دیکھتے ہوئے بالکل درست کیا تھا

...... درحقیقت وہ اپنی شوخ وچنچل اور منہ پھٹ چچا زاد سورٹھ کی اس بات سے بھی اچانک پریشان ہو گیا تھا کہ اس کا چاچا چاچی بھی عنقریب اپنے بیٹے گل محمد کے لیے اس کی بہن ہدایتاں کا رشتہ لینے کے لیے اس کے ہاں آنا چاہتے تھے...... اور پھر بہ طور وٹہ ساون کے ماں باپ نے بھی اپنے بیٹے کے لیے ان کی بیٹی سورٹھ کا رشتہ مانگنا تھا جس پر دونوں خاندان کی رضامندی کسی بھی قسم کے شکوک وشبہات سے بالاتر تھی لہٰذا اس خبر نے ساون کو اللہ رکھی کے فوری حصول کے لیے متحرک کر دیا تھا اور وہ بغیر سوچے سمجھے وڈیرے کے منشی سے بھاری قرض سود پر لے کر سوڈھل کے ہاں جا پہنچا تھا اور اسی تیزی میں وہ ساری رقم بھی اس کے حوالے کر آیا تھا...... سوڈھل کے گھر سے روانہ ہوتے وقت اس نے ساون کو اگلے دن کادو جکھرانی کے ہوٹل پر ملنے کی تاکید نے بھی مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ بہرطور انہی خیالات کی یلغار میں وہ اپنے گھر کی شکستہ گلی میں داخل ہو گیا۔

☆======☆======☆

دوداخان کی جب سے ساون سے مڈبھیڑ ہوئی تھی وہ مسلسل غصے سے پھنک رہا تھا حالانکہ اس سے قبل وہ ذرا بھی اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا لیکن اب وہ ساون کو اللہ رکھی کے حصول کے سلسلے میں اپنے لئے ایک بڑی رکاوٹ تصور کرنے لگا تھا۔ تاہم اسے اس حد تک تسلی ضرور تھی کہ وہ چاچا سوڈھل کو دس ہزار روپے کیش دے چکا تھا اب چاہے ساون کہیں سے بھی روپے پیسے کا بندوبست کرے بالفرض محال کر بھی لیتا ہے تو تب بھی سوڈھل جیسا جہاندیدہ شخص ایسی بچکانہ حرکت نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی بھتیجی اللہ رکھی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے...... مگر دوداخان کو جانے کیوں یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ اللہ رکھی کا جھکاؤ زیادہ تر ساون ہی کی طرف تھا۔ وہ اس وقت اپنے چھپر ہوٹل کے دخل پر موجود مٹھی میں بیڑی دبائے سوچتے ہوئے گہرے گہرے کش لے رہا تھا...... ابھی طائرشام نے اپنے سرمئی پنکھ نہیں پھیلائے تھے...... اسے سوڈھل پر بھی غصہ آرہا تھا جس نے دس ہزار بہ طور ''بیعانہ'' لے کر بھی ہنوز اسے آسرے پر رکھا ہوا تھا اور ابھی تک تاریخ دینے اس کے ہاں نہیں آیا تھا حالانکہ اس نے کہا تھا کہ وہ خود اس کے پاس آئے گا شادی کی تاریخ بتانے...... لہٰذا اس نے آج ہی سوڈھل سے ملاقات کرنے کا قصد کیا...... مگر اسے اپنے بیٹے محرم علی کا انتظار تھا۔ کیونکہ وہ دخل خالی چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا...... ہوٹل میں حسبِ معمول لوگ باگ لکڑی کی بینچوں پر بیٹھے چائے نوشی کرنے کے علاوہ باہم بات چیت میں مشغول تھے۔ مائی بھاگی کی آواز میں ریکارڈ بج رہا تھا...... اسی وقت دوداخان ایک شخص کو ہوٹل کے احاطے میں آتے دیکھ کر چونک پڑا...... مذکورہ شخص چاچا سوڈھل تھا...... وہ ایک پرانی سی چادر اوڑھے اس کی طرف آرہا تھا...... جانے کیوں سوڈھل کو دیکھ کر دوداخان کا اضطراب آمیز غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''بسم اللہ...... بابا سوڈھل سائیں! آؤ آؤ؟ بیٹھو، کیسے ہو؟'' اس کے قریب آتے ہی دوداخان خوشدلی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے بولا اور اٹھ کر ایک بھرپور معانقے اور

مصافحے کے بعد اپنے قریب ہی بچھے اسٹول پر اسے بٹھا دیا اور سوڈھل جواباً رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد خاموش ہو رہا۔ ''اڑے بابا چھورا!'' دوداخان نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے ایک پیش کار لڑکے کو آواز دی...... ''بابا کڑک چائے لاؤ جلدی۔'' پھر وہ سوڈھل کی جانب متوجہ ہوا...... ''ہاں بابا سوڈھل اور سناؤ کیا حال ہے...... میں آج سوچ ہی رہا تھا کہ تیرے پاس ایک چکر لگا آؤں...... پر اچھا کیا تُو آ گیا خود ہی...... کیا خدمت کروں تیری۔''

سوڈھل گومگو چہرہ لئے خاموش رہا۔ اس کے لمبوترے چہرے کی سلوٹیں آپ ہی آپ گہری ہوتی چلی گئیں، تب دوداخان نے آنکھیں سکیڑیں...... وہ جواب کے انتظار میں اس کی جانب تکے جا رہا تھا...... ''سوڈھل! اڑے یار خیریت تو ہے...... کچھ بات کر...... کیا ہوا بابا......؟'' بالآخر دوداخان اسے مخاطب کرتے ہوئے دوبارہ بولا۔

''دوداخان! تُو تو جانتا ہے میں اگر کسی کو ایک بار زبان دے دوں تو اس سے پھر ہٹتا نہیں...... تُو نے مجھ سے اللہ رکھی کا اپنے لیے سنگ مانگا میں نے انکار نہیں کیا اور کچھ پیسے بھی تُو نے بہ طور خرچہ مجھے دیئے...... میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں...... لیکن......'' ایک گہرے تشویشناک انداز میں سوڈھل اپنی ہی بات کاٹ کر چپ ہوا تو دوداخان یک دم کھٹک گیا۔ وہ اس کے متفکر چہرے کی جانب بغور گھورتے ہوئے مخاطب ہوا۔

''سوڈھل! بابا سیدھی بات کر کیا ہوا ہے۔ کیا مسئلہ ہے آخر......''

عیار سوڈھل دوداخان کے کھردرے لہجے سے ایک لمحے کو بدک سا گیا پھر اپنے چہرے پر مکارانہ بے چارگی طاری کرتے ہوئے بولا...... ''دودا سائیں...... تجھے تو پتہ ہے کہ میری کوئی اولاد نہیں...... ہم بوڑھے زندگی کی گاڑی جیسے تیسے اکیلے گزار رہے ہیں...... اور میرے جیسے بڈھے کے گھر کے کچے آنگن میں اگر جوان بیری لگ جائے تو پتھروں کو روکنے کی بھلا ہم کہاں طاقت رکھتے ہیں۔''

''ہاں تو بابا! بتاؤ نا...... کون پتھر مار رہا ہے...... نام بول اس کا۔'' سوڈھل کی بات پر دوداخان بولا اس بار اس کا لہجہ ذرا دھیما تھا۔

''ساون نام ہے اس پتھر مار چھوکرے کا۔'' سوڈھل بلا تکلف بولا۔ ''بہت تنگ کرنے لگا ہے مجھے وہ...... کل تو مجھے وہ باقاعدہ دھمکی دینے آیا تھا کہ اگر میں نے اللہ رکھی کا ہاتھ دوداخان کو دیا تو...... اب تو خود بتا میں بڈھا آدمی اس چھوکرے کو کب تک سہتا رہا ہوں گا؟'' سوڈھل اتنا بتا کر خاموش ہو گیا تاہم اس نے کن انکھیوں سے دوداخان کے کھلتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں اسے حسب توقع ایک جوالہ مکھی سا نظر آیا اور یہی وہ

چاہتا تھا کہ کسی طرح ان دونوں یعنی دودا خان اور ساون کو آپس میں لڑا دے اور جس میں یقینی فتح دودا خان ہی کی اسے نظر آ رہی تھی۔

سوڈھل کا منصوبہ ساز ذہن بڑے تباہ کن اثرات لئے ہوئے تھا۔ لہٰذا جب اس نے دودا خان کو اندر ہی اندر غصے سے بل کھاتے ہوئے دیکھا تو بڑی مکاری سے بولا...... ''دودا خان، دیکھ خود کو سنبھال...... وہ کل کا چھوکرا ہے...... مجھے یقین ہے تیرے آگے وہ ذرا نہیں ٹھہر سکتا...... اس لئے کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھانا کہ بعد میں تو خدانخواستہ کسی مصیبت میں پھنس جائے کیونکہ بعض مرتبہ سکے کے ساتھ ساوک بھی جل جایا کرتا ہے۔''

''میں اپنا کام خود بہتر طریقے سے کرنا جانتا ہوں سوڈھل!'' دودا خان گمبھیر لہجے میں بولا...... ''تُو اپنا کام کر...... اور مجھے تاریخ بتا...... میں کس دن جنج (بارات) لے کر آؤں تمہارے پاس...... ساون سے میں نمٹ لوں گا بعد میں اچھی طرح......''

''وہ تو ٹھیک ہے سنگت سائیں!...... پر اس چھوکرے ساون کا میں کیا کروں......؟''

''اڑے بابا کہا نا میں نے نمٹ لوں گا اس سے۔'' دودا خان درشتگی سے بولا۔ ''تُو مجھے تاریخ بتا کب آؤں میں۔''

اس کی بات سن کر سوڈھل نے ایک اور پینترا بدلا اور بولا...... ''تاریخ تو میں نے تجھے اسی چاند کی اٹھارہ ہی دینی تھی...... پر تیری بھاجائی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے...... جوڑوں کے درد نے بالکل ہی ادھ موا کر دیا ہے بے چاری کو......''

''اسے دکھاتا کیوں نہیں ہے...... اپنے حکیم بڈھل کو...... کہے تو میں اسے کہہ دوں...... وہ دیکھ لے گا اچھی طرح بھاجائی کو...... اور دوائی بھی اچھی بنا کر دے گا۔'' دودا خان نے تجویز پیش کی۔

''ہاں...... لے کر گیا تھا اس کے پاس بھی میں...... مگر عارضی افاقہ ہوا تھا......'' سوڈھل نے بتایا...... ''اب کے کہہ رہا تھا کہ بیل گاڑی میں ڈال کر شہر کے بڑے سرکاری ہسپتال لے جاؤ...... کہتا تھا کہ اس موذی درد نے اب دل پر حملہ کرنا شروع کر دیا ہے...... جس میں جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔''

چالاک سوڈھل کی بات پر دودا خان کے چہرے پر الجھن سی نمودار ہو گئی۔ سوڈھل ترچھی اور مکارانہ نظروں سے برابر اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''اڑے بابا! تو لے جا بھاجائی کو شہر...... دیر کس بات کی ہے پھر......'' دودا خان

بولا...... اس کے لہجے میں اب ایکا ایکی بیزاری عود کر آئی تھی جبکہ سوڈھل اس کے منہ سے متوقع جواب سن کر ایک اور پتہ پھینکتے ہوئے بولا۔

''یہی تو مسئلہ ہے سارا...... شہر جاؤ تو کم سے کم دس بیس ہزار ہونے چاہئیں۔''

''اتنے سارے روپے......! سرکاری ہسپتال میں تو اتنے روپے نہیں لگتے یار سوڈھل......'' دودا خان حیرت سے بولا۔

''اسی لئے تو دس بیس ہزار کہے ہیں...... ورنہ تو پورے پچاس ہزار کا خرچہ ہے۔ حکیم بڈھل بتا رہا تھا کہ اس بیماری کے علاج میں استعمال ہونے والی دوائیاں بہت مہنگی ملتی ہیں...... اور تجھے تو پتہ ہی ہو گا دودا خان کہ سرکاری ہسپتال سے تو دوائیاں ملتی نہیں...... خود ہی خریدنی پڑیں گی...... میڈیکل سٹور سے...... پھر پتہ نہیں کتنے دن وہاں رہنا پڑے۔ پردیس میں سو مسئلے ہوتے ہیں جان کو......''

''اچھا بابا...... لے جا شہر بھاجائی کو...... جتنا بھی پیسہ لگے...... علاج تو کروانا ہے نا آخر...... پر تاریخ تو دے دے مجھے......'' دودا خان نے کہا۔

اس کی بات سن کر سوڈھل بولا...... ''تاریخ کی تُو فکر نہ کر دودا خان وہ میں تجھے شہر سے لوٹتے ہی دے دوں گا اور نزدیک ہی کی دوں گا......''

''کیا مطلب!...... یعنی تُو شہر سے آئے گا تو مجھے تاریخ دے گا......!'' دودا خان جھنجھلاہٹ آمیز حیرت سے بولا...... اور سوڈھل جواباً چپ رہا...... ''اچھا بابا پھر لے جا بھاجائی کو شہر کے ہسپتال...... دیر کیوں کر رہا ہے......'' دودا خان نے دوبارہ کہا تو سوڈھل مکارانہ بے چارگی سے بولا۔

''دودا سائیں! پیسے کا مسئلہ ہو رہا ہے...... اگر کہیں سے بندوبست ہو جائے تو میں صبح تڑکے بیل گاڑی میں بیوی کو ڈال کر روانہ ہو جاؤں شہر۔''

''ہوں......'' دودا خان نے ہنکاری بھری پھر پوچھا۔ ''کتنے چاہئیں؟''

''ظاہر ہے دودا سائیں بیس پچیس تو ہوں پاس......'' حریص سوڈھل یک دم بولا۔

''اتنے تو میں تجھے ابھی نہیں دے سکتا سوڈھل۔''

دودا خان انکاری لہجے میں بولا...... تو سوڈھل کو اس کی بات قدرے ناگوار لگی مگر وہ بھی ایک کائیاں تھا مکاری سے بولا...... ''دودا خان تُو نے اللہ رکھی کے سنگ کے لئے تو مجھے ویسے بھی چالیس دینے ہی ہیں بھلا بیس پچیس ہزار پہلے دے دے گا تو کیا ہو جائے گا...... تجھے پتہ ہے دودا خان وہ کل کا چھوکرا ساون بھی میرے پاس پورے پچاس ہزار لے کر آیا

تھا...... پر میں نے اسے ٹھکرا دیا۔ اب سوچ رہا ہوں رکھ لیتا تو اچھا تھا......''

''سوڈھل!'' دودا خان اس کی بات پر ایک دم چراغ پا ہو کر دھاڑا...... لیکن سوڈھل ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا۔ ''سوڈھل! سوچ بچار کر بات کر...... تیرا کیا مطلب ہے...... ساون نے اگر یکمشت تیرے آگے روپے ڈال دیئے تو کیا تو اللہ رکھی کا سنگ اس کے ہاتھ دینے کے لیے تیار ہو جائے گا......'' دودا خان قدرے درشت لہجے میں بولا۔

''اب ایسی بھی بات نہیں، پر میری مجبوری ہی سمجھ...... مجھے اس وقت پیسوں کی سخت ضرورت ہے......'' سوڈھل معقول لہجے میں بولا۔ ''اب تُو خود ہی بتا...... تیری بھاجائی عنایتاں کو کچھ ہو گیا خدانخواستہ تو میرا کیا بنے گا۔''

اس کی بات سن کر دودا خان کا جوش ذرا کم ہوا اور وہ سوڈھل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا...... ''اچھا بتا کتنے چاہئیں...... میں دوں گا تجھے بول......'' اور چالاک سوڈھل اپنی بات بنتے دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔

''کچھ زیادہ نہیں دودا سائیں...... صرف 30 ہزار'' سوڈھل نے مکاری سے بتایا تو ایک لمحے کے لیے دودا خان کا منہ کھل گیا۔

لہٰذا وہ متحیر ہو کر بولا...... ''30 ہزار...... !سوڈھل کیا یہ کم ہیں؟''

''بابا ہمارے لیے تو زیادہ ہی...... پر، تیرے شوں کار (آسودہ حال) کے لیے تو کم ہی ہیں نا...... دودا سائیں......'' چالاک سوڈھل نے جواباً کہا تو چند ثانئے دودا خان خاموشی کے بعد بالآخر ایک ہنکاری مار کر ہامی بھرتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے...... سوڈھل...... رقم میں تجھے دے دیتا ہوں...... پر یاد رہے...... دس میں تجھے پہلے بھی دے چکا ہوں۔ ان تیس کو بھی شامل سمجھنا...... اب میں صرف تجھے اللہ رکھی کے سنگ کے لیے دس ہزار دوں گا اس طرح تیرا پچاس ہزار پورا ہو جائے گا۔''

''ہا...... سائیں...... برابر مجھے یاد ہے...... درحقیقت میں تجھ سے یہ بھی بعد میں ہی لیتا پر کیا کروں بیماری اور شفاء اللہ کے ہاتھ میں ہے...... تیری بھاجائی اچانک بیمار نہیں پڑتی تو......''

''اچھا...... اچھا...... ٹھیک ہے۔'' دودا خان اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا...... ''بھاجائی کو لے جا تو پہلے شہر علاج کے واسطے...... اور رقم بھی صبح تڑکے آ کر ادھر ہی سے لے جانا...... مجھ سے...... پر اتنا یاد رہے...... آتے ہی مجھے تاریخ دینی ہو گی تیرے کو...... اور وہ بھی قریب کی...... کیا سمجھا......''

''ہاہاہا...... تُو فکر ہی نہ کر...... تیری بھاجائی کو خیر خیریت کے ساتھ شہر سے لے آؤں...... پھر تجھے تاریخ دے دوں گا۔'' سوڈھل نے جواباً کہا پھر اس کے بعد وہ مسرور سا ہو کر وہاں سے لوٹ آیا۔

☆======☆======☆

اگلے دن ساون متذبذب سا ٹھیک مقررہ وقت پر کادو جکھرانی کے چھپر ہوٹل پہنچا جہاں دغاباز سوڈھل پہلے ہی سے ہوٹل کے بیرونی حصے میں ایک لکڑی کی بوسیدہ بینچ پر بیٹھا اس کا منتظر تھا...... پاس ہی خالی چائے کی پیالی رکھی ہوئی تھی جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں...... یہ شام سے ذرا پہلے کا سمے تھے...... کادو جکھرانی کا ہوٹل گوٹھ کے سرے پر شہر جانے والی سڑک کے کنارے ہی واقع تھا......

''آ بابا...... آ ساون...... کیا خیال ہے...... چائے پاڑیں منگواؤں تیرے واسطے......'' رسمی کلمات کے دوران سوڈھل نے یونہی سرسری پوچھا۔

''نہیں چاچا چائے پاڑیں کی خیر ہے...... مجھے یہ بتا کس واسطے تُو نے مجھے یہاں بلایا ہے...... مجھے بڑی فکر ہو رہی ہے۔'' ساون از راہ تفکیر بولا۔

سوڈھل اپنے لبوتر چہرے پر الجھن آمیز تاثرات لاتے ہوئے بولا...... ''ساون! میں، یہ بات تجھ سے اپنے گھر میں بھی کر سکتا تھا۔ پر دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں...... دیکھ ساون میں ایک کمزور اور بوڑھا شخص ہوں جو تشتم پشتم اپنی بیمار بیوی کے ساتھ حیات کی گاڑی گھسیٹ رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ میرا کوئی تیرے جیسا جوان پٹ نہیں...... جو میرا بازو بنتا...... دودے خان کو تو تُو جانتا ہی ہے ناں......'' اتنا کہہ کر وہ ذرا خاموش ہوا...... اس کا لہجہ آخر میں انتہائی سرگوشیانہ ہو گیا تھا اور وہ تھوڑا ساون کی طرف آگے کو بھی جھک آیا تھا۔ ساون کے چہرے پر ایک ہیجان خیز خاموشی کھنڈ آئی تھی...... عیار سوڈھل مزید بولا......

''ساون! تجھے تو پتہ ہی ہے کم بخت دودا خان بھی میری اللہ رکھی کا بیری ہو رہا ہے...... وہ بھی اس کا رشتہ لینا چاہتا ہے پر تجھے معلوم ہے میری پھول جیسی اللہ رکھی اس بڈھے گدھ کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی...... تو اب ایسا کر...... پہلے میری جان اس کمینے بڈھے دودا خان سے چھڑا دے...... کسی طرح...... تاکہ میں بے فکری سے اپنی اللہ رکھی تیرے ساتھ بیاہ دوں......'' منافق سوڈھل...... ساون کے دماغ میں خناس ڈالنے کی غرض سے بولا اور پھر چپ ہو کر اپنی چندھی چندھی آنکھوں سے ساون کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات کی تغیر پذیری کھوجنے لگا۔

ساون واقعی اندرونی طرح سے ایک ابال کی سی کیفیت سے دوچار ہو گیا...... تاہم وہ بولا...... ''چاچا سوڈھل! تجھے دودا خان سے زیادہ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے ......تُو بس اللہ رکھی سے میری شادی کا ترنت بندوبست کر...... میں اس بڈھے دودے خان سے نمٹ لوں گا بعد......''

''یہی تو میری بات تُو نہیں سمجھ رہا ناں...... پٹ......'' سوڈھل منافقت سے بولا......''اللہ رکھی کی طرف سے تُو بے فکر ہو جا...... وہ تیرے نام ہو چکی ہے......لیکن میں چاہتا ہوں کہ پہلے اس کم بخت دودا خان کا قضیہ نمٹ جائے......تو اچھا ہے......کیا معلوم وہ ذلیل عین میری اللہ رکھی کی شادی والے دن کوئی ہنگامہ کر دے......اولاد تو میری اپنی ہے نہیں...... وہ میرے مرحوم بھائی کی نشانی ہے جو اب میرے واسطے اولاد کا درجہ رکھتی ہے......اب اس کی خوشیاں بھی رل جائیں۔ بھلا یہ میں کس طرح برداشت کروں گا۔'' مکار سوڈھل یہ کہتے ہوئے مگرمچھ کے آنسو بہانے لگا۔

ساون عیار سوڈھل کی منافقانہ روش پر گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا...... ماحول پر عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوٹل کا ٹیپ ریکارڈر بج رہا تھا...... البتہ سامنے سڑک پر کبھی کبھار کوئی ویگن یا بس شور مچاتی گزر جاتی تو پُرسکون ماحول میں کچھ دیر تک ارتعاش سا پھیلا رہتا۔ دور چاولوں کے کھیتوں کے کنارے افق، غروب ہوتے سورج کی گلابی ٹکیہ سے نارنجی ہو رہا تھا......اور دھیرے دھیرے سردی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا...... ہوٹل میں لوگ بھی کم ہی تھے اور جتنے تھے وہ سب اندرونی حصے میں بنچوں پر بیٹھے بوسیدہ سی اونی چادریں اوڑھے...... ہاتھوں میں چائے کی دھواں اڑاتی گرم گرم پیالیاں پکڑے باتوں میں مشغول تھے۔

سادہ لوح مگر نڈر ساون نے مکار سوڈھل کی بات کا اپنے تئیں یہی مطلب اخذ کیا تھا کہ سوڈھل کی چونکہ اپنی کوئی اولاد نہیں اسی لئے اللہ رکھی، جو اس کے مرحوم بھائی کی نشانی اور اس کی اکلوتی بھتیجی تھی لہٰذا وہ اپنی چہیتی بھتیجی اللہ رکھی کی خوشیوں کو خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اور اسی لئے وہ پہلے موذی دودا خان کا قضیہ نمٹانے کا خواہشمند تھا۔ ساون کو بھلا کیا معلوم تھا کہ اس میں دغاباز سوڈھل کی ایک ایسی چال کارفرما تھی جس کے ذریعے وہ ایک تیر سے دو شکار یا بہ الفاظ دیگر...... سوڈھل ساون کا پچاس ہزار بغیر ڈکار لئے ہڑپ کرنے کے چکر میں تھا۔

بہرطور...... ساون سوڈھل کو اپنا اور اللہ رکھی کا خیر خواہ سمجھتے ہوئے اسے تسلی دے کر

وہاں سے چلا آیا...... سوڈھل کو تو اس نے اپنے تئیں مطمئن کر دیا تھا لیکن خود اس کی اپنی ذہنی کیفیت دگرگوں ہو رہی تھی اسے خود سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ آخر اس بڈھے دودے خان سے کس طرح نمٹے...... اس سلسلے میں وہ دودا خان کے بڑے اور سرکش بیٹے علی بخش سے بھی ذکر کر چکا تھا...... علی بخش بذات خود اس کا بھی دوست تھا...... اور وہی ایک ایسا شخص تھا جو اپنے باپ دودے خان کی تیسری شادی کی بھرپور مخالفت یا اس میں رکاوٹ کھڑی کر سکتا تھا...... لہٰذا علی بخش سے وہ خاص پُر امید تھا کہ ہو سکتا ہے بڑے بیٹے کی مخالفت کے آگے باپ کو اپنا ارادہ بدلنا پڑے۔

ساون اس ادھیڑ بن میں جب اپنے گھر پہنچا تو ٹھٹھرتی رات اتر چکی تھی...... مگر اسے اپنے گھر میں قدرے گرمی کا احساس ہوا...... اس نے محسوس کیا کہ اس کے ماں باپ کے چہروں پر آج غیر معمولی جوش کی گرمی تمتما رہی تھی...... کچھ ایسی تمازت اس نے اپنی چھوٹی مگر جوان بہن ہدایتاں کے چہرے پر بھی محسوس کی...... لہٰذا جب وہ اس کے آگے چارپائی پر روٹی کی چھابی رکھنے لگی تو بے اختیار ساون سے نہ رہا گیا...... وہ اپنی بہن سے مستفسر ہوا......''ادی! کیا بات ہے؟ امڑ اور پیو کے آج تیور ہی اور نظر آ رہے ہیں......''

اس کی بات پر ہدایتاں کے گندمی چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا...... تاہم وہ بولی۔ ''ہاں ادا! کچھ ایسی ہی بات ہے...... وہ...... آج چاچا اور چاچی آئے تھے...... مٹھائی اور پھل لے کر...... مجھے خرچی بھی دے کر گئے ہیں...... تیری بھی خرچی میرے پاس ہے......'' بہن کی بات سن کر ساون دھک سے رہ گیا...... اس کا ہاتھ چاول کی روٹی پر نوالہ توڑتے توڑتے رک گیا جبکہ ہدایتاں اتنا بتا کر چلی گئی تھی...... بہن کی بات سن کر اس کے اندر اچانک ہی خطرے کی گھنٹی بجنے لگی اور اپنی عمر زاد منہ پھٹ سورٹھ...... کی وہ بات یاد آ گئی جو اس نے کل شام تنہائی کا موقع پا کر اسے پیشگی اطلاع کے طور گوش گزار کی تھی...... اسے معلوم تھا کہ چاچا پریل اور چاچی مع لوازمات کے کیوں آئے تھے۔

ساون نے جیسے تیسے کھانا زہر مار کیا...... ابھی وہ فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کی ماں اندر آئی......''پٹ! وہ آج تیرے پریل چاچا اور چاچی آئے تھے...... ہدایتاں اور تجھے خرچی بھی دے کر گئے ہیں......''

''ہاں امڑ! پتا ہے مجھے...... ہدایتاں نے بتایا تھا مجھے!'' ساون قدرے بیزاری سے بولا...... اتنے میں اس کی ماں اس کے آگے سے کھانے کے برتن سمیٹ چکی تھی۔

''وہ...... بھا پریل ہدایتاں کو اپڑیں گل محمد کے لیے مانگنے آیا تھا......'' اس کی ماں

نے بتایا۔

''اچھی بات ہے...... مجھے کوئی اعتراض نہیں...... اگر تم لوگوں کو نہیں ہو تو...... گل محمد اچھا لڑکا ہے...... ادی ہدایتاں یقیناً اس کے ساتھ سکھی رہے گی۔'' ساون نے بالآخر اس سنجیدہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا...... اور سوالیہ نگاہوں سے متذبذب کھڑی اپنی ماں کے چہرے کی جانب تکنے لگا جیسے وہ کوئی دھماکہ کرنے والی ہو...... اس نے سر پر اجرک اوڑھ رکھی تھی...... بالآخر ساون کو اپنی ماں سے جس بات کی توقع تھی وہ اس کی ماں نے کہہ ہی ڈالی۔

''پٹ ساون! تیرا چاچا پریل پیسوں کی بجائے سنگ کے بدلے سنگ لینا دینا چاہتا ہے وہ وٹہ سٹہ کرنا چاہتا ہے...... اپنی بیٹی سورٹھ کا سنگ تجھے......''

''امڑ...... یہ تُو کیا کہہ رہی ہے......'' ساون ایک دم اپنی ماں کی بات کاٹتے ہوئے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا...... ''نہ صرف تجھے بلکہ پیو کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کسی اور سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... اور اس کے سوا میں کسی اور چھوکری کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا ہے...... اپنے......'' ساون قدرے سخت لہجے میں بولا......

اس کی ماں کے چہرے پر گہری متانت عود کر آئی وہ بولی...... ''پٹ!...... تیرے پیو کو معلوم تھی یہ بات اچھی طرح سے اور اس نے بھائی پریل کو بھی اشاروں میں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ بے شک اپنے پٹ گل محمد کے واسطے ہماری ہدایتاں کا سنگ لے لے اور بدلے میں اپنی بیٹھی سورٹھ کا سنگ تجھے دینے کی بجائے رواج کے مطابق تھوڑے پیسے بے شک دے دے...... پر وہ نہیں مانا...... کہتا تھا کہ بدلے میں پیسوں کی بجائے سنگ داری ہی کروں گا۔''

ماں کی گفتگو سے ساون نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کے ماں باپ چاچا پریل کی ہٹ دھرمی کے آگے خاموشی اختیار کرنے پر نہ صرف مجبور ہو چکے ہیں بلکہ اب وہ اس پر دباؤ ڈال کر اپنی عم زاد سورٹھ سے شادی کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں، جبکہ ساون بھی اپنی ہٹ دھرمی کا پکا تھا وہ اللہ رکھی کے سوا کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا...... اور پھر اس سے پہلے کہ ساون اپنی ماں سے مزید کچھ کہتا اس کا باپ موگو...... بھی اندر کوٹھڑی میں آ گیا...... غالباً اسے باہر ہی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اندر کمرے میں ماں بیٹے کے درمیاں کس نوع کی گفتگو ہو رہی ہے...... لہٰذا وہ اس اہم گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے ساون سے بولا...... ''اڑے ساون پٹ...... ! ہم تیرے ماں پیو ہیں اور تیرے بھلے ہی کی

بات کہیں گے۔ میں نے اللہ رکھی کو دیکھا تو نہیں ہے پھر بھی مجھے یقین ہے کہ میرے بھائی کی سورٹھ...... تیرے لئے زیادہ بہتر رہے گی......''

''بابا...... میرے لئے کون بہتر رہے گا...... یہ میں جانتا ہوں اچھی طرح کیونکہ لڑکی کے ساتھ زندگی میں نے گزارنی ہے......'' ساون باپ کی بات قدرے تحمل سے سننے کے بعد فوراً بولا...... ''میں شادی کروں گا تو صرف اللہ رکھی سے۔''

اس کی اس گفتگو پر اس کا باپ قدرے اونچے لہجے میں بولا...... ''اڑے تُو تو چریا ہو گیا اس یتیم چھوکری کے پیچھے...... ہیں...... جس چھوکری کو حاصل کرنے کے لیے تُو پچاس ہزار جیسی بڑی رقم کا (قرضدار) ہو جائے بھلا ایسی چھوکری تجھے شادی کے بعد کیا خوشیاں دے سکتی ہے۔ ہیں...... بول بتا مجھے۔'' موگو جذبات کی شدت سے کپکپانے لگا......

اپنے شوہر کو جوان اولاد پر غصہ ہوتا دیکھ کر موگو کی بیوی یک دم باپ بیٹے کے بیچ آتے ہوئے اپنے شوہر سے بولی۔ ''اے...... ہے، ذرا...... آرام سے بات کر پٹ ساون سے...... جوان پٹ ہے اپنا لہجہ ذرا ہولے رکھ......''

بیوی کی بات سن کر موگو کو اور بھی غصہ چڑھنے لگا مگر وہ کافی حد تک اس پر قابو پاتے ہوئے اپنی بیوی سے قدرے تیز لہجے میں بولا...... ''تو نے ہی اس کا دماغ آسمان پر پہنچایا ہوا ہے...... تو بتا دے پھر اپنے اس جوان پٹ کو...... اسے ہماری بات ماننی پڑے گی...... اس کی فضول اور بے کار ضد کے آگے میں اپنے بھائی کے ساتھ تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتا......'' موگو اتنا کہہ کر کوٹھڑی سے نکل گیا...... ساون کی ماں بے چاری حیران پریشان کھڑی رہ گئی جبکہ خود ساون باپ کے قطعیت بھرے لہجے پر گومگو میں مبتلا ہو گیا تھا۔

حرص و ہوس اور لالچ ایک ایسی دلدل ہے جس میں انسان جانتے بوجھتے دھنستا چلا جاتا ہے...... اور جتنا اندر دھنستا ہے اتنی ہی اس کی طمع بھی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ یہی لوبھ لالچی شخص کو قعر فنا میں ہمیشہ کے لیے غرق کر کے رکھ دیتا ہے...... حریص سوڈھل بھی ایک ایسا ہی لالچی شخص تھا اور اپنے عبرت ناک انجام سے بے پروا ہو کر لالچ اور حرص کی دلدل میں اترتا چلا جا رہا تھا...... پہلے بڈھے دودا خان سے اپنی اکلوتی جوان بھتیجی اللہ رکھی کا رشتہ دینے کا معاوضہ دس ہزار...... اور پھر اسی بہانے بعد میں اس سے تیس ہزار اینٹھ لئے اور دوسری طرف ساون سے بھی اللہ رکھی سے شادی کرنے کا جھوٹا وعدہ کرتے ہوئے اس سے پورے پچاس ہزار کی رقم ہضم کر چکا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اب دودا خان اور ساون کو بھی آپس میں لڑانے کی کوشش کر رہا تھا...... مقصد یہی تھا کہ وہ اپنی سونے کی چڑیا (اللہ رکھی)

کے ٹکے زیادہ سے زیادہ کھرے کر سکے...... لوگوں کو بتانے کے لیے وہ اللہ رکھی کو اپنی بیٹی کہتا تھا مگر درحقیقت وہ اسے اپنے لئے سونے کی چڑیا سمجھتا تھا...... کا دو جکھرانی کے چھپر ہوٹل میں ساون کو دودے کے خلاف بھڑکا کر وہ بڑا مسرور واپس اپنے گھر پہنچا تو حسب معمول اللہ رکھی کو کام میں جتا ہوا اور اپنی بیوی عنایتاں کو اندر کوٹھڑی میں چارپائی پر اٹوائی کھٹوائی ڈالے پایا...... جوڑوں کے درد نے اسے خاصا بے حال کیا ہوا تھا...... سردیوں میں تو گٹھیئے کا یہ درد اور بھی شدت اختیار کر لیتا تھا اور بالائے ستم اس کا وجود بھی بہت بھاری بھرکم تھا...... کوٹھری نما کمرے کی کچی دیواروں کی وجہ سے اندر ٹھنڈ کی شدت ذرا کم ہی تھی...... اکلوتے بلب کی پیلی روشنی اندر کے محدود ماحول کو بیمار اور سوگوار سا بنا رہی تھی...... ایک عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا...... سوڈھل اپنی رلی بچھی چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا...... اسی اثناء میں اللہ رکھی اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں کھانے کے برتن تھے...... برتن کیا تھے...... ابلے ہوئے گرم گرم سفید چاولوں کی ایک بڑی پلیٹ تھی جس پر مونگ کی پتلی دال پھیلائی ہوئی تھی اور اس میں سے بھاپ کے مرغولے اٹھ رہے تھے......

سوڈھل چاول کھاتے ساتھ کی چارپائی پر لیٹی کراہتی ہوئی عنایتاں کو عجیب نگاہوں سے تکنے لگا...... اپنی بیوی کو تکتے ہوئے منصوبہ ساز سوڈھل کو یوں لگا جیسے کوئی پُراسرار سا خیال ایک خناس کی صورت اس کے دماغ میں کسی ناگ کی طرح کلبلا رہا ہے...... اور یہ نئی بات نہ تھی پہلے بھی سوڈھل کے اندر اس خیال نے خناس کی صورت سر ابھارا تھا مگر سوڈھل نے اس پر کچھ خاص توجہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی مگر آج جانے کیوں وہ اپنے اندر اچانک ابھرنے والے اس پُراسرار خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکا تھا۔ شاید یہ اس لیے کہ اس کی دائمی مرض میں مبتلا بیوی جو ایک مستقل بوجھ کی صورت میں چارپائی پر لیٹی ہولے ہولے کراہ رہی تھی...... آج مسلسل اس کی نظروں میں کھٹک رہی تھی...... وہ آج پہلی مرتبہ اپنے اندر ابھرنے والے اس خیال پر غور کرنے لگا کہ وہ آخر کب تک اپنی بیمار بیوی کا بوجھ ڈھوتا رہے گا...... جبکہ وہ خود بھی ایک بوڑھا اور کمزور شخص تھا...... اسے خود بھی اپنی بیوی کی خدمت کی ضرورت تھی...... وہ سوچنے لگا کہ اللہ رکھی کے آنے سے اس کی بیوی بھی کچھ زیادہ چارپائی سے لگ گئی تھی اور تو اور اٹھ کر پانی کا ایک گلاس پینے سے بھی لاچار ہو گئی تھی...... گھر میں اللہ رکھی تھی تو معمول کے کام روز نمٹ جایا کرتے تھے۔ اللہ رکھی کی شادی کے بعد یہ سب کون کرے گا...... اس خیال نے سوڈھل کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور تب پہلی بار اسے اپنی بیوی عنایتاں ایک لاش کی طرح محسوس ہونے لگی۔

آج پہلی بار اس نے اس رخ پر سوچا تھا اور دہل کر رہ گیا تھا...... وہ سوچوں میں اتنا محو ہو چکا تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کے آگے رکھے ہوئے چاول کب کے سرد ہو چکے تھے۔

☆======☆======☆

علی بخش اب آہستہ آہستہ کام دھندے میں دلچسپی لینے لگا تھا...... وہ خود کو اپنی شخصیت کے خول سے باہر نکال رہا تھا...... اسے اس بات کا ادراک ہو چلا تھا کہ زیادتی اور دکھ سہہ کر اپنی ذات کی تاریک کوٹھری میں محبوس ہونے سے کئی درجہ بہتر تھا کہ انسان اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کے معاشرے سے بھرپور بدلے لے اور اس کا ازالہ کروائے...... یہی وجہ تھی کہ گوٹھ کی گلیوں میں بے مقصد اور آوارہ پھرنے اور اپنی ذات میں تنہا تنہا رہنے والا علی بخش اب اپنی الجھی ہوئی شخصیت کے گرداب سے باہر نکل آیا تھا...... اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی مرحومہ ماں حضوراں بی بی کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے اس کے باپ دودا خان نے اس کی ماں پر سوتن جو بٹھا دی اس کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا تھا کیونکہ اس کی سوتیلی ماں خیراں نے حضوراں بی بی کا ناک میں اس قدر دم کیا تھا کہ وہ بے چاری بستر سے جا لگی تھی۔ شوہر کی چہیتی تو تھی وہ اس لئے بڑے دھڑلے کے ساتھ علی بخش کی ماں حضوراں بی بی کا ناطقہ بند کئے رکھتی تھی...... بالآخر حضوراں بی بی موت کی آغوش میں جا سوئی اور علی بخش بے چارہ تنہا رہ گیا...... مگر علی بخش اپنی ماں کی موت کا اصل ذمہ دار اپنے باپ دودا خان کو ہی سمجھتا تھا...... ماں کی موت کے بعد کافی عرصے اس کی شخصیت اپنے گھر میں اجنبیوں جیسی رہی تھی...... پھر رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا کہ اس کی اس اجنبیت کو دانستہ تقویت پہنچانے والے دو اہم کردار ہیں، اس کی سوتیلی ماں خیراں اور اس کے بیٹا محرم علی کا مقصد ہی درحقیقت یہی تھا کہ علی بخش کو اس کے باپ کی املاک اور جائیداد وغیرہ سے دور ہی رکھا جائے...... مگر بروقت علی بخش دونوں ماں بیٹوں کی سازش بھانپ گیا تھا اور یوں اپنا آپ منوانے اور اپنے حق کا محافظ بننے کی خاطر وہ اب اپنے سوتیلے چھوٹے بھائی محرم علی کے ساتھ ہوٹل کا کام سنبھالنے لگا تھا...... اس کی اس تبدیلی پر دودا خان خوش تھا۔ بالآخر علی بخش اس کا بڑا بیٹا تھا، لیکن بہرحال علی بخش اندر ہی اندر اپنے باپ اور سوتیلی ماں اور بھائی سے خائف رہتا تھا۔

اس کے دوست ساون نے ایک دن علی بخش کو اس دھماکہ خیز اطلاع سے نوازتے ہوئے بتایا کہ اس کا باپ دودا خان اللہ رکھی نامی ایک نوعمر لڑکی سے شادی کر رہا ہے جو خود

اس کی بیٹیوں جیسی ہے اور جس سے خود اس کا دوست ساون شادی کرنا چاہتا ہے وغیرہ......

یوں تو علی بخش نے اپنے دوست ساون کی اس سلسلے میں بھرپور مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا...... کیونکہ پہلے تو علی بخش کو ساون کی بات پر یقین ہی نہیں آیا تھا کہ اس کا باپ کسی نوعمر لڑکی سے تیسری شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے مگر ساون کے سنجیدہ اور رنجیدہ لہجے نے اسے سچائی ماننے پر مجبور کر دیا تھا...... بہ ظاہر علی بخش نے ساون کو تسلی دے کر لوٹا دیا تھا مگر درحقیقت علی بخش چاہ یہی رہا تھا کہ اس کا باپ بھلے تیسری شادی کرتا ہے تو کرے...... آخر اس کی سوتیلی ماں خیراں بھی تو ایک سوتن کا عذاب جھیلے...... جس طرح وہ کبھی خود اس کی ماں حضوراں بی بی پر سوکن بن کر آئی تھی...... تاریخ اب اپنے آپ کو دہرانے والی تھی......

علی بخش اب دل ہی دل میں اپنے باپ کی اس حد تک بڑھی ہوئی بوالہوسی پر خوش تھا۔ وہ مسرور ہو کر سوچ رہا تھا کہ تقدیر اب خود ہی اس کی معصوم ماں کا بدلہ لینے والی تھی۔ لہٰذا علی بخش نے بجائے باپ کو تیسری شادی کے اقدام سے روکنے کے خاموشی اختیار کر لی اور اپنے دوست ساون سے کیا ہوا وعدہ بھی جھٹلا دیا...... اب علی بخش شدت سے اس دن کا منتظر تھا جب اس کا باپ تیسری شادی کر کے اللہ رکھی جیسی نوعمر لڑکی کو اس کی دوسری سوتیلی ماں بنا کر لائے اور وہ تماشا دیکھے...... عنقریب گھر میں دمادم مست قلندر ہونے والا تھا......

علی بخش کے ہوٹل میں بیٹھنے سے اب یہ ہوا تھا کہ اس کا سوتیلا بھائی محرم علی کم توجہ دینے لگا تھا اور یوں دھیرے دھیرے ہوٹل کا سارا نظام حتیٰ کہ روپے پیسوں کا معاملہ بھی علی بخش کے ہاتھ میں آ چکا تھا جبکہ اس کا باپ دودا خان برائے نام ہی ہوٹل آیا کرتا تھا...... محرم علی اب زیادہ وقت دوستوں یاروں کے ساتھ آوارہ گردی کرنے لگا تھا۔

یہ دیکھ کر محرم علی کی ماں خیراں کو تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ اسے کسی بھی طور یہ گوارا نہ تھا کہ اس کا سوتیلا بیٹا علی بخش کمائی کا اڈا سنبھالے...... کیونکہ ہوٹل سنبھالنے کا مطلب یہی تھا کہ دونوں ماں بیٹے اب علی بخش کے محتاج ہو جاتے...... لہٰذا ایک دن خیراں نے اپنے نادان بیٹے محرم علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ...... میں تجھے گھومنے پھرنے سے منع نہیں کرتی پر تُو روزگار کے اڈے کو نہ چھوڑ۔ اسے بھی وقت دے...... جتنا علی بخش کا ہوٹل میں حصہ ہے اتنا تیرا بھی تو ہے...... ایسا نہ ہو تیرے باپ کے مرنے کے بعد تیرا سوتیلا بھائی اس پر قبضہ کر لے......''

ماں کی بات پر محرم علی جواباً بولا...... ''اماں میں تو جایا کرتا تھا ہوٹل...... بلکہ سارا سنبھالا ہوا ہی تھا...... جب سے علی بخش نے بیٹھنا شروع کیا ہے تو وہ دخل چھوڑتا ہی

نہیں...... ساری کمائی ہوٹل کی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔''

''یہی تو اس کی سازش ہے......'' خیراں تڑپ کر بولی...... ''علی بخش ہم دونوں ماں بیٹوں کے لیے سانپ بنا ہوا ہے...... تو وہ بات سوچتا نہیں...... پر مجھے اب اس بات کا اندازہ ہونے لگا ہے کہ علی بخش اپنی ماں حضوراں بی بی...... کی موت کا ذمہ دار ہم دونوں ماں بیٹوں کو سمجھتا ہے۔ تُو نے کبھی اس کی نظروں پر غور نہیں کیا...... کس طرح وہ دشمنوں کی طرح ہمیں گھورتا ہے سچ پوچھو تو بیٹا...... مجھے اب اس سے خوف آنے لگا ہے...... تیرے باپ کا کچھ پتہ نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں اور علی بخش انتقاماً ہمیں نکال باہر کرے......'' خیراں کا لہجہ آخر میں خوف آمیز ہو گیا تھا۔

ماں کی بات پر محرم علی بھی تشویش آمیز الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ کتنی غفلت برت رہا تھا...... ماں کے بہکانے کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اسی وقت اپنے ہوٹل جا پہنچا...... اس وقت ''دخل'' پر علی بخش بیٹھا گاہکوں سے پیسے وصول کر رہا تھا...... جبکہ دودا خان وہاں موجود نہ تھا۔

''کیسے آئے ہو محرم......؟'' علی بخش اسے اچانک وہاں پا کر بولا۔

''کیوں...... کیا میں نہیں آ سکتا...... میرا اس ہوٹل پہ حق نہیں ہے......؟'' محرم علی قدرے ناگواری سے بولا اور دھڑلے کے ساتھ ''دخل'' کے قریب رکھے ایک دوسرے اسٹول پر براجمان ہو گیا۔

علی بخش نے بہ غور اس کے تیوروں کا اندازہ لگایا اور جواباً اس کے لہجے میں بھی تلخی گھل گئی...... وہ بولا...... ''اس میں اتنی گرمی دکھانے کی کیا ضرورت ہے میں نے کب کہا کہ تمہارا اس ہوٹل پہ حق نہیں......''

''میں اب روزانہ ہوٹل آ کر 'دخل' سنبھالا کروں گا۔'' محرم علی کا انداز بدستور اکھڑ پن کی غمازی کر رہا تھا۔

''اچھی بات ہے...... میرا کام بھی ذرا آسان ہو جائے گا...... مجھے بھی ذرا دوستوں یاروں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا موقع ملے گا......'' جواباً علی بخش تحمل سے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کے محتاط ذہن نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ محرم کا ذہن کسی نے خراب کر کے بھیجا ہے یہاں...... اور یہ ''کار خیر'' اس کی ماں سے بہتر بھلا کون انجام دے سکتا تھا......

اس وقت شام پر تولے کھڑی تھی...... ہوٹل میں حسب معمول ''کچہری پسندوں'' کا

آنا شروع ہوگیا تھا۔ کافی دیر تو محرم علی چپ بیٹھا رہا...... مگر پھر جانے کیا ہوا...... اس نے ایک دم اپنا ہاتھ بڑھا کر...... ''دخل'' کی دراز سے پیسے اٹھانے کی کوشش کی تو سامنے ہی بیٹھے علی بخش نے فوراً اس کا ہاتھ روکتے ہوئے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کر رہے ہو محرم...... پیسے چاہئیں تو مجھے بتاؤ۔'' اس کی بات سن کر محرم کی درشت آنکھوں میں طیش کی لہر سی چمک اٹھی اور وہ اسی لہجے میں علی بخش کو گھورتے ہوئے بولا۔

''تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا...... ہاتھ پرے ہٹا اپنا۔''

مگر علی بخش نے پھر بھی اس کا ہاتھ ''دخل'' پر روکے رکھا اور تیز لہجے میں بولا......

''میں نے بابا کو حساب دینا ہوتا ہے...... یہ میری ذمہ داری ہے...... انہی پیسوں میں سے مجھے پیش گاروں کو بھی روز کی مزدوری دینی ہوتی ہے......''

''تو ٹھیک ہے پھر بابا...... آئے گا تو اسے بتا دینا...... مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی میں لے گیا......'' محرم علی نے یہ کہتے ہوئے پیش قدمی کی مگر اب علی بخش کو اس کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی پر طیش آ گیا تھا...... اس نے محرم علی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے پیچھے کی طرف دھکیلا اور محرم علی اسٹول سمیت اپنے عقب میں الٹ گیا۔

''آرام سے بات سمجھ میں نہیں آتی ہے تجھے......'' اس کے گرتے ہی علی بخش دھاڑ کر بولا...... محرم علی نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی اس کا چہرہ خفت اور غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

''تیری یہ جرأت...... تُو نے مجھے دھکا دیا......'' وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا اور علی بخش کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا...... ''اپنی اوقات دیکھی ہے تُو نے۔'' محرم علی کا لہجہ حد درجے تضحیک آمیز تھا۔

''ہاتھ ہٹا لے میرے گریبان سے محرم علی۔'' علی بخش گرجدار آواز میں اس کی طرف گھورتے ہوئے بولا...... دونوں بھائیوں کو باہم دست و گریبان دیکھ کر ہوٹل ملازمین اور دیگر افراد بھی ان کی جانب لپکے...... محرم علی نے ہنوز علی بخش کا گریبان نہیں چھوڑا تھا...... ڈیل ڈول کے لحاظ سے دونوں ایک ہی قامت کے تھے مگر علی بخش کا قد نسبتاً نکلتا ہوا تھا...... اس نے جب دیکھا محرم علی اس کے گریبان سے ہاتھ نہیں ہٹا رہا تو اس نے اپنے ایک ہاتھ سے محرم کے گریبان والے ہاتھ کو مضبوطی سے جکڑ کر عجیب انداز میں اسے مروڑا تو خود ہی محرم علی نے کراہ کر علی بخش کے گریبان پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی...... پھر محرم علی نے اپنے دوسرے ہاتھ سے ایک گھونسا علی بخش کی ناک پر جڑنے کی کوشش کی مگر بروقت علی بخش

نے جھکائی دیتے ہوئے خود کو بچانے کی سعی کی لیکن بچاتے بچاتے محرم علی کا زوردار گھونسا اس کی گردن پر پڑا...... جس نے علی بخش کو بھی ہتھے سے اکھاڑ دیا۔ جب تک دیگر لوگ دونوں بھائیوں کے درمیان میں آتے...... علی بخش کی داھنی ٹانگ حرکت میں آئی اور محرم علی اپنے حلق سے، ''اوغ'' کی آواز نکالتا ہوا دوہرا ہوتا چلا گیا......

لوگوں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے دونوں کو سنبھالا...... ادھر مضروب محرم علی کو بھی کچھ لوگ پرے کھینچ کر لے گئے تھے کیونکہ اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور ایک پرانی سی لوہے کی کرسی اٹھا کر علی بخش کی جانب بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا...... اس کے حلق سے مغلظات کا طوفان بھی بپا تھا......

علی بخش کا غصہ ابھی تک سرد نہیں پڑا تھا...... غرض دونوں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی خواہش دیرینہ میں مبتلا، درمیان میں آئے ہوئے لوگوں کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی ناکام کوششیں کر رہے تھے...... اسی اثناء میں اتفاق سے دودا خان وہاں آ پہنچا...... اسے شاید وہاں پہنچتے پہنچتے اس ہنگامے کی اطلاع مل چکی تھی...... باپ کو دیکھ کر دونوں بھائیوں کا جوش بھی ماند پڑنے لگا اور بیچ بچاؤ کرانے والے افراد بھی اپنی اپنی جگہوں کی طرف بڑھ گئے...... دودا خان باری باری دونوں کو گھورنے لگا پھر محرم علی کی جانب دیکھتے ہوئے اسے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا اور چاروناچار محرم علی علی بخش کو زہرناک نگاہوں سے گھورتا ہوا ہوٹل سے نکل گیا۔

☆======☆======☆

''رے سوڈھل! مجھے شہر لے چل بڑے ڈاگدر (ڈاکٹر) کے پاس...... مجھ سے اب یہ درد برداشت نہیں ہوتا......'' عنایتاں چارپائی پر بیٹھی اپنے ستونوں جیسے بھاری بھرکم گھٹنوں کے گرد پرانے ازار بند کستے ہوئے قریباً کراہ کراہ کر اپنے شوہر سے بولی۔

''ڑی تُو اللہ رکھی سے اپنے گھٹنوں میں تیل کی مالش کروا لیا کر...... ناں......'' سوڈھل نے گویا جان چھڑانے کی غرض سے جواباً کہا۔

''وہ تو میں اس سے صبح شام کرواتی ہوں پر افاقہ پھر بھی نہیں ہو رہا...... دودے خان نے تجھے تو اب پیسے بھی دے دیئے ہیں...... پھر کیوں نہیں لے کر جاتا مجھے شہر کے ہسپتال......''

اس کی بات سن کر سوڈھل نے چارپائی پر لیٹے لیٹے پہلو بدلا اور بیزار کن لہجے میں بیوی سے بولا۔ ''اڑی! شہر کے ہسپتال میں کون سا آب حیات رکھا ہے...... وہاں تو پیسے

ضائع ہی کرنے والی بات ہے......کل صبح حکیم بڈھل سے تیل لادوں گا سو جا اب......تنگ نہ کر مجھے میں ذرا آج پریشان ہوں......''

شوہر کی بات پر عنایتاں نے برا سا منہ بنالیا......تاہم وہ بہ غور اب اپنے شوہر کو تکنے لگی......وہ آج واقعی کچھ زیادہ ہی گہری سوچ میں غلطاں دکھائی دے رہا تھا......آخر کو وہ اس کا شوہر تھا لہذا عنایتاں سے رہا نہ گیا اور وہ اپنی تکلیف بھلا کر بولی۔ ''سوڈھل تجھے کس بات کی گڑتی ہے آخر......مجھے بتا......شاید میں......'' عنایتاں نے دانستہ اپنا جملہ پورا نہ کیا۔

اس کے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر تھے......شاید وہاں درد کی تیز لہر بھی اٹھی تھی......ادھر سوڈھل بیوی کی بات پر ذرا چونکا......چند ثانئے اپنی فکر بھلا کر عنایتاں کو عجیب سی نظروں سے تکنے لگا......باہر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا......رات دبے پاؤں سرک رہی تھی......باہر سردی زوروں پر تھی کیونکہ کسی بھی جانور کے بولنے تک کی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ اللہ رکھی دوسری کوٹھری میں محو خواب تھی......آج وہاں وہ اکیلی سوئی ہوئی تھی کیونکہ اکثر چاچی عنایتاں بھی اسی کوٹھری میں سوتی تھی......کمرے میں کمزور بلب کی پیلی روشنی میں موٹی سی گرم رلی میں گردن تک ملفوف عنایتاں کے چہرے کو بغور عجیب نظروں سے تکتے ہوئے اس کے شوہر سوڈھل کو یوں لگا جیسے وہ اپنے اندر کی اُدھیڑ بن سے اپنی بیوی کو ضرور آگاہ کرے......لہذا پھر ذرا کھنکار کر گلا صاف کیا، موٹی پرانی مگر گرم رلی کو اچھی طرح اپنے کمزور سے جسم کے گرد لپیٹا اور بولا......''وہ عنایتاں!......تجھے تو پتہ ہے کہ اپنی اللہ رکھی سے دودا خان کے علاوہ موگو ہاری کا بیٹا ساون بھی شادی کرنا چاہتا ہے......بلکہ اس چھوکرے ساون نے تو وڈیرے میر لکھ میر خان کے منشی میرل سے پورے پچاس ہزار ویاج پر لے کر میرے قدموں میں بھی ڈال دیئے تاکہ میں بجائے بڈھے دودا خان کے اللہ رکھی کا رشتہ ساون کو دے دوں اور میں نے ساون سے وعدہ کر کے اس کے پچاس ہزار رکھ لیے ہیں اپنے پاس......جبکہ دودا خان بھی اسی مد میں چالیس ہزار دے چکا ہے......پر پتہ نہیں کیوں میرا دل کرتا ہے کہ اپنی اللہ رکھی کا سنگ ان دونوں کو ہی نہ دوں......''

سوڈھل نے اپنی بات ختم کی تو عنایتاں کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں جیسے سوڈھل نے اس کے دل کی بات کہہ ڈالی ہو......لہذا وہ فوراً تائیدی لہجے میں بولی۔ ''یہی تو میں بھی تجھ سے کہتی تھی......اب بتا بھلا تُو جو اللہ رکھی کو بیاہ دے گا......تو ہم بڈھوں کی دیکھ بھال کون کرے گا......میں تو کہتی ہوں......دونوں کے پیسے واپس کر دے......''

''اڑی نیک بختاں! یہی تو میں نہیں کرنا چاہتا......میں چاہتا ہوں پیسے بھی نہ دینے پڑیں واپس......اور اللہ رکھی کا سنگ بھی......اس چھوکرے ساون کے تو میں پچاس ہزار بغیر ڈکار لئے ہضم کر جاؤں گا اور وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ جبکہ مرد دودے خان سے مجھے ذرا ڈر لگتا ہے......اس کا پیسہ کھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ثابت ہوگا......''

شوہر کی بات پر عنایتاں کے بھاری چہرے پر معنی خیز سی مسکراہٹ کھنچ گئی اور وہ بھاری پپوٹوں تلے دھنسی ہوئی آنکھوں کو ذرا سکیڑ کر شوہر کی جانب دیکھتے ہوئے پھوہڑ پن سے بولی۔ ''ہونہہ......اب سمجھی میں......تجھے کس بات کی گڑتی کھائے جا رہی ہے......اس کا حل بھی میرے پاس......''

''کک......کون سا......بتا مجھے جلدی......مجھے پتہ تھا اس کا حل تُو ہی نکال سکتی ہے تم عورتیں اس معاملے میں زیادہ سیانی ہوتی ہو......بتا اچھا......'' سوڈھل یک دم توصیفی لہجے میں بولا اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''سیدھ سادا حل ہے......دونوں کو آپس میں لڑا دے......'' عنایتاں نے جیسے اپنے تئیں بڑے نکتے کی بات کہی تھی مگر سوڈھل بیزار کن لہجے میں بولا۔

''یہی تو میں کر رہا ہوں......لیکن مجھے معلوم ہے اس میں ساون کو ہی شکست اٹھانی پڑے گی......وہ چھوکرا اس کی ٹکر کا نہیں ہے......دودا خان پھر سینہ پھلائے میرے سامنے آجائے گا......پھر مجبوراً......''

اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو عنایتاں نے اسے دوبارہ اپنے گرانقدر مشورے سے نوازا۔

''اس بڈھے دودا خان کو آسرے پر لگائے رکھ پھر......''

''کرنا تو اب یہی پڑے گا......لیکن میں چاہتا ہوں کوئی ایسا داؤ آزماؤں کہ بذات خود دودا خان اپنے کسی جھمیلے میں الجھا رہے......اور مجھے اسے راستے سے ہٹانے کا موقع مل جائے......'' سوڈھل اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بولا......تو عنایتاں چند ثانئے خاموشی کے بعد دوبارہ جیسے قدرے پُرجوش انداز میں بولی۔

''رے سوڈھل......مجھے یہ بتا کہ......دودا خان کی اپنی کوئی گھر والی زندہ ہے......''

''ہاں......ہے......پہلی تو مر چکی ہے......اس کے بطن سے ایک بیٹا علی بخش ہے جبکہ دوسری ابھی زندہ ہے......اس سے بھی ایک جوان بیٹا محرم علی اور شادی شدہ بہن شمع ہے جو ساتھ کے گوٹھ اللہ داد......میں بیاہی ہوئی ہے......''

اس کی بات سن کر عنایتاں چند ثانیے پُرسوچ انداز میں اپنے سر کو تفہیمی جنبش دینے لگی...... سوڈھل بدستور اپنی بیوی کا چہرہ تکے جا رہا تھا...... پھر اس نے اچانک عنایتاں کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ ابھرتے دیکھی جیسے اس نے اپنے ذہن میں کوئی کھچڑی پکالی ہو...... ''رے سوڈھل! سن رے میری بات ذرا غور سے۔'' کوٹھڑی کے پُرسکون ماحول میں عنایتاں کی گہری آواز ابھری اور سوڈھل امید بھری چمکتی نظروں کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو گیا...... عنایتاں کے ہونٹ سرگوشیانہ انداز میں تیزی سے ہل رہے تھے اور دغاباز سوڈھل کے لمبوترے خاکستری چہرے پر مکارانہ تمازت سی پھیلتی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

''ساون! تجھے چاچا سوڈھل کو ابھی اتنی بڑی رقم دینی نہیں چاہیے تھی......'' اللہ رکھی فکرمندی سے بولی۔ وہ اس وقت ڈرتے ڈرتے ندی کے کنارے پانی بھرنے آئی تھی...... ساون بھی مقررہ وقت پر وہاں پہنچا تھا...... دونوں اب اسریں کے چھتنار اور موٹے تنے کے عقب میں کھڑے محو گفتگو تھے...... شام ابھی اتری نہیں تھی...... دور نارنجی افق کی سمت پرندوں کی ڈاریں تھکی تھکی اڑان کے ساتھ اپنے مسکنوں کی جانب محو پرواز تھیں...... فضا میں خاصی ٹھنڈ گھلی ہوئی تھی جو اس بات کی غماز تھی کہ آج رات کو غضب کا جاڑا پڑے گا...... دونوں پرانی اونی چادروں میں ملفوف تھے...... اللہ رکھی اب صرف ایک ہی گھڑا بھرنے آئی تھی۔

ساون نے اللہ رکھی کی بات سنی اور جواباً عذر پیش کرتے ہوئے اللہ رکھی سے بولا...... ''شاید تو صحیح کہہ رہی ہے اللہ رکھی...... لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ تیرے لالچی چاچا سوڈھل کی جھولی میں یکمشت پچاس ہزار کی رقم پھینک کر اس سے تیرا رشتہ لینے پر فوراً مجبور کردوں...... کیونکہ مردود دودا خان نے بھی تیرے رشتے کے لیے ابھی تک سوڈھل کو اکٹھی اتنی بڑی رقم نہیں دی ہے اور یوں بعد میں میرا خیال درست ثابت ہوا...... کیونکہ اب تیرے لالچی چاچا سوڈھل نے تیرا مجھ سے بیاہ کرنے کی رضامندی دے دی ہے۔''

ساون نے جیسے اپنے تئیں اللہ رکھی کو خوش خبری سنائی...... لیکن اللہ رکھی کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی اور وہ غیر مطمئن لہجے میں بولی۔ ''پتہ نہیں کیوں ساون میرا دل نہیں مان رہا کہ چاچا سوڈھل تجھ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرے گا؟'' بالآخر اللہ رکھی نے اپنے خدشے کا برملا اظہار کر ڈالا۔

اس کی بات سن کر ساون نے اللہ رکھی کے شانوں پر اپنے ہاتھ مضبوطی کے ساتھ

جماتے ہوئے اسے ذرا اپنے قریب کیا تو اللہ رکھی نے چونک کر اپنی شرگیں پلکیں اٹھا کر ایک لمحے کو ساون کے پُرعزم چہرے کی جانب دیکھا اور پھر اپنی گھنیری پلکوں کی چلمنیں گرادیں۔ تب اسے ساون کی بھاری اور پُرجوش آواز سنائی دی...... ''اللہ رکھی! اگر تیرے سوڈھل چاچا نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو...... قسم مرشد کی...... میں اسے ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا اور تجھے بھی اٹھا کر کہیں دور لے جاؤں گا۔'' ساون کے بلند آہنگ لہجے کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے جب اللہ رکھی نے چونک کر اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو ساون کا چہرہ جوش اور اٹل ارادے کی فیصلہ کن تمازت سے سرخ ہو رہا تھا اور پھر جانے کیوں بے چاری اللہ رکھی کی سیاہ آنکھوں میں ایک معصوم سا انجانا خوف سمٹ آیا۔

☆======☆======☆

اپنے سوتیلے بھائی محرم علی سے جھگڑے پر علی بخش کے لیے اب اپنے ہی گھر میں جگہ تنگ ہونے لگی تھی۔ ایک تو پہلے ہی گھر میں بے چارے کو مسلسل نظرانداز کیا جاتا رہا تھا اور اب اس کی سوتیلی ماں نے کھل کر علی بخش کو وقت بے وقت دھتکارنا شروع کر دیا تھا...... اب وہ علی بخش کے معاملے میں اپنے شوہر دودا خان کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی...... دودا خان نے آپس میں جھگڑا کرنے پر دونوں بھائیوں کو سخت سرزنش کی تھی اور اب دونوں کے ہوٹل میں بیٹھنے کے الگ الگ اوقات مقرر کر دیئے تھے جس کے مطابق علی بخش صبح سے دوپہر تک اور محرم علی شام سے رات تک ہوٹل میں بیٹھنے لگا تھا، لیکن خیراں کو پھر بھی چین نہیں ملا اس نے اپنے تئیں چالاکی سے یہ اندازہ لگانے کی کوششیں کی کہ اس طرح صبح کے اوقات میں علی بخش کے ''اکیلے'' ہوٹل بیٹھنے سے وہ ہوٹل کی آدھی کمائی کا تنہا ''رکھوالا'' بن رہا تھا اور ''رکھوالے'' سے کیا بعید کہ وہ بہتی گنگا میں اشنان کرتا رہے۔ جبکہ اس کا اپنا چہیتا بیٹا محرم علی شام کے وقت ہوٹل سنبھالنے سے اس کے تئیں خالی بیگار کاٹنے کے مترادف تھا کیونکہ اس وقت دودا خان دن بھر گھر آرام کرنے کے بعد شام کو محرم علی کے ساتھ ہوٹل میں موجود ہوتا...... لہٰذا خیراں کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کا محرم علی ''مالک'' کی بجائے نوکر بن کر باپ کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھے...... پھر ایک دن اپنے سوتیلے بیٹے علی بخش کے خلاف اپنے شوہر کے کان بھرتے ہوئے بولی۔

''سرتاج سائیں! کھلی کمائی کے پیسے سامنے ہوں تو اچھے اچھوں کا ایمان ڈولنے لگتا ہے۔ میں علی بخش کو چور نہیں کہتی...... پر تو صبح کے وقت علی بخش کے ساتھ بھی بیٹھا کر......''

دودا خان ایک بڈھا خرانٹ شخص تھا اسے تو یہ معلوم تھا کہ اس کی بیوی اور بیٹا محرم علی

اس کے بڑے بیٹے علی بخش کے خلاف ہر وقت محاذ باندھے رکھتے تھے۔ پھر بھی وہ لاتعلق بنا خاموش رہا...... شوہر کو خاموش پا کر خیراں اسے اپنی بات کی اثر پذیری سمجھی اور دوبارہ چلتر پنے سے بولی۔ ''میں تو کہتی ہوں تو...... علی بخش کو شام میں اپنے ساتھ لگا لے اور محرم کو صبح کے وقت ہوٹل بھیج دیا کر......''

اس بار دودا خان سے نہ رہا گیا اور وہ فوراً بولا...... ''کیوں...... تیرا محرم اتنا ہی پارسا ہے اس کا ایمان نہیں ڈول سکتا کھلی کمائی کے آگے......''

شوہر کی بات پر خیراں کو جیسے آگ لگ گئی ...... وہ جلتے ہوئے بھنا کر بولی۔

''ہاں...... میرا لعل تو تمہیں چور نظر آتا ہے...... اور وہ موا علی بخش تو جیسے ایمان کے صافے باندھے رکھتا ہے اپنے سر پہ...... ہونہہ......''

''اچھا...... اب بند کر اپنی بکواس...... علی بخش اور محرم علی...... دونوں میری اولاد ہیں...... میں انہیں جانتا ہوں کون کتنے پانی میں ہے......'' دودا خان نے بیوی کو جھڑکتے ہوئے کہا اور خیراں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

☆======☆======☆

''اڑے بابا منشی میرل......''

''حاضر سائیں بھوتار......''

''بابا اس حور پری کا پتہ کیا...... وہ پچاس ہزار روپے والی۔''

''ہاؤ سائیں! اس چھوکری کا نام اللہ رکھی ہے اور وہ اڑیں سوڈھل کی بھتیجی ہے......'' منشی میرل نے وڈیرے میر لکھ میر خان کو اپنی گرانقدر معلومات سے نوازتے ہوئے کہا اور وڈیرے کی شکرے جیسی آنکھوں میں ایکا ایکی ایسی چمک عود کر آئی جیسے اپنے شکار کو سہل جان کر کسی شکاری کی آنکھوں میں اتر آتی ہے۔

''ہالا بابا...... پھر کچھ سوچ منشی میرے بارے میں بھی......'' وڈیرے نے معنی خیز لہجے میں منشی سے کہا......

منشی میرل کمینے پن سے مسکراتے ہوئے بولا...... ''ہا سائیں...... میں آپ کا غلام...... بس سوڈھل کو لائن پر لگانا پڑے گا......''

''اڑے بابا تو پھر لگاؤ اس کو لائن پر......'' وڈیرا جلدی سے بولا...... اس کی غلافی آنکھوں میں ایکا ایکی سرخ اتر آئی تھی۔

''ہا سائیں برابر...... اس کے لیے میں نے خانو دھچر کو تیار کیا ہے......'' منشی مستعدی

سے بولا تو وڈیرے نے قدرے چونک کر نام دہرایا...... ''خانو دھچر؟''

''ہاؤ سائیں! وہی خانو دھچر جس کا ہمارے پاس بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔'' منشی میرل نے مزید وڈیرے لکھ میر خان کو بتایا۔ ''وہ ابھی ہماری اصل رقم تو کیا سود بھی پورا نہیں دے سکا ہے اور دے بھی نہیں سکتا۔ وہ اب ساری عمر اپنی ادھیڑ عمر بہن فضلاں کے ساتھ ہماری رہا کی کرتا رہے گا...... ساری حیاتی ہماری غلامی میں رہنے والا بھلا کیسے ہماری بات رد کر سکتا ہے۔''

''منشی ذرا کھل کر بتا تو کیا کرنا چاہتا ہے۔'' وڈیرے نے قدرے الجھ کر کہا۔

''سائیں معاف کرنا...... بس آپ کو کام سے غرض ہونی چاہئے میں آپ کا خادم ہوں۔ آپ کیوں اپنے دماغ کو تھکاتے ہو۔ مجھے تھوڑی مہلت دو...... آپ کا ''کام'' ہو جائے گا جلدی۔'' منشی خوشامدانہ لہجے میں بولا اور وڈیرے کا سر دھیرے دھیرے اثباتی انداز میں ہلنے لگا۔

☆======☆======☆

علی بخش اب صحیح معنوں میں ''دھندے'' اور ''روزی'' کی اہمیت کو سمجھا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اب ہوٹل میں مصروف کر لیا تھا...... ادھر اس کی سوتیلی ماں اور بھائی محرم کی چیرہ دستیاں بھی عروج پر تھیں...... مگر علی بخش انہیں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ جان بوجھ کر اس کے حصے کا کھانا ''گول'' کر دیا جاتا تھا...... اور جو پھل وغیرہ آتے تھے ان کا تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا...... غرض علی بخش کو اب اپنے گھر کا صرف پانی پینا ہی ملتا تھا لیکن اسے اس کی بھی چنداں پروانہ تھی۔ وہ اس کی کسر ہوٹل سے پوری کر لیا کرتا تھا...... اپنے لیے اسپیشل کھانا تیار کروا کر کھاتا حتیٰ کہ ناشتہ اور رات کا کھانا بھی اب وہ وہیں کھانے لگا تھا۔ اس نے باورچی کو خرچی پانی دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا...... مگر یہ سب کچھ وہ چوری چھپے نہیں کرتا تھا۔ ایک دن اچانک اس بات کو محسوس کرتے ہوئے دودا خان نے علی بخش سے استفسار کیا۔

''پٹ علی بخش! تو گھر پہ کھانا نہیں کھاتا؟''

اس وقت علی بخش ہوٹل سے دوپہر کو واپسی پر گھر پہنچا تھا اور وہ سب صحن میں بچھی بڑی سی چارپائی پر کھانے میں مشغول تھے۔ خیراں نے یونہی علی بخش کی طرف دیکھا جب اسے بھی اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا تو گڑبڑا کر اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

''گھر پر میرے لیے روٹی ہی نہیں بچتی اسی لئے میں ہوٹل میں ہی کھا لیا کرتا ہوں۔''

علی بخش نے قدرے گمبھیر لہجے میں باپ سے کہا تو دودا خان متحیر ہو کر اپنی بیوی خیراں سے

مستفسر ہوا۔

’’خیراں! تو علی بخش کے لیے روٹی نہیں رکھتی؟ ہوٹل کا کھانا تو بے چارے کا پیٹ خراب کر دے گا۔‘‘

خیراں شوہر کی بات سن کر ایک لمحے کو گڑبڑا سی گئی مگر پھر سامنے کھڑے علی بخش کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھنے کے بعد شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ’’اب ایسی بات بھی نہیں کہ میں اس کے لیے روٹی نہیں رکھتی...... خود ہی اسے ہوٹل کا چٹ پٹا کھانا اچھا لگتا ہو تو میں کیا کروں۔‘‘

علی بخش کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ خاموشی سے اندر اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے بحث فضول ہے۔ خود اس کا باپ دودا خان بھی کم ہی الجھتا تھا۔

علی بخش اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پر دراز ہو گیا۔ وہ اب شام تک فارغ تھا۔ ذرا آرام کرنا چاہتا تھا جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی سماعت سے کسی عورت کے معنی خیز انداز میں بولنے کی آواز ٹکرائی۔ بات تو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی البتہ آواز کے آہنگ سے علی بخش نے اندازہ لگایا کہ خاص باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ اسائی ہوئی طبیعت کے ساتھ اٹھا اور باہر نکلنے کی بجائے اندر ہی دروازے پر جھری سے آنکھ لگا کر صحن کی جانب دیکھا تو اسے وہاں چارپائی پر کوئی پڑوسن نظر آئی۔ وہ خاصی ادھیڑ عمر اور تیز قسم کی لگ رہی تھی جو بار بار اپنا سر ہلا کر ہاتھ نچا کر اس کی سوتیلی ماں خیراں سے محو گفتگو تھی۔ علی بخش نے سننے کی کوشش کی تو اسے اس عورت کی آواز ذرا واضح انداز میں سنائی دینےلگی۔

’’میں سچ کہہ رہی ہوں خیراں...... ! خود یہ بات مجھے تیری ہونے والی سوتن اللہ رکھی کی چاچی عنایتاں سے پتہ لگی ہے کہ تیرا مرد دودا خان تیسری عورت کر رہا ہے۔ اسی اللہ رکھی سے جس کا پیو یرقان سے مر گیا تھا۔‘‘

جواب میں علی بخش کو اپنی سوتیلی ماں کی تشویش بھری آواز سنائی دی۔ ’’نی ماسی نوراں...... ! سچ بتا...... تو صحیح کہہ رہی ہے۔‘‘

’’اڑی...... جھوٹے پر مرشد کی لعنت ہووے......‘‘ علی بخش کو نوراں نامی عورت کی آواز سنائی دی۔ ’’اچھا تجھے میری بات پر یقین نہیں آتا تو...... تو اپنے مرد سے پوچھ کے دیکھ لے۔ مجھے یقین ہے وہ یہ بات نہیں چھپائے گا...... پر میرا تجھے یہی مشورہ ہے کہ بجائے اپنے مرد سے جھگڑنے کے انجان بنی رہے اور اسے گھریلو مسائل میں زیادہ سے زیادہ الجھا

دے تو وہ تیسری کرنا بھول جائے گا۔‘‘ علی بخش اس کایاں عورت کے مشورے پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ماسی نوراں چلی گئی۔ علی بخش بھی اپنی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے تئیں یہ اچھا نہیں ہوا تھا کہ اس کی سوتیلی ماں کو باپ کی تیسری شادی کرنے کا پتہ چل گیا تھا۔ اب ظاہر ہے وہ پہلے سے ہوشیار ہو جائے گی۔ بہر طور علی بخش کو آئندہ کے دگرگوں حالات کا ادراک ہونے سے ایک عجیب سی بے چینی نے آ لیا تھا۔

☆======☆======☆

جاڑوں کی چمکیلی دھوپ کچے مکانوں کی منڈیروں پر سرک آئی تھی۔ کچے صحن میں کھری چارپائی پر سوڈھل اور اس کی بیوی عنایتاں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ ایک جانب اللہ رکھی پڑوس کی کترمشین سے چارہ بنا کر کھرلی میں انڈیل رہی تھی جہاں دونوں بیل سانولا اور ہیرا بڑی رغبت سے منہ مار رہے تھے...... اللہ رکھی اپنے کام میں منہمک تھی۔ عنایتاں اپنے گھٹنے چوڑے کئے تذبذب کے عالم میں اللہ رکھی کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ سوڈھل کے چہرے پر بھی عجیب سا اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں خرانٹ میاں بیوی نے آپس میں کسی اہم موضوع پر گفت وشنید کرنی تھی مگر اللہ رکھی کی موجودگی کی وجہ سے بات کرنے سے کترا رہے تھے۔ بالآخر عنایتاں نے اللہ رکھی کو سر دست وہاں سے ’’ٹالنے‘‘ کی غرض سے مخاطب کرتے ہوئے پکارا۔ ’’اللہ رکھی...... !‘‘

’’چاچی...... !‘‘ اللہ رکھی نے جواباً کہا۔

’’جا ذرا مائی فضلاں سے تھوڑا تلوں کا تیل لے آ۔ اپنے گھٹنے کی مالش کر لوں ذرا......‘‘ عنایتاں نے کہا اور اللہ رکھی۔ ’’جی اچھا چاچی۔‘‘ کہتی ہوئی چلی گئی۔

عنایتاں چھوٹتے ہی پُرمسرت لہجے میں اپنے شوہر سوڈھل سے بولی۔ ’’سوڈھل! ماسی نوراں نے اپنا کام کر دیا ہے وہ کل ہی دودا خان کے گھر گئی تھی اور اس کی بیوی خیراں کو اس کے شوہر کی تیسری شادی کے بارے میں بتا آئی ہے...... اب دیکھنا دودا خان اللہ رکھی کی شادی کے سلسلے میں دباؤ نہیں ڈالے گا اور ظاہر ہے پھر تجھ سے اپنے روپوں کی واپسی کا بھی تقاضا نہیں کرے گا۔‘‘

سوڈھل نے اپنی بیوی کی بات بڑے غور سے سنی اور قدرے غیر مطمئن لہجے میں بولا۔ ’’عنایتاں! بات تو تیری درست ہے...... پر اس سے کیا دودا خان اللہ رکھی سے شادی سے باز آ جائے گا...... ؟‘‘

اس کی بات پر عنایتاں چالاکی سے مسکرا کر شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ’’یہ بات تیری

سمجھ میں کیوں نہیں آتی سوڈھل کہ دوداخان نے اپنی تیسری شادی کے بارے میں دانستہ اپنی بیوی کو بے خبر رکھا تھا...... تاکہ اس کی بیوی خیراں اس کے ''کام'' میں رکاوٹ اور گھر میں جھگڑا نہ کھڑا کردے۔''

''یہ بھلا کیا بات ہوئی...... جب دوداخان اللہ رکھی سے شادی کرلیتا تو بھلا اس کی بیوی کو نہیں پتہ چلتا۔'' سوڈھل نے جواز پیش کیا۔

''عین وقت پر پتہ چلنے کی اور بات ہوتی ہے ڑے سوڈھل...... ! عورت مجبور ہوتی ہے وہ رودھو کر خاموش ہو جاتی ہے...... پر تُو اب دیکھنا مجھے یقین ہے خیراں اپنے مرد دوداخان سے جھگڑا تو نہ کرے گی بلکہ اسے اس بات کی بھی بھنک کانوں میں نہیں پڑنے دے گی کہ اسے اس کی رام کہانی کا علم ہو چکا ہے...... وہ اندر ہی اندر دوداخان کو بڑی چالاکی سے گھریلو مسائل وغیرہ میں الجھادے گی۔ میں نے اپنی طرف سے ماسی نوراں کو خوب سکھا پڑھا کر بھیجا تھا کہ اس نے کیا کہنا ہے۔ اب تُو بے فکر رہ اور اس کے دیئے ہوئے پیسوں پر عیش کر، اور مجھے بھی جلد شہر لے جانے کا بندوبست کر، میری طبیعت دن بہ دن خراب ہوتی جارہی ہے۔''

عنایتاں کی صراحت بھری گفتگو پر سوڈھل دم بخود رہ گیا۔ وہ خود کو بڑا چالاک سمجھتا تھا پر آج اپنی بیوی کے تریا چلتر کا بھی دل سے قائل ہو گیا تاہم اسے اپنی بیوی کی شہر ہسپتال لے جانے والی بات قدرے ناگوار گزری تھی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ جواباً اپنی بیوی عنایتاں سے کچھ کہتا، اچانک کسی نے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ ہی اسے پکارا۔

''سوڈھل چاچا...... ! تجھے منشی میرل نے بلایا ہے وڈیرے کی اوطاق میں...... یاد کر لے، میں چلا......''

اس شناسا آواز پر سوڈھل قدرے چونک گیا۔ یہ لائقو ہاری تھا...... لیکن سوڈھل اس پیغام پر تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اسے یوں اچانک منشی میرل نے کیوں بلایا ہے۔ بہر طور پر جانا تو پڑے گا۔ اس نے سوچا اور پھر اوطاق جانے کے لیے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا تو اس کی بیوی عنایتاں یکدم قدرے منت کرنے والے انداز میں شوہر سے بولی۔ ''ڑے سوڈھل! کچھ میرے بارے میں بھی سوچ لے اب...... قسم دھڑیں سائیں کی...... مجھ سے اب درد بالکل نہیں برداشت ہوتا۔''

''ہاؤ...... ہاؤ...... ماٹھ کر ذرا لے جاؤں گا تجھے شہر بھی...... ابھی تو مجھے جانے دے۔'' سوڈھل نے بیوی کی بات پر قدرے چڑچڑاہٹ سے کہا اور باہر گیا نکل۔

☆======☆======☆

سوڈھل گومگو سا وڈیرے کی اوطاق میں پہنچا تو وہاں ایک بڑے سے ہال کمرے میں فرش پر کچھ ہاری بیٹھے سامنے مونڈھے پر براجمان رجسٹر اور قلم تھامے منشی میرل کو کوئی حساب کتاب لکھوانے میں مصروف تھے۔ سوڈھل نے باآواز بلند منشی کو اپنی آمد کی خبر دیتے ہوئے اسے سلام کیا۔ ''سائیں منشی صائب! خادم حاضر ہے۔'' منشی میرل نے اپنی ناک کی پھنگ پر اٹکی ہوئی شفاف عدسوں کی عینک کے عقب سے گدھ جیسی آنکھوں کو قدرے اچکا کر سوڈھل کی طرف دیکھا اور اسے خفیف سے اشارے سے قریب رکھی رلی بچھی چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔ سوڈھل چہرے پر لجاجت کے ڈونڈے برساتا ہوا خاموشی کے ساتھ چارپائی کی جانب بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد منشی میرل ہاریوں کو فارغ کر کے سوڈھل کی جانب متوجہ ہوا۔ ''ہابابا سوڈھل! کیسا ہے تُو بال بچہ تو ٹھیک ہے نا بابا تیرا......''

''ہاں سائیں! دھڑیں سائیں کا کرم ہے۔ اس نے بچے سے تو اب تک محروم رکھا ہے...... پھر بھی مجھے یقین ہے کہ آپ کی دعا سے سب ٹھیک ہی ہوگا۔'' سوڈھل نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

منشی میرل نے جو وڈیرے لکھ میر خان کا مصاحب خاص بھی تھا ایک ہنکاری بھرتے ہوئے اپنے چہرے سے عینک اتاری۔ قلم کان پر اٹکایا، رجسٹر بند کر کے کھڑا ہوا اور اسے خالی مونڈھے پر پھینکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا...... سوڈھل کی چارپائی کی طرف آیا۔ سوڈھل بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا...... تاہم منشی میرل نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ اپنے ساتھ قریب ہی میں بٹھا لیا اور قدرے کھنکارتے ہوئے تاسف آمیز لہجے میں بولا۔ ''سوڈھل! تیری بھی کیا زندگی ہے...... نہ بال نہ بچہ...... بیوی بھی لاش کی طرح ہے۔ میری بات کا برا تو نہیں منایا تُو نے۔'' منشی میرل نے مکاری سے کہا تو سوڈھل منشی میرل کی بات کی گہرائی میں کھو گیا۔ سوڈھل اپنی ادھوری گھریلو زندگی پر اداس سا ہو گیا۔ منشی اس کے چہرے پر آزردگی کی لکیریں دیکھتے ہوئے دوبارہ بولا۔ ''اڑے سوڈھل! تُو تو ایسے ہی دکھی ہو رہا ہے...... مرد اور گھوڑا بھلا کبھی بڈھے ہوئے ہیں...... تُو میری مان تو دوسری شادی کر لے۔ تیرے نام سے زیادہ تو تیری عورت کی بیماری پورے گوٹھ میں مشہور ہو چکی ہے۔ سچ پوچھ تو کچھ لوگ تیری عورت کی اس بیماری کو مرشد کی لعنت بھی کہتے ہیں۔'' منشی میرل نے بڑی فنکاری کے ساتھ سوڈھل جیسے کائیاں شخص کو ناراض کیے بغیر اس قدر غم آمیز جذباتی بنا

دیا کہ اس کی آنکھیں یکدم بھیگ گئیں۔ ''اڑے بس کر...... روتا کیا ہے...... عورتوں کی طرح......'' منشی نے دوستانہ تکلف سے اسے ڈانٹا۔ ''تجھے بلانے کا مقصد میرا ہرگز یہ نہیں کہ تجھے دکھی کروں۔ پتہ ہے کیا...... تُو نے ہماری بہت خدمت کی ہے...... اور اب بھی کر رہا ہے...... بالکل تیری طرح ہمارا ایک رہاک (کھیت مزدور) ہے۔ اچھا نام ہے اس کا...... ہاں یاد آیا...... خانو دھچر...... بے چارہ آج کل اپنی بہن فضلاں کے بارے میں بڑا پریشان ہے۔ بہت محبت کرتا ہے اپنی بہن سے...... بے چاری کو جوانی میں ہی بیوگی کا داغ لگ گیا تھا بچہ کوئی ہے نہیں...... خود بھی اس نے ابھی تک شادی نہیں کی...... کہتا ہے سنگ کے بدلے سنگ دوں گا۔ بس یونہی میرا خیال تیری طرف چلا گیا۔ ویسے تُو ہاں کرے تو بات کروں تیری خانو دھچر سے، اس کی بہن فضلاں کے بارے میں...... تیری بھی تو سنا ہے ایک بھتیجی ہے اللہ رکھی۔'' منشی کہتا چلا گیا اور سوڈھل کسی اور ہی دنیا میں جا پہنچا۔

سوڈھل کو منشی میرل کی باتیں دل پر لگ رہی تھیں کیونکہ وہ اس کے درون خانہ پلنے والی اس سوچ سے میل کھا رہی تھیں کہ اسے بہرحال سہارے کی ضرورت تھی...... لہٰذا بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''منشی صائب! تمہاری باتیں تو درست ہیں لیکن......'' چالاک میرل لوہے کو گرم ہوتا دیکھ کر اس کی بات کاٹتے ہوئے یکدم بولا۔

''سوڈھل تُو راضی ہے تو اس ''لیکن'' کو میرے واسطے چھوڑ دے...... ویسے کوئی مسئلہ ہے تو بتا۔''

''ہاں سائیں مسئلہ تو یہ ہے کہ دوداخان......'' پھر سوڈھل نے اسے ساری حقیقت بتا دی کہ وہ دوداخان سے اللہ رکھی کی بات طے کر چکا ہے...... لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس نے دوداخان کا بندوبست بھی کر لیا۔

''اڑے بابا...... تُو اس کی گڑتی کیوں کرتا ہے۔'' منشی اسے تسلی دیتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''وڈیرا سائیں، بڑا اچھا آدمی ہے...... اپنے رہاکوں کی بڑی مدد کرتا ہے...... تجھے اس کا آشیرواد بھی مل جائے گا...... نہ کر کسی بات کی پروا تُو...... اچھا بول پھر کب ملواؤں تجھے خانو دھچر سے......''

سوڈھل اس کی بات پر قدرے چونکا پھر بولا۔ ''سائیں جب چاہے ملوا دو۔''

''اچھا ٹھیک ہے...... تو ایسا کر کل اسی وقت آنا...... میں خود تجھے لے کر چلوں گا اس کے گھر...... آخر کو اہم بات کرنی ہے اوطاق میں تو نہیں ہو سکتی نا......'' منشی نے کہا اور

سوڈھل گومگو کے عالم میں اپنا سر ہلانے لگا۔

☆======☆======☆

ایک دن سہ پہر کو دوداخان، محرم علی کو ہوٹل چھوڑ کر ذرا جلدی ہی گھر پہنچا تو ٹھٹک سا گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے سامنے صحن میں بچھی چارپائی پر اپنی بیوی خیراں کو پیٹ پکڑے مارے درد کے کراہتے ہوئے پایا تو پُرتشویش انداز میں وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھا۔ ''ڑی خیراں! کیا ہو گیا تجھے......!''

''ہائے دوداخان! میرا آخری وقت آ گیا ہے...... ڈیرہ جونگل سے میرے ماں پیو اور بھراواں کو بلا لے...... آ میں...... مری......'' خیراں درد کی شدت سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے بولی۔ تکلیف کی شدت سے اس نے اپنے دانت بھینچ لئے اور عجیب سے انداز میں کراہنے لگی۔

اس کی حالت پر دوداخان خاصا فکرمند ہو گیا وہ اسے سنبھالنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے استفسار طلب لہجے میں بولا۔ ''خیراں...... کچھ تو بول کیا ہوا ہے تجھے...... کیا پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔'' مگر جواباً اب خیراں آنکھیں موندے نیم مردنی کی حالت میں اپنا سارا بدن ڈھیلا چھوڑے اکھڑی اکھڑی سانسیں لینے لگی اب دوداخان کی تشویش عروج پر پہنچ چکی تھی...... خیراں بہرحال اس کی بیوی تھی...... اس نے علی بخش کو آواز دی مگر وہ گھر پر ہوتا تو نکلتا...... جب علی بخش کو مکان کی کسی کوٹھڑی سے برآمد ہوتے نہیں دیکھا تو دوداخان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مرغ بسمل کی طرح لوٹ پوٹ ہوتی اپنی بیوی خیراں کو کاندھے پر اٹھا کر لادا اور سیدھا حکیم بڈھل کے مطب کی جانب دوڑا۔

دوداخان کو اپنی بیوی کو کاندھے پر لادے، گوٹھ کی کچی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں دوڑتا دیکھ کر چند لوگ بھی از راہ ہمدردی۔ ''اللہ خیر کرے...... دھڑیں رحم کرے۔'' کہتے ہوئے اس کے ساتھ ہو لئے۔

بالآخر دوداخان نے حکیم بڈھل کے مطب میں ہی جا کر دم لیا۔ اتفاق سے حکیم بڈھل وہاں تقریباً فارغ ہی موجود تھا۔

خیراں کو ایک سپاٹ سے تخت پوش پر لٹا دیا۔ حکیم بڈھل بغور کراہتی ہوئی خیراں کو دیکھتا رہا پھر اس کی نبض ٹٹولنے کے بعد دوداخان سے مختصراً کچھ پوچھا۔

حکیم بڈھل ایک منحنی سا شخص تھا۔ اس نے فوری طور پر خیراں کو ایک سیال نما دوا پلائی۔ پھر چند لمحوں تک اس کا معائنہ کر کے ذرا فارغ ہوا تو دوداخان نے تشویش بھرے

لہجے میں پوچھا۔ ''حکیم صاحب کیا ہوا اسے...... یہ چاک (ٹھیک) تو ہو جائے گی نا۔''

حکیم بڈھل جواباً تشفی آمیز لہجے میں بولا۔'' پیٹ میں ایک دم گیس کی گانٹھ بن گئی تھی شاید...... دوا اور کچھ پڑیاں دے رہا ہوں...... پورا ہفتہ اسے مطب لا کر دکھانا ہوگا۔ کیونکہ بعض دفعہ گیس کی یہ گانٹھ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔''

''اچھا حکیم صاحب میں برابر اسے پورے سات دن مطب میں لا کر آپ سے دوائی دارو لیتا رہوں گا۔ ویسے کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے ناں......''

''نہیں ابھی ایسی کوئی بات نہیں۔''

''حکیم صائب کوئی پرہیز وغیرہ......'' آخر میں دودا خان نے پوچھا...... خیراں کی حالت اب کافی سنبھلنے لگی تھی...... حکیم کی دوائی نے بڑی سرعت کے ساتھ اپنی اثر پذیری دکھائی تھی۔

حکیم اسے پرہیز وغیرہ کے بارے میں بتاتے ہوئے بولا...... ''بابا...... اسے چاول...... ماش کی دال، آلو اور بھنڈیاں مت دینا کھانے کو اور نہار منہ اگر ہو سکے تو مریضہ کو دو تین گلاس یا جتنا پی سکے...... رات بھر رکھے گھڑے کا پانی پلاتے رہو اور میری دوائیاں بھی باقاعدگی سے دیتے رہو......''

''وڈی مہربانی حکیم صائب...... سائیں کو کتنا ہدیہ دوں......'' دودا خان نے اپنی جیب سے پیسے نکالتے ہوئے بڑے احترام سے پوچھا۔

''بس اللہ سائیں شفا دے...... یہی میرا ہدیہ ہے۔'' حکیم بڈھل نے آہستگی سے کہا مگر دودا خان نے ایک بڑا نوٹ قریب ہی خاصے چوڑے مونڈھے پر پیچھے گدی کے نیچے پھنسا دیا...... اور پھر بیوی کو واپس گھر لے جانے کے لئے بیل گاڑی ڈھونڈنے مطب سے باہر آ گیا......

☆======☆======☆

حکیم بڈھل کے مطب میں کڑوی کسیلی سی دوا پینے کے بعد خیراں میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مطب سے ساتھ لائی ہوئی دوائی زہر مار کرتی اس لئے کہ اسے کوئی بیماری تھی ہی نہیں...... اس نے تو اپنے شوہر دودا خان کو پریشان کرنے کی مہم کا آغاز کیا تھا جو اسے نوراں سمجھا کر گئی تھی...... اب خیراں نے بڑی شدت کے ساتھ اپنی فنکاری کے جوہر ہر دوسرے تیسرے دن دکھانے شروع کر دیئے تھے...... وہ اچانک اکثر بیماری کے بہانے کبھی دودا خان تو کبھی اپنے بیٹے محرم علی کے ساتھ باقاعدگی سے مطب جانے لگی...... اب

یہ معمول بن گیا تھا کہ جب دودا خان گھر پر موجود ہوتا یا گھر آنے والا ہوتا تو خیراں اچانک اپنے طوفانی قسم کے پیٹ درد کی تکلیف میں مبتلا ہوا کر اینٹھنے لگتی اور بے چارہ دودا خان جیسے تیسے اسے لے کر حکیم بڈھل کے مطب جا پہنچتا...... آخر ایک دن تنگ آ کر حکیم بڈھل نے دودا خان سے خیراں کو شہر کے ہسپتال لے جانے کی ہدایت کی......'' دودا خان...... شہر کے ہسپتال میں بڑی سہولیات ہیں...... یہ مجھے کوئی پیچیدہ مرض ہی لگتا ہے...... وہاں اس کا الٹرا ساؤنڈ ہوگا...... تب ہی اصل بیماری کا پتہ چل سکتا ہے......''

حکیم بڈھل گوٹھ کا پرانا اور تجربہ کار معالج سمجھا جاتا تھا...... اس کی بات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دودا خان اس کی بات پر قدرے متفکر سا نظر آنے لگا......

''میں شہر نہیں جاؤں گی...... وہاں سے تو لاش ہی واپس آتی ہے گوٹھ......'' خیراں نے ایک دن اپنے شوہر دودا خان سے فیصلہ کن لہجے میں کہا...... وہ اس وقت خاصی ''تندرست'' نظر آ رہی تھی...... اور یہی بات دودا خان کو بھی اچنبھے میں مبتلا کر دیتی تھی کہ اچھی بھلی کام کاج میں مصروف خیراں کو یہ کس قسم کا درد اٹھتا تھا کہ وہ بے حال سی ہو جاتی تھی۔ اسے بھلا کیا پتہ تھا کہ خیراں اس کے ساتھ چلتر بازی کر رہی ہے...... بہرطور...... پھر بھی دودا خان نے اسے شہر کے بڑے ہسپتال چلنے کو کہا تو وہ نہ مانی جواباً دودا خان نے دوبارہ کہا۔'' دیکھ خیراں تیری بات غلط ہے کہ وہاں سے لاش ہی آتی ہے...... زیادہ تر لوگ شفا پا کر ہی آتے ہیں شہر کے بڑے ہسپتال سے......'' مگر خیراں پھر بھی نہ مانی تو دودا خان بھی چپ ہو رہا۔

☆======☆======☆

اگلے دن سوڈھل خلاف معمول علی الصباح جاگ گیا تازہ پانی کے چھینٹے چہرے پر مارے اور بوسیدہ سی پرانی اونی چادر ڈھانپے سردی سے ٹھٹھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

فضاء دبیز کہر کے زیر اثر بالکل دھندلی ہو رہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لالو نائی کی دکان پر پہنچا...... بال ترشوائے...... شیو بنوائی اور گھر لوٹ آیا گھر آتے ہی اس نے اللہ رکھی کو نیند سے جگایا اور چولہے پر نہانے کے لیے پانی گرم کرنے کو کہا اور ٹھٹھرتا ہوا اپنی کوٹھڑی میں آ گیا...... بے چاری اللہ رکھی پریشان سی ہو گئی کہ آج یہ اس کے چاچا سوڈھل کو کیا ہو گیا ہے جو صبح صبح پُراسرار قسم کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ بہرطور حکم حاکم مرگ مفاجات کے تحت اللہ رکھی آنکھیں مسلتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی...... اُپلوں کی کھلی اور بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی سے بھرا ہوا کنستر جلد ہی دھواں چھوڑنے لگا تو سوڈھل نے نہانا شروع کر

دیا...... نہا دھو کر اور نئے کپڑے بدل کر...... جب وہ بالکل تیار ہو گیا تو اسی وقت اللہ رکھی اس کے لیے چائے اور پاپے لے آئی تو دنگ رہ گئی...... سوڈھل چاچا کی تو ٹور ہی بدلی ہوئی تھی۔ گنتی کے دانتوں میں خواب مسواک رگڑی ہوئی تھی۔ کھچڑی سے بالوں کو تیل لگا کر الٹا کنگھا پھیرا ہوا تھا...... اور تو اور آنکھوں میں سرمے کی لکیر اس پر سوا تھی۔ سوڈھل کی جانب دیکھتے ہوئے اللہ رکھی کی آنکھوں میں حیرت سی سمٹ آئی تھی تاہم وہ جلدی سے چائے وغیرہ اس کے سامنے رکھ کر چلی گئی۔

ہلکے پھلکے ناشتے سے فارغ ہو کر سوڈھل باہر نکل آیا...... دور مشرق کی سمت پو پھٹ رہی تھی...... چہار سو کہرا پھیلا ہوا تھا...... وہ خراماں خراماں چلتا ہوا اوطاق جا پہنچا...... ''منشی میرل سے ملنا ہے مجھے......'' وہاں ایک کھری چار پائی پر بے سدھ سوئے ایک کمدار کو ہلاتے ہوئے پوچھا...... جو محض ''اوں...... آں......'' کر کے دوبارہ خراٹے لینے لگا...... اسے سوتا دیکھ کر سوڈھل کو بھی جانے کیوں جمائیاں سی آنے لگیں۔ قریب ہی ایک اور آدمی کھری چار پائی پر موٹا سا بوسیدہ لحاف پڑا ہوا تھا...... سوڈھل نے سوچا...... منشی آئے گا تو آخر کار اسی اوطاق میں؟ کیوں نہ ادھر ہی تھوڑا آرام کر لینا چاہیۓ۔ یوں وقت بھی کٹ جائے گا...... بس پھر کیا تھا یہ سوچ کر سوڈھل جب کھری چار پائی پر لحاف اوپر لئے لیٹا تو اس کا یہ ''تھوڑا آرام'' گھنٹوں پر محیط ہو گیا...... آنکھ کھلی تو کوئی اسے جھنجھوڑ کر اٹھا رہا تھا...... یہ اوطاق کا کمدار رہا کو موالی تھا۔ ''اٹھو بابا...... دن چڑھ آیا ہے۔'' اس نے کہا اور سوڈھل یک دم آنکھیں مسلتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر بعد منشی میرل بھی آ گیا...... کچھ ہاری ہاتھ باندھے اس کے عقب میں تھے...... انہیں بھگتانے کے بعد میرل اور سوڈھل اوطاق سے نکلے۔ باہر سفید رنگ کی پوٹھوہاری جیپ موجود تھی۔ اس میں سوار ہو کر یہ لوگ ایک جانب چل پڑے مختصر سے دورانئے کے سفر کے بعد جیپ ایک کچے مگر قدرے کشادہ مکان کے سامنے رک گئی...... وہاں ایک سانولی رنگت کی عورت اپلے تھاپ رہی تھی...... وہ پینتیس چالیس کے پیٹے میں تھی اور مذکورہ گھر کی مکین ہی معلوم ہو رہی تھی کیونکہ جیپ کو رکتے دیکھتے ہی وہ تیزی کے ساتھ اندر چلی گئی۔ منشی میرل شاید اس کو پہچانتا تھا اس لیے چند ثانیے کھڑا رہا۔

اگلے ہی لمحے اس عورت کی اطلاع پر ایک ٹھگنے سے قد کا کالا بھجنگ شخص نمودار ہوا...... اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے ابھی وہ منشی میرل کے قدموں پر اپنی ناک رگڑنی شروع کر دے گا۔ اس کی عمر چالیس سے متجاوز ہی تھی...... وہ ''سائیں بھلیکار......

بھلیکار'' کہتا ہوا منشی میرل اور سوڈھل سے مصافحہ کرنے کے بعد ہاتھ جوڑ کھڑا ہو گیا۔

''اڑے خانو دھچر! بھلا کھمبے کی طرح کیا کھڑا ہو گیا ہے تُو اندر نہیں لے کر چلے گا کیا......؟'' میرل نے جھٹکے دار لہجے میں کہا اور خانو دھچر نامی شخص ایک بار پھر فرش راہ ہو گیا اور بولا۔

''کیوں نہیں سائیں مٹھا! سر آنکھوں پر آؤ آپ نے تو میرے غریب خانے کو رونق بخشی ہے...... آؤ...... آؤ سائیں۔''

پھر وہ دونوں خانو دھچر کے ہمراہ اس کے گھر کی چوکھٹ پار کرتے ہوئے اندر آ گئے...... اور کچے صحن میں ہی رلی بچھی چار پائیوں پر براجمان ہو گئے۔ ایک جانب پھونس کے چھپر تلے بھینسیں جگالی میں مصروف تھیں...... اندرونی دیواروں پر بھی اپلے تھپے ہوئے تھے اور ایک عجیب ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ منشی نے بمشکل اپنے چہرے کے ناگوار تاثرات چھپا رکھے تھے...... وہ بہت برداشت کر رہا تھا...... یہی وجہ تھی وہ بوتل کے جن کی طرح کھڑے خانو دھچر سے چھوٹتے ہی بولا...... ''اڑے بابا خانو...... کسی شے کی لوڑ نہ کرنا ہم ذرا جلدی میں ہیں...... بابا...... یہ سوڈھل ہے جس کی میں نے تجھ سے بات کی تھی...... اور سوڈھل یہ خانو دھچر ہے...... بہت اچھا انسان ہے...... اب ایسا ہے کہ تم دونوں ادھر ہی بیٹھ کر جو باتیں کرنی ہیں کر لو...... میں چلتا ہوں...... مجھے پھر بعد میں اوطاق میں آ کر باری باری اپنی مرضی کے بارے میں بتا دینا...... اور کسی بات کی گڑتی نہ کرنا......'' یہ کہتے ہوئے منشی اٹھ کھڑا ہوا اور خانو دھچر اسے روکتا ہی رہ گیا مگر وہ مصروفیت کا عذر پیش کرتے ہوئے چلا گیا۔

''اور سنا بھا سوڈھل کیسے ہو...... مجھے لگتا ہے میں نے تجھے دیکھا ہے۔'' بالآخر خانو نے گفتگو کی ابتداء کرتے ہوئے کہا اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے باآواز بلند بولا...... ''ڑی فضلاں...... چاں پاڑیں (چائے وغیرہ) لے آ ادھر ہی...... ہاں بھا سوڈھل اور سنا......''

سوڈھل نے اس کی بات پر پہلے ذرا ترچھی نظروں سے رسوئی کی جانب دیکھا پھر بولا...... ''بھا خانو...... ظاہر ہے ایک ہی گوٹھ کے ہم رہنے والے ہیں...... دیکھے بھالے ہیں بھلے کبھی ہم آپس میں ملے نہ ہوں پر جانتے تو ہیں نا کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کو...... ویسے مولا سائیں کا کرم ہے...... زندگی مڑی گزر رہی ہے......''

سوڈھل کی بات پر خانو دھچر اثبات میں سر ہلانے لگا اور بولا...... ''ویسے اپڑاں وڈیرا سائیں بڑا اچھا آدمی ہے...... اپنے رہاکوں کا بڑا خیال رکھتا ہے کوئی بھی مسئلہ ہو فوراً

حل کرنے کی کوشش کرتا ہے......''

اس کی بات سن کر سوڈھل بھی گفتگو کو آگے بڑھانے کی غرض سے اس کی تائید میں بولا......''ہاؤ خانو...... تیری بات درست ہے...... ویسے منشی سائیں بھی اچھا ہے...... میں نے اسے اپنی پریشانی کیا بتائی کہ فوراً بے چارہ فکر مند ہو گیا اور......''اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی...... کیونکہ اگلے ہی لمحے فضلاں چائے وغیرہ کے برتن اٹھائے وہاں آ گئی اور چارپائی پر رکھ کر سر جھکائے واپس چلی گئی...... سوڈھل کی دزدیدہ نظروں نے مذکورہ عورت کو فوری بھانپتے ہوئے اندازہ لگایا تھا کہ وہی عورت تھی جو کچھ دیر پہلے باہر دیواروں پر اپلے تھاپ رہی تھی اور بلاشبہ یہ خانو دھچر کی وہی طلاق یافتہ ادھیڑ عمر بہن تھی جس کے بارے میں منشی میرل اسے بتا چکا تھا۔ ''اچھی ہے''......سوڈھل کے اندر کسی نے معنی خیز انداز میں سرگوشی کی......اور وہ چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تو ٹھیک کہتا ہے بھائی سوڈھل!'' خانو اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا......''میں نے بھی اپنی ایک پریشانی کا ذکر منشی صاحب سے کیا تھا...... اور تمہارے بارے میں بھی اس نے مجھے بتایا تھا...... یہ بسکٹ تو اٹھانا بھائی سوڈھل۔'' خانو نے دانستہ اپنی ہی بات کاٹتے ہوئے سوڈھل سے کہا۔

''ہاں بھاؤں خانو...... میری بھی پریشانی تم سے مختلف نہیں......'' سوڈھل سامنے پلیٹ میں رکھے سستے قسم کے بسکٹ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا...... وہ دونوں اب بتدریج اپنے مطلب کی بات پر آ رہے تھے۔

''پریشانی کیا ہے؟ بس گھر بسانے والی بات ہے...... گھر والی کے بغیر گھر...... گھر نہیں لگتا...... بچپن میں ماں باپ مر گئے...... میری یک ہی بہن تھی...... یہی فضلاں...... بے چاری کا نصیب ہی ایسا نکلا کہ گھر والا بری عادتوں میں پڑ کر جانے کہاں غرق ہوا کہ آج برسوں بیت گئے مگر اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا...... پھر کسی گوٹھائی ہمراہ کے ذریعے پتہ چلا کہ مرادے (فضلاں کا شوہر) کو پولیس مقابلے میں گولی چاٹ گئی ہے...... بہن کو بیاہنے کے چکر میں، میں نے بھی اب تک شادی نہیں کی۔ سوچتا ہوں کوئی ایسا رشتہ ملے جو سنگ کے بدلے میں سنگ دے دے......'' خانو دھچر اتنا بتا کر چپ ہو گیا۔

سوڈھل بغور ہمہ تن گوش تھا۔ معاً رسوئی میں سے خانو کی بہن فضلاں کے ہولے سے کھانسنے کی آواز ابھری تو یونہی سوڈھل کا بھی جی کھنکارنے کو چاہا مگر کچھ سوچ کر اس نے اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ ادھر خانو اب اپنی سنا کر سوڈھل کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

پھر سوڈھل نے اس کی گھورتی ہوئی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہنا شروع کیا......

''بھائی خانو! تو ٹھیک کہتا ہے کہ گھر والی کے بغیر گھر گھر نہیں لگتا...... لیکن ذرا تصور کر گھر والی ہوتے ہوئے بھی مرد کو تنہا زندگی گزارنی پڑ جائے تو کتنی مصیبت ہوتی ہے۔ میری بیوی ایک موذی بیماری میں مبتلا ہو کر چارپائی سے لگ گئی ہے...... اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا ہے...... میری ایک ہی بھتیجی ہے اللہ رکھی...... بیاہنا چاہتا ہوں اسے...... لیکن وہی تیرے والی بات کہ میں بھی اپنا گھر بسانا چاہتا ہوں...... میرا مطلب ہے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں...... اب سوچتا ہوں اپنی اللہ رکھی کے بدلے میں سنگ ہی لوں اپنے لئے......''

''بات تو پھر صحیح ہے ہم دونوں ٹھیک ٹکرے ہیں......'' خانو جھٹ سے درمیان میں بولا......''بول پھر کیا کہتا ہے...... اس نیک کام میں اب نہ دیر ہونی چاہئے نہ زیادہ سوچنا...... میری بہن فضلاں کو تو تُو دیکھ ہی چکا ہے...... ضرور تیری اللہ رکھی بھی اچھی ہو گی۔ آگے تیرے مرضی......'' سوڈھل اس کی بات پر کچھ سوچتے ہوئے اپنا سر ہولے ہولے ہلانے لگا۔

''کیا سوچ رہا ہے بھاؤں سوڈھل......!'' خانو نے دریافت طلب لہجے میں پوچھا تو بالآخر مکار سوڈھل اپنے دل کی بات زبان پر لے ہی آیا۔

''مجھے کوئی اعتراض تو نہیں پر...... میری مالی حالت آج کل کچھ ٹھیک نہیں...... اس لئے میں سوچ رہا تھا کوئی ایسا سنگ مجھے بدلے میں ملے جس میں مجھے سنگ کے ساتھ اوپر بھی کچھ مل جائے کیونکہ خانو بھائی دیکھو نہ مجھ غریب کا گزارا یہی چند جریب زمین پر ہاری کرنے پر ہے اس لئے تھوڑی مالی مدد لینا تو میرا بھی حق ہے۔ آخر میری جوان کنواری دھی ہے......'' سوڈھل نے آخری الفاظ پُرزور لہجے میں ادا کئے تھے گویا ان کی اہمیت جتانے کی کوشش کر رہا ہو۔

خانو دھچر اب لالچی سوڈھل کو کچھ کچھ سمجھنے لگا...... وہ اس کی بات پر پہلے تو چند ثانیے خاموش رہا پھر ایک ہنکاری اپنے حلق سے خارج کرتے ہوئے سوڈھل کو مخاطب کر کے بولا......''سوڈھل! بے شک تُو اوپر کا حق دار ہے...... میرے پاس تو بس یہی کچھ ہے جو تُو دیکھ رہا ہے...... ہاں تجھ سے میں بھی نہیں چھپاؤں گا کچھ...... میری بہن فضلاں کے نام چھوٹا سا زمین کا ٹکڑا ہے...... وہی تجھے مل سکتا ہے......''

''واہ...... زمین کے ٹکڑے کی بات پر حریص سوڈھل کے اندر مسرت کی لہر سی اٹھی...... زن بھی اور زمین بھی...... اور مجھے کیا چاہئے......'' اس کے اندر کسی نے خوشی سے

کہا...... مگر سوڈھل نے دانستہ اپنی مسرت کا اظہار نہیں کیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پلڑا اس کا بھاری ہے...... وہ یونہی کچے صحن کی اپلوں سے تھپی ہوئی دیواروں کو دیکھنے لگا...... اسی لمحے خانو...... معذرت کر کے ذرا دیر کے لیے...... وہیں صحن کے ایک کونے میں بنی سرکنڈوں کی آڑ میں چلا گیا...... جو حوائج ضروریہ کے طور پر مستعمل تھا۔ اس کے وہاں سے ٹلتے ہی ایک بار پھر باورچی خانے سے فضلاں کے کھنکارنے کی آواز ابھری اور بے اختیار سوڈھل کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں...... پھر اس نے دیکھا فضلاں وہاں سے برآمد ہوئی اور اس کی جانب آنے لگی۔ شاید وہ چارپائی پر رکھے چائے وغیرہ کے خالی برتن اٹھانے آ رہی تھی۔

سوڈھل اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھنے لگا...... فضلاں قریب آ کر ذرا جھکتے ہوئے اس کے آگے سے برتن سمیٹنے لگی...... اس کا چہرہ سوڈھل کے چہرے کے بالکل قریب ہو گیا تھا اس کی سانولی رنگت اور پکی عمر کے باوجود اس میں اب بھی ایک ایسی کشش پائی جاتی تھی جو دھڑکتے دل کو ایک لمحے میں کئی بار دھڑکا کر رکھ دیتی تھی۔ اس کے بھرے بھرے گالوں میں سوڈھل کو ایک عجیب سی کشش انگیز چمک نظر آئی۔

پھر واپس مڑتی ہوئی فضلاں نے بھی سوڈھل کی جانب دیکھا اور اسے محو دید پا کر ہلکی سی مسکان ہونٹوں پر پھیلائے واپس جانے لگی تو سوڈھل کی نظروں نے رسوئی تک جاتی فضلاں کا تعاقب کیا...... ایکا ایکی سوڈھل کو یوں لگا جیسے وہ جوان ہونے لگا ہو...... اسے اپنے دل پر عرصے سے چھایا ہوا گلیشئر پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا...... اتنے میں...... خانو دھچر سرکنڈوں کی آڑ سے کھانستا ہوا برآمد ہوا۔ پھر اس کے بعد دونوں میں کوئی خاص بات نہ ہوئی بجز اس کے کہ انہیں اب پہلی فرصت میں منشی میرل کو اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں آگاہ کرنا تھا۔

سوڈھل ایک موقع پرست شخص تھا...... اسے ہر لحاظ سے خانو دھچر کے ساتھ رشتے داری گانٹھنے میں فائدہ نظر آ رہا تھا...... لہٰذا اس نے فوراً اوطاق پہنچ کر منشی میرل کو اپنی ''مرضی'' کے بارے میں آگاہ کرنا ضروری سمجھا نیز خانو دھچر کی زمین کے ٹکڑے والی بات بھی گوش گزار کر دی اور مزید پُرزور لہجے میں بولا...... ''منشی سائیں! خیال رہے خانو دھچر کہیں اپنی زبان سے مکر نہ جائے......''

''اڑے نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے ہمارے ہوتے ہوئے......'' منشی میرل نے اسے تسلی دی اور پوچھا...... ''پھر تجھے قبول ہے نا بابا......''

''ہاؤ سائیں! مجھے انکار نہیں ہے۔'' سوڈھل نے پُرزور لہجے میں جواب دیا اور منشی

میرل نے اسے مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھ سوڈھل! اب تو دودا خان اور ساون وغیرہ سے جلد پیچھا چھڑا لے بلکہ میں تو کہتا ہوں انہیں اب زیادہ آسرے میں رکھ ہی نہیں...... صاف جواب دے دے......''

سوڈھل اس کی بات پر...... تشویش آمیز سوچ میں غلطاں ہو گیا۔

''کیا سوچتا ہے بابا سوڈھل......'' معاً میرل نے اسے چونکایا...... ''اڑے بابا تُو ڈرتا ہے کیا ان سے؟ بس کہہ دینا بھوتار سائیں کا کوئی خاص ماڑوں (آدمی) تھا...... اور وڈیرے سائیں کے کہنے کو میں نہیں ٹال سکتا بس...... گھبراتا کیوں ہے تُو بابا...... ہم تمہارے ساتھ ہیں...... بس اب جا اور بے فکر ہو جا......''

سوڈھل مطمئن ہو کر چلا آیا...... وہ اس بات پر خوش تھا کہ اسے اس سلسلے میں وڈیرے سائیں کا بھی آشیرواد حاصل تھا۔ اب کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ نہیں سکتا...... بھلے اب وہ دودا خان کو بھی صاف جواب دے دے...... انہی خیالوں میں غلطاں جب وہ اپنی گلی کے نکڑ پر پہنچا تو سامنے نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔

سامنے سے دودا خان آ رہا تھا...... سوڈھل نے اگلے ہی لمحے خود کو سنبھال لیا اور اپنے چہرے پر بے رخی سی طاری کر لی۔ دودا خان اسے دیکھ چکا تھا...... وہ قریب آتے ہی اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا...... ''سوڈھل! میں تیرے گھر سے آ رہا ہوں...... تُو آج کل ملاقات ہی نہیں کر رہا...... میرا خیال ہے تُو شہر بھی نہیں گیا ہے اب تک بھاجائی کو لے کر علاج کے واسطے......''

سوڈھل نے اس کی بات سنی اور سپاٹ سے لہجے میں بولا...... ''ہاں...... کچھ کام ہو گیا تھا اس لیے نہیں جا سکا......''

''سوڈھل! میرے کام کا کیا ہوا......؟ میرا خیال ہے ہوٹل ہی چلتے ہیں وہی آرام سے بات کرتے ہیں......'' دودا خان بغور سوڈھل کے سرد چہرے کو تکتے ہوئے بولا تو اس بار سوڈھل نے قدرے رکھائی سے کہا۔

''دودا خان! اب مل کر بیٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں......''

''کیا مطلب......؟'' دودا خان کے لہجے میں ایکا ایکی درشتگی اتر آئی...... مگر سوڈھل اسے ذرا بھی خاطر میں نہیں لایا اور بولا...... ''اس لیے کہ اب اللہ رکھی کا سنگ وڈیرے سائیں کے ایک خاص آدمی نے مانگ لیا ہے...... اور خود وڈیرے نے......''

''سوڈھل......! تُو جانتا ہے کیا کہہ رہا ہے!'' معاً دودا خان اس کی بات کاٹتے

ہوئے دھاڑ کر بولا...... ''تُو نے پہلے مجھے زبان دی تھی...... ''اس نے جیسے یاد دلایا۔

''مجھ سے زیادہ اونچے لہجے میں بات نہ کر دودا خان...... ''سوڈھل بھی جواباً غراتے ہوئے بولا...... منشی میرل کے ذریعے وڈیرے کی حمایت حاصل ہوتے ہی سوڈھل کا تو رویہ ہی یک دم بدل گیا تھا۔

''جانتا ہوں میں اچھی طرح تُو کس کے بل پر اکڑ رہا ہے...... لیکن یاد رکھنا سوڈھل...... میرا نام بھی دودا خان ہے...... اور اللہ رکھی...... میرے لئے اب میری غیرت کا معاملہ بن چکی ہے...... تجھے ہر حالت میں اب اس کا سنگ مجھے ہی دینا ہوگا۔'' دودا خان غیظ آلود لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں ایکا ایکی شعلوں جیسی تپش عود کر آئی تھی...... مگر سوڈھل اس کے غیظ وغضب کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لایا...... اور اٹل لہجے میں گویا اس سے جان چھڑانے کی غرض سے بولا۔

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں دودا خان کہ تُو میرے بارے میں کیسے اندازے قائم کرتا ہے...... اور نہ ہی مجھے اس بات کی پروا ہے کہ تُو میرا کچھ بگاڑے گا...... میں نے وڈیرے سائیں کے آدمی کو زبان دے دی ہے۔ اب تُو نے جو کہنا ہے...... اوطاق جا کر وڈیرے سائیں سے کہہ...... میرے آگے اب مت آنا......'' سوڈھل دیدہ دلیری سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا اور دودا خان عالم طیش میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں یوں بھینچنے لگا جیسے اس میں سوڈھل کی گردن دبی ہوئی ہو...... وہ اپنی جگہ کھڑا قہر آلود نگاہوں سے سامنے جاتے ہوئے سوڈھل کو گھورے جا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دغا باز سوڈھل کا یہیں خاتمہ کر دے۔

☆======☆======☆

''بھوتار سائیں مبارک ہو آپ کا کام تو بڑے سچل طریقے سے انجام پا رہا ہے......'' منشی میرل نے سامنے آسریں کی چارپائی پر حریری گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے نیم دراز وڈیرے میر لکھ میر خان سے قدرے خوشامدانہ لہجے میں کہا تو وڈیرا کھنکھراتے ہوئے بولا۔

''منشی...... آدمی تو تُو میرا وڈا اپکا ہے...... یہ تو بتا...... خانو دھچر سے تُو نے بات تو کر لی ہے نا...... ایسا نہ ہو کہ عین وقت پر رکاوٹ کھڑی کرے میرے لئے......''

''نا سائیں نا...... اس بے چارے رہاک کی کیا مجال جو آپ کے شوق کے آڑے آئے۔ ویسے میں اسے طریقے سے راستے پر لے آؤں گا...... پہلے ذرا اس حور پری اللہ رکھی کو اس کی بیوی تو بننے دو...... بھوتار سائیں......'' منشی میرل نے معنی خیز لہجے میں کہا

اور وڈیرا لکھ میر خان اس کی جانب دیکھ کر اپنی گھنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے عجیب انداز میں مسکرانے لگا۔

☆======☆======☆

شام کا وقت تھا...... اللہ رکھی پانی کا کلسا تھامے پانی بھرنے گئی ہوئی تھی...... اور کچے صحن میں بچھی کھری چارپائی پر لیٹی ہوئی چاچی عنایتاں مارے تکلیف کے دہری ہوئے جا رہی تھی اور کراہتے ہوئے بمشکل اپنے شوہر سوڈھل کو پکارے جا رہی تھی...... ''ہائے رے سوڈھل! مجھ پر رحم کر...... میری تو جان منہ کو آ گئی ہے ہائے...... میرا دل بھی بیٹھنے لگا ہے اب تو......''

سوڈھل اندر کوٹھڑی میں موجود تھا...... چند لمحوں بعد وہ وہاں سے برآمد ہوا تو اس کی وضع قطع ہی بدلی ہوئی تھی، اس نے نئے کپڑے...... اور نئے جوتے پہن رکھے تھے...... تازہ شیو بنائی ہوئی تھی...... گنے چنے بالوں میں تیل لگا کر الٹا کنگھا پھیرا ہوا تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی کے ساتھ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سامنے چارپائی پر درد کے مارے دہری پڑی اپنی بیوی عنایتاں کی طرف دیکھا اور اس کی سنی ان سنی کرتا ہوا...... گھر کی چوکھٹ پار کر کے باہر آ گیا...... گھر سے باہر نکلتے نکلتے اسے اپنے کانوں میں اپنی بیوی کی بددعا سنائی دی......

''ڑے سوڈھل! بے رحم...... دھڑیں کرے تجھے گھر کی چوکھٹ دوبارہ نصیب نہ ہو......''

مگر سوڈھل ایک تضحیک آمیز ''ہنہ'' اپنے منہ سے خارج کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

شام کجلا رہی تھی...... سردی میں آج اتنی کاٹ نہ تھی...... اگرچہ سوڈھل نے ہلکا پھلکا اونی سوئیٹر پہن رکھا تھا...... وہ خانو دھچر کی طرف جا رہا تھا...... فضلاں کا سراپا ہنوز اس کے تصور میں جاگزیں تھا...... گلی خاصی ویران تھی...... وہ اپنی ہی دھن میں مگن خوش آئند خوابوں کے تانے بانے بنتا ہوا خراماں خراماں جا رہا تھا کہ اچانک پُرسکوت فضا گولی چلنے کے دھماکے سے گونج اٹھی...... اور سوڈھل کو اپنی کمر میں انگارے بھرتے ہوئے محسوس ہوئے...... اس کے حلق سے اذیت ناک چیخ نکلی اور وہ بھربھری زمین پر لہرانے لگا...... اسی وقت...... ایک اور فائر ہوا اور دوسری گولی اس کی گردن میں پیوست ہو گئی...... حیرت انگیز طور پر سوڈھل سخت جان واقع ہو رہا تھا دو گولیاں پیوست ہونے کے باوجود وہ موت سے بچنے اور زندگی کی جستجو میں اپنے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر پھیلائے دائیں بائیں ڈول رہا تھا...... اچانک پھر تیسری اور سر میں لگنے والی گولی نے اس کا بھیجہ اُڑا دیا...... اور وہ تیورا کر زمین بوس ہوتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

سوڈھل کی خون میں لت پت اور خاک آلود لاش کے گرد کافی لوگ جمع ہو چکے تھے...... کچھ کمزور دل حضرات سوڈھل کے عبرتناک انجام پر اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر توبہ تلا کر رہے تھے۔ نامعلوم قاتل اپنا ''کام'' کر کے جائے وقوع سے کب کا فرار ہو چکا تھا۔

''اڑے بابا یہ تو آپڑاں سوڈھل ہے۔'' وہاں موجود ایک شخص سوڈھل کی لاش کو پہچانتے ہوئے بولا۔

''لگتا ہے اسے ''کارو'' کر کے مارا ہے کسی نے۔'' ایک جوان سے شخص نے بے رحمانہ تبصرہ کیا۔

''بھلا اسے اس عمر میں کون کارو کر سکتا ہے؟'' ایک دوسرے شخص نے خیال ظاہر کیا۔

''واہ ڑے تیری عقل کو بھی سلام ہے۔ اڑے یہاں تو بوڑھی عورتیں تک ''کاری'' کر دی جاتی ہیں۔''

''یہ تم لوگ کس بیکار کی باتوں میں الجھ گئے ہو۔ ضروری نہیں یہ ''کارو'' ہی ہوا ہو۔ کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔'' کسی اور نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

ایک پختہ العمر شخص آگے بڑھا اور مجمعے کو مخاطب کر کے بولا۔ ''تھانے بھی کسی نے اطلاع کی ہے یا ایسے ہی اپنی اپنی ہانکنے میں لگے ہوئے ہو۔''

اس کی اس بات پر پورے مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا چونکہ یہ قتل کی واردات تھی اس لئے لاش کو پہچانتے ہوئے بھی کوئی اس کے قریب نہیں پھٹک رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس پختہ العمر شخص کی بات پر وہاں موجود لوگوں کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

تاہم چند ثانیے کے سکوت کے بعد ایک شخص نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ماما سائیں! تھانے بھلا کون اور کیوں اطلاع دے گا۔ جا کر پھنسنا ہے کیا کسی نے تھانے کچہری کے چکروں میں۔'' مذکورہ شخص نے جیسے وہاں موجود لوگوں کو نصیحت کی اور وہ سب اس کی نکتہ آفریں بات پر اپنے سروں کو ہولے ہولے اثبات میں جنبش دینے لگے اور پھر جیسے اس پختہ العمر شخص کو بھی اس المیے کا ادراک ہوا اور بالآخر بولا۔

''اڑے بابا کم از کم اس کے گھر والوں کو تو اطلاع کر دو اور اوطاق میں بھی وڈیرے سائیں کو خبر کر دو تو اچھا ہے۔ ویسے بھی اس کا گھر کون سا دور ہے۔''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ ایک اور بولا۔ ''ماما سائیں! اس بدنصیب کے گھر فیضو کو

پہلے ہی سے بھیج دیا گیا ہے۔''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ محلے کی چند عورتوں کے ساتھ اللہ رکھی اور اس کی چاچی عنایتاں روتی پیٹتی وہاں آن موجود ہوئیں۔ پھر تو وہاں جیسے روزِ محشر کا سا منظر بپا ہو گیا۔ اللہ رکھی اور چاچی عنایتاں، سوڈھل کی لاش پر باقاعدہ بین کرنے لگیں۔ یہ منظر خاصا رقت آمیز ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

ٹھٹھرتی ہوئی سرمئی شام دھیرے دھیرے رات کے پُر ہیبت اندھیروں میں مدغم ہو رہی تھی۔ ایسے میں بوسیدہ سی موٹی رلی کی بکل مارے وہ شخص کچے اور نیم پختہ گھروں کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے تیز تیز گزرتا ہوا بالآخر گوٹھ کے قبرستان کی طرف جانے والے کچے راستے پر ہو لیا۔ اس کی حرکات و سکنات خاصی مشکوک تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اپنے اردگرد چوروں جیسی نگاہ ڈال رہا تھا۔

قبرستان کی طرف جاتے ہوئے راستے پر دبیز کہرا چھایا ہوا تھا۔ اب قبرستان کی حد شروع ہو چکی تھی۔ سامنے جابجا جھاڑ جھنکاڑ سا پھیلا ہوا تھا۔ خودرو پودوں کی بہتات تھی۔ کیکر اور لئی کے ٹنڈ منڈ بوجھل سے درختوں کی جٹاؤں ایسی شاخیں قبروں پر آسیب کی طرح جھول رہی تھیں۔ معاً وہ شخص ایک ٹوٹی پھوٹی سی قبر کے پاس آ کر رک گیا۔ ماحول میں گہرا سکوت طاری تھا۔ اس شخص نے اپنے اردگرد دیکھا۔ پھر رلی کے پیچھے سے اس کا ہاتھ برآمد ہوا جس میں پستول دبا ہوا تھا۔ پھر بڑی سرعت کے ساتھ اس نے وہ پستول ٹوٹی پھوٹی قبر کے اندر پھینک دیا۔ وہ قبر اتنی پرانی اور خستہ حالت میں تھی کہ اس کے اندر خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

آخری تاریخوں کے چاند کی دھیمی روشنی میں وہ شخص اپنا کام نمٹا کر واپس پلٹا۔ اب اس کا رخ دوبارہ گوٹھ کی جانب تھا۔ چند فرلانگ پر واقع گوٹھ کے قبرستان سے واپس گوٹھ کی طرف لوٹنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اب وہ واپسی پر اپنا راستہ بدلتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر ذرا دیر بعد وہ دودا خان کے ہوٹل پہنچ چکا تھا۔ ہوٹل میں وی سی آر چل رہا تھا۔ لوگ کسی فلم میں پوری طرح مگن تھے۔ رلی پوش مشکوک شخص سیدھا کاونٹر کے ''دخل'' پر بیٹھے دودا خان کی طرف بڑھا۔ دودا خان اس وقت روپوں کی گنتی کر رہا تھا۔ محرم علی کو آج اس نے جلدی گھر بھیج دیا تھا۔

''بابا چاں پینی ہے میں نے۔'' اس رلی پوش نے دودا خان سے دھیرے سے کہا اور

تب دوداخان کی نظریں اپنے ہاتھ میں دبے روپوں سے ہٹ کر ایک دم اس رلی پوش پر پڑیں تو اسے دیکھ کر دوداخان ذرا چونکا پھر اس کے چہرے کے تاثرات سے یوں لگا جیسے وہ اس رلی پوش ہی کا منتظر تھا۔ بہرحال اس نے فوراً اسے اپنے قریب کے اسٹول پر بٹھا دیا اور محتاط نظروں سے ہوٹل میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ پھر قدرے دھیمے لہجے میں قریب بیٹھے رلی پوش سے پوچھا۔ ''کام ہوگیا؟''

''ہاں'' رلی پوش نے مختصراً کہا۔

''شاباش۔ کسی نے دیکھا تو نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی پیچھے تو نہیں لگا تیرے؟'' دوداخان نے پھر پوچھا۔ لہجہ ہنوز دھیما ہی تھا۔

''جس وقت میں نے اپنا کام کیا اس وقت کوئی گلی میں موجود نہ تھا۔ اسی لئے مجھے چپکے سے نکلنے کا موقع مل گیا۔'' رلی پوش نے کھردرے سے لہجے میں جواب دیا۔ اس نے اب رلی کو اپنے چہرے سے قدرے سرکا دیا تھا مگر اب بھی وہ دوسروں کو یہ تاثر دے رہا تھا جیسے وہ کوئی بیمار اور مدقوق سا شخص ہو۔

''تجھے یقین ہے پورا کہ سوڈھل مر چکا تھا؟'' دوداخان نے معاً کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاسائیں! اسی لئے تو میں نے تیسری اور آخری گولی اس کے سر میں لگائی تھی۔ بھیجہ باہر کر دیا تھا اس تیسری گولی نے۔'' رلی بہ دوش کے لہجے میں حد درجے سفاکی اتر آئی تھی۔

''آلۂ قتل؟'' دوداخان جیسے ہر طرح سے اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا۔

اس کی بات سن کر رلی بدوش بولا۔ ''اسے قبرستان میں ایک ٹوٹی پھوٹی مگر گہری قبر میں پھینک آیا ہوں۔''

دوداخان کا چہرہ اب جوش سے ایکا ایکی تمتمانے لگا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کسی اندرونی جبلت کو تسکین سی مل رہی ہو۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی تھی۔ اس نے رلی بہ دوش شخص سے مزید کچھ نہیں پوچھا اور چائے لانے کے لیے پیش گار کو گھنٹی بجادی۔

☆======☆======☆

گوٹھ داد پور کی آبادی تھی ہی کتنی، بمشکل چند سو نفوس۔ یہی وجہ تھی کہ سوڈھل کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرف پورے گوٹھ میں پھیلتی چلی گئی۔ گوٹھ کے برسوں پرانی پیلی

عمارت والے تھانے میں کچھ لوگوں نے ہمت کرتے ہوئے اجتماعی طور پر اطلاع دے دی تھی اور وہاں موجود ایک قدرے منحنی سے تھانہ انچارج انسپکٹر ارشد لاشاری نے اپنے ہمراہ چند کانسٹیبل لئے اور وقوعے والی جگہ پہنچ کر ضابطے کی کارروائی نمٹاتے ہوئے چند لوگوں سے کچھ سوالات کئے۔ پھر سوڈھل کے گھر پہنچ کر اللہ رکھی اور مقتول سوڈھل کی بیوہ چاچی عنایتاں سے بھی بہ طور خانہ پُری تفتیش کی اور واپس تھانے آ کر...... کیس کی فائل دور ٹیبل پر پٹخ دی اور میز پر دونوں ٹانگیں پھیلا کر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ بھلا اسے کیا ضرورت تھی ایسے ''اندھے معاملے'' میں اپنا سر کھپانے کی کہ جس میں نہ کسی کے خلاف رپورٹ درج کروائی گئی تھی اور نہ ہی کسی پر سوڈھل کو قتل کرنے کا شبہ ظاہر کیا گیا تھا اور تو اور اسے قاتل کو جلد سے جلد پکڑ کر سزا دلوانے کی عاجزانہ درخواست بھی نہیں کی گئی تھی۔

انسپکٹر ارشد لاشاری ایسے کیسوں کو ''آرام طلب'' کیس کا نام دیتا تھا۔ مگر یہ اس کا خام خیال ہی نکلا کیونکہ اگلے دن صبح ہی اسے وڈیرے میر لکھ میر خان کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وڈیرے سے اس کے خاصے دوستانہ بلکہ ''بے تکلفانہ'' تعلقات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بلاوا آتے ہی وہ وڈیرے کی اوطاق جا پہنچا۔ اسے دانستہ تنہا اور سادہ کپڑوں میں بلایا گیا تھا لہٰذا تھوڑی دیر بعد وہ وڈیرے کے سامنے والے سرکنڈوں کے بنے مونڈھے پر براجمان محو کلام تھا۔ اس وقت وڈیرے سمیت اس کا مصاحب خاص منشی میرل بھی موجود تھا۔

''اڑے بابا انسپکٹر صاحب! لگتا ہے تم نے تو سوڈھل کے قتل والا معاملہ ہی دبا دیا ہے۔'' چند ثانیے خاموشی کے بعد وڈیرے نے کھرکھراتی آواز میں انسپکٹر ارشد لاشاری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر انسپکٹر ارشد ذرا چونکا اور پھر ہولے سے سانس خارج کر کے کہنا شروع ہوا۔ ''وڈیرا سائیں! ہم نے اس سلسلے میں پوری تفتیش کی تھی اور کافی محنت بھی...... لیکن مقتول کی ایک زنانی اور اس کی بھتیجی غالباً اللہ رکھی نام تھا اس کا، وہ کسی پر شبہ ہی نہیں کر پا رہیں...... اب آپ ہی بتائیں سائیں ہماری تفتیش کی گاڑی کو جب تک شبے کی پٹڑی نہیں ملے گی تو وہ کیسے آگے بڑھے گی۔''

''کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو۔ پر تم کو اس معاملے میں اب ذرا ذاتی دلچسپی لینی پڑے گی۔'' اس بار وڈیرے نے قدرے معنی خیز لہجے میں کہا اور منحنی سے ارشد لاشاری کے چہرے پر باریک سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سائیں! آپ حکم کرو، کس پر ڈنڈا گھمانا ہے۔ میں آج ہی سے شروع ہو جاؤں

گا۔‘‘

’’یہ ہوئی نا یاروں والی بات۔‘‘ وڈیرہ کھرکھراتے لہجے میں قدرے خوشدلی سے بولا۔

’’سائیں! ہم آپ کے خادم، حکم کرو۔‘‘ انسپکٹر ارشد نے کہا تو وڈیرے نے اپنی گھنی بھنوؤں تلے آنکھیں سکیڑ کر کہا۔

’’اس کا نام دودا خان ہے اور ویسے بھی مجھے اسی پر شبہ ہے۔‘‘

’’شبے کی کوئی خاص وجہ؟‘‘ انسپکٹر ارشد نے کسی خیال کے تحت پوچھا اور اس کی بات پر وڈیرے میر لکھ میر خان کے چہرے پر یک دم ایک رنگ سا آ کر منجمد ہو گیا اور وہ عجیب سی نظروں کے ساتھ انسپکٹر ارشد کو تکنے لگا۔ پھر ارشد کو بھی شاید اپنی کہی بات کا جلد احساس ہو گیا اور وہ بات بناتے ہوئے ترنت بولا۔ ’’میرا مطلب یہ تھا سائیں کہ اگر آپ وجہ بتا دیتے تو ہم آسانی سے بہت جلد اپنے مطلوبہ شخص یعنی مجرم تک پہنچ سکتے تھے۔‘‘

اس کی بات سن کر وڈیرے نے اپنے حلق سے ایک معتدل سا ہنکارا نکالا اور سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ’’تمہاری بات درست ہے۔‘‘ پھر وہ انسپکٹر ارشد کو دودا خان پر اپنے شبے کی مفصل وجہ سمجھانے لگا۔

☆======☆======☆

سوڈھل کو قتل ہوئے تیسرا دن تھا۔ ٹھٹھرتی ہوئی سرد رات جیسے سسکتی ہوئی دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ اللہ رکھی اور عنایتاں چاچی دونوں گرم لحاف اوڑھے ایک ہی چارپائی پر سوگوار سے بیٹھے تھے۔ کمرے میں بلب کی بیمار سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اللہ رکھی کی سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ اتری ہوئی تھی جب کہ چاچی عنایتاں لیٹی ہوئی ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ شوہر کے قتل کے بعد وہ بالکل ادھ موئی ہو کر رہ گئی تھی۔ گہرے غم واندوہ کے باعث کبھی کبھی اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی کراہ نکل جاتی۔ دکھ کی پرچھائیاں جیسے اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔ حتیٰ کہ کمرے کے در و دیوار بھی ماتم کناں محسوس ہو رہے تھے۔ سامنے کی کھری چارپائی پر محلے سے آئے ہوئے کھانے کے برتنوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے انہیں چھونے کی بھی کوشش نہیں کی گئی ہو وہ ویسے کے ویسے چارپائی پر پڑے تھے۔ دو دن سے ایک لقمہ بھی ان کے حلق سے نہیں اتر سکا تھا۔ عذر خوئی (تعزیت، پُرسا) پر آنے والی محلے کی عورتوں نے انہیں کچھ کھلانے پلانے کی بھی سعی کی تھی مگر بے سود۔

’’دھیئے! تُو ہی کچھ کھا لے۔‘‘ معاً کمرے کی غمناک فضا میں چاچی عنایتاں کی لرزیدہ سی آواز ابھری۔ شوہر کی موت کے بعد اس کا رویہ حیرت انگیز طور پر بدل گیا تھا۔

اللہ رکھی چاچی عنایتاں کی بات پر اپنی آب گریہ سے تر آنکھوں کو چادر کے گوشے سے پونچھتے ہوئے بولی تو اس کی آواز رقت آمیز ارتعاش سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ’’چاچی! میرا جی نہیں کر رہا۔ تُو بول تو تجھے کھلا دوں۔‘‘

’’نہیں دھیئے! ہائے کاش میں نے اس کو بددعا نہیں دی ہوتی۔ مجھے کیا معلوم تھا میری زبان اتنی کالی ہوگی۔ ہائے ڑی میرے سر کا سائیں چلا گیا۔ ہائے میرا گھر دھڑیں (مجازی خدا)‘‘ چاچی عنایتاں اب باقاعدہ بین کرنے لگی اور اللہ رکھی سسکتی ہوئی اس کے سرہانے سرک آئی اور اسے سنبھالتے ہوئے بولی۔

’’چاچی! مت رو۔ چاچی۔ میرا آپڑاں (اپنا) دل بھی بیٹھا جا رہا ہے۔‘‘

’’ہائے۔ دھیئے! اب ہمارا کیا بنے گا۔ ہم تو سوڈھل کے بعد اکیلے رہ گئے اس دنیا میں ڑی۔‘‘

چاچی عنایتاں کے نالہ و فغاں سے اللہ رکھی کا دل اور گھبرانے لگا۔ چاچا سوڈھل کی اچانک موت نے اسے بھی غمزدہ کر دیا تھا وہ جیسا بھی تھا، تھا تو اس کا چاچا جس کی صورت میں اسے اپنے باپ کی شبیہہ نظر آتی تھی۔ چاچا سوڈھل کو یاد کرتے ہوئے اس بے چاری کو وہ اندھیری اور سرد رات بھی یاد آ گئی۔ جب وہ اور چاچا سوڈھل اس کے بیمار باپ کو بیل گاڑی میں ڈالے بہ غرض علاج شہر لے جا رہے تھے اور اس کا راستے ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ سوڈھل کے مرنے کے بعد یہ بھیانک اور گھناؤنا راز بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا کہ وہ جسے اپنا چاچا سمجھتی آ رہی تھی وہ درحقیقت اس کے باپ کا قاتل تھا۔ بہرطور سوڈھل مکافاتِ عمل سے دوچار ہو چکا تھا۔

’’دھیئے! مجھے اپنی گڑتی نہیں ہے...... تیری ہے۔ میرے بعد تیرا کیا بنے گا؟ میں تو خود بیمار رہتی ہوں۔‘‘ چاچی عنایتاں کی آہ و فغاں جاری تھی۔

’’چاچی تیکوں رب دا واسطہ ایسی بات نہ کر تجھے کچھ نہیں ہوگا تُو ٹھیک ہو جائے گی۔ میں خود تجھے شہر وڈے ڈاگدر کے پاس لے جاؤں گی۔‘‘ اللہ رکھی اپنی چاچی کو حوصلہ دیتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔ تو بے اختیار چاچی عنایتاں اس کی بات پر زار و قطار رونے لگی۔

’’ہائے ڑی دھیئے! تُو نے آج مجھے اولادوں جیسی خوشی دے دی۔ آج میری اپنی کوئی اولاد ہوتی تو وہ بھی یہی کہتی۔ اللہ رکھی تُو میری دھی ہے...... ناں۔ معاف کر دینا مجھے،

میں نے تیرے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔'' چاچی عنایتاں کی رقت انگیز باتوں نے اللہ رکھی کا دل چیر کر رکھ دیا اور وہ اس سے بے اختیار لپٹتے ہوئے، رو کر کہنے لگی۔

''چاچی! میں تیری دھی (بیٹی) ہی تو ہوں۔ تیری صورت میں مجھے ماں ہی دکھائی دیتی ہے۔''

چاچی عنایتاں کو آج جانے کیوں شرمساری اور ندامت کا بھی دکھ نڈھال کیے دے رہا تھا۔ پھر کافی دیر تک کوٹھڑی نما کمرے میں دونوں کی غمناک سسکیاں گونجنے لگیں۔ کمرے کا محدود ماحول ایک بار پھر ماتم کا سا منظر پیش کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

دور نارنجی پڑتے مغربی افق پر اتحاد اور تنظیم کا درس دیتی ہوئیں پرندوں کی یکساں اور ہموار ڈاریں محوِ پرواز تھیں۔ دور تک پھیلے ہوئے چاولوں کے کھیتوں میں ''سٹک'' جاری تھی...... کہیں کہیں ہاری لوگ ''دیرہ'' کر چکے تھے اور اب چنوں، مٹروں اور گندم وغیرہ کی ''پھٹک'' جاری تھی۔ ایک جانب ٹیڑھے میڑھے کچے راستوں پر جو سیدھا رائس واہ کی طرف جاتا تھا۔ اللہ رکھی کلسا پہلو میں دبائے، اداس اداس سی بوجھل قدموں کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس نے ایک موڑ کاٹا اور پھر کن انکھیوں سے اطراف کے گرد و دور کھیتوں میں کام سے فارغ ہو کر لوٹتے ہوئے ہاریوں کی جانب دیکھا اور پھر ایک ذیلی پگڈنڈی پر مڑ گئی جو رائس واہ کے اونچے کراڑے تک چلی جاتی تھی۔ یہاں کیکر، ڈھینگر اور آسریں کے پیڑوں کی بہتات تھی۔ گوٹھ کی عورتیں پانی کے گھڑے اور کلسے اٹھائے آ جا رہی تھیں۔ اگرچہ ان کی تعداد اب شام ہونے کی وجہ سے کم ہوتی جا رہی تھی۔ اللہ رکھی خاموشی سے کراڑے کو پار کر کے نہر کے کنارے سے اپنا گھڑا بھرنے لگی۔ وہ جانتے بوجھتے ہوئے دیر کر رہی تھی وہاں اکا دکا اور بھی عورتیں اپنا گھڑا بھر رہی تھیں۔ دو ایک نے از راہ ہمدردی چاچا سوڈھل کی موت پر اظہارِ افسوس کیا اور لوٹ گئیں۔

آخر میں اللہ رکھی اپنا گھڑا اپنی لچکیلی کمر کے خم میں اٹکائے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ وہ خاصی مضطرب نظر آ رہی تھی۔ چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کی شدت سے منتظر ہو...... اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ایک لئے کے تنے سے ساون اچانک طلوع ہو کر اللہ رکھی کے سامنے آ گیا اور اسے اپنے سامنے دیکھتے ہی اللہ رکھی نے فرطِ جذبات سے اپنا پانی سے بھرا گھڑا ایک جانب رکھا اور بے اختیار ساون سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ''ساون! میرا چاچا سوڈھل گزر گیا۔ میں تو اب بالکل یتیم و بے سہارا ہو گئی

ہوں۔'' وہ گہرے دکھ اور رندھے ہوئے لہجے کے ساتھ بولی۔

ساون اس کے دکھ اور اندوہ کو محسوس کرتے ہوئے ملائمت بھرے لہجے میں بولا۔

''نہیں اللہ رکھی! ایسا مت بول۔ میں ہوں نا تیرا۔ کیا تو مجھے اپنا نہیں سمجھتی؟''

''نہیں ساون! تو ہی اب میرا سب کچھ ہے، میری ساری حیاتی کا سنگی۔ تجھے اپنا سمجھ کر ہی تو آنسو بہا رہی ہوں تیرے سامنے۔'' جواباً اللہ رکھی نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

ساون کا دل پسیج گیا وہ اللہ رکھی کے نازک وجود کا ارتعاش اور اس کی سرمگیں آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی نمی کو اپنے شانوں پر صاف محسوس کر رہا تھا۔ اللہ رکھی کافی دیر تک اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتی رہی۔ پھر اس سے علیحدہ ہوئی اور ساون کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ساون! میرا دم اب گھٹنے لگا ہے۔ میں اور زیادہ تجھ سے دور نہیں رہ سکتی۔ مجھے کبھی کبھی بہت ڈر لگتا ہے...... اکیلے پن سے۔ ایک خوف کی سی کیفیت طاری رہتی ہے مجھ پر ہر سمے۔''

ساون اس کی بات کا مطلب بہ خوبی سمجھتا تھا لہٰذا اسے تسلی دیتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ ''اللہ رکھی! توں گڑتی (فکر) نہ کر وہ وقت اب دور نہیں رہا جب ہم ایک ہو کر زندگی گزاریں گے۔ بس ذرا چاچا سوڈھل کا چالیسواں گزرنے دے، میں خود اپنی امڑ کے ساتھ تیری چاچی سے تیرا سنگ لینے آؤں گا۔''

پھر جیسے اچانک اللہ رکھی کو کچھ یاد آیا ہو وہ فوراً بولی۔ ''ساون! تو نے میرے سنگ کے لیے سوڈھل چاچا کو پچاس ہزار بھی تو دیئے تھے۔ پتہ نہیں چاچا نے چاچی کو ان پیسوں کا بتایا بھی تھا کہ نہیں۔ اگر چاچی کو اس کا علم ہوا تو وہ میں اس سے واپس لے کر تجھے دے دوں گی۔''

اس کی بات سن کر ساون ذرا چونکا۔ پھر عام سے لہجے میں بولا۔ ''نہیں اللہ رکھی، اپنی چاچی سے بھلے ان روپوں کا ذکر کر دینا مگر اس سے واپس نہ لینا۔ رہنے دینا بے شک۔''

''لیکن ساون! یہ زیادہ ہیں چاچا سوڈھل نے میرے سنگ کے لیے پچاس ہزار تجھ سے زیادہ مانگ لئے تھے۔ میں پھر ایسا کروں گی کہ دس ہزار رہنے دوں گی باقی تجھے لا دوں گی۔ پتہ ہے ساون! چاچی کا برتاؤ اب مجھ سے کافی اچھا ہو گیا ہے۔''

اب دونوں کے درمیان کچھ دیر پہلے کی چھائی ہوئی کبیدگی زائل ہونے لگی تھی۔ ساون کسی سوچ میں غلطاں تھا۔ اسے خاموش پا کر اللہ رکھی نے دوبارہ کہا۔ ''مجھ معلوم ہے ساون کہ تو نے پچاس ہزار روپے وڈیرے کے منشی سے بھاری ویاج (سود) پر قرض لئے

ہیں۔''

اس بار ساون سے چپ نہ رہا گیا اور جب وہ بولا تو اس کا لب ولہجہ بے لوث محبت کے جذبے سے سرشار تھا۔ ''اللہ رکھی! یہ پچاس ہزار تو بہت معمولی رقم ہے تجھے حاصل کرنے کے لیے تو میں ساری دنیا......''

''لیکن ساون! میں تمہیں مقروض بنا کر تمہارے گلے کا ہار نہیں بننا چاہتی۔'' اللہ رکھی نے اس کی بات کاٹی پھر دونوں میں مزید کوئی گفتگو نہ ہوئی اور اللہ رکھی رخصت ہونے کے لیے زمین سے اپنا گھڑا اٹھانے لگی۔ دور آسمان کی پنہائیوں میں سناٹے دار اندھیرے اتر رہے تھے۔

☆======☆======☆

سوڈھل کی موت کا دودا خان کی بیوی خیراں کو بھی علم ہو چکا تھا اور اس نے بہ ظاہر کلمہ افسوس کا کہنے کے بعد درون خانہ کلمہ شکر بھی بجالائی کہ چلو کچھ عرصے تک سہی، دودا خان کی تیسری شادی کا معاملہ تو ٹلا اور انہیں تو کم از کم چالیس دنوں تک اس کا کوئی ''خطرہ'' نظر نہیں آتا تھا اور خیراں ان دنوں کو مہلت جانتے ہوئے فائدے اٹھانا چاہتی تھی۔ یعنی وہ اب اپنے بیٹے محرم علی کی شادی کے سلسلے میں دودا خان کو الجھانا چاہتی تھی...... مگر اس کے لیے اپنے بیٹے محرم علی کی رائے بھی معلوم کرنا چاہتی تھی لیکن پھر یہ کام ایک دن خود ہی اس کے بیٹے نے حل کر دیا۔

''امڑ گودی! تم بیمار بھی رہنے لگی ہو اور اوپر سے اکیلی پورا گھر بھی سنبھالتی ہو، ضرور تھک جاتی ہو گی۔''

کائیاں خیراں بیٹے کی شوخ سی مکاری پر مسکرا اٹھی اور دل میں خوش بھی ہوئی کہ اچھا ہے بیٹے نے خود ہی اپنی مرضی ظاہر کر دی مگر پھر بھی وہ انجان بن کر بولی ''ہاں پٹ۔ کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ سوچتی ہوں کام کاج کے لیے کوئی ماسی رکھ لوں۔''

محرم علی ماں کے تجاہل عارفانہ کو نہ سمجھ سکا لہٰذا حسب توقع ایک دم بولا۔ ''ماسی کی کیا ضرورت ہے امڑ۔ وہ......'' اس کی بات باعث شرم ادھوری رہ گئی اور تب مسکراتے ہوئے خیراں نے اس کا کان پکڑ لیا اور پوچھنے لگی۔

''یہ بول کہ بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ بڑا آیا میرا خیال رکھنے والا۔'' ماں کی مصنوعی خفگی سے اسے ذرا حوصلہ ہوا لیکن سر دست چپ ہی رہا۔ ''کوئی دیکھی بھی ہے یا مجھ بیمار ہی کو دیکھنی پڑے گی۔'' بالآخر اس کی ماں نے پوچھا تو وہ جھٹ سے بولا۔

''امڑ تجھے ڈھونڈنے کی تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی۔ وہ ہے نا۔ چاچا پریل اس کی دھی ہے۔ بس...... سورٹھ ناں ہے اس کا...... وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔''

اس کی بات سن کر خیراں کچھ سوچنے لگی۔ پریل کے نام پر وہ ذرا چونکی اور پھر جیسے تصور میں اس کا پورا خاندان مع شجرۂ نسب کے...... اجاگر ہونے لگا اور پھر وہ قدرے مطمئن ہو کر اپنے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''ہاں۔ کچھ یاد تو آتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں کبھی بات کروں گی جا کر، تیری سورٹھ...... کے ہاں...... بلکہ تیرے پیو کو بھی ہمراہ لے جاؤں گی۔'' ماں کو رضامند دیکھ کر محرم علی خوش ہو گیا اور بے اختیار ماں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا۔ ''میری اچھی ماں۔'' اور خیراں پیار سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگی۔

☆======☆======☆

''اڑے منشی تیری پکائی ہوئی کھچڑی کی ہنڈیا ہی الٹ گئی اب میرے کام کا کیا ہو گا؟'' وڈیرے لکھ میر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

منشی اور وہ دونوں اوطاق میں اس وقت تنہا بیٹھے تھے۔ منشی میرل سامنے چارپائی پر بیٹھا تھا جب کہ اس کے سامنے سرکنڈوں کی چوڑی پشت گاہ والے مونڈھے پر وڈیرا براجمان تھا۔ اس نے راسلک کا بیش قیمت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ منشی میرل وڈیرے کی بات پر اپنے گول گول عدسوں والے چشمے کے پیچھے سے اپنے الوؤں جیسے دیدے گھماتے ہوئے بولا۔ ''سائیں بھوتار! بے شک سوڈھل بیچارے کی اچانک موت سے آپ کا کام ذرا کھٹائی میں پڑ گیا ہے...... لیکن سائیں! آپ بے فکر رہو میں کوئی اور چال سوچوں گا۔ ویسے آپ کو کچھ دن صبر کرنا پڑے گا۔ آخر کو میٹھا ''پھل'' بھی تو کھانا ہے نا سائیں۔''

''اڑے منشی تو بس آسرے دیئے جا رہا ہے مجھے۔ اچھا ٹھیک ہے...... اس میں تیرا بھی کوئی قصور نہیں۔ ویسے منشی تیرا کیا خیال ہے سوڈھل کے قتل کے کیس میں دودا خان کو پھنسوا کر ہمیں کون سا فائدہ ملے گا۔ ویسے تیری تجویز کے مطابق میں نے پولیس کو دودا خان کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔''

وڈیرے نے اپنی بات ختم کی تو منشی میرل یونہی اپنی عینک درست کرتے ہوئے بولا۔ ''سائیں پھنسوانا کیسا...... ! سوڈھل کو قتل ہی دودا خان نے کروایا ہے۔''

''تم اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔'' وڈیرے نے اس کی بات پر چونک کر پوچھا تو منشی نے ایک ہنکاری بھرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"لگتا ہے سائیں! آپ کو تفصیل بتانی پڑے گی۔ درحقیقت دودا خان سوڈھل کی خوبصورت بھتیجی اللہ رکھی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ سوڈھل کو، اللہ رکھی کے سنگ کے سلسلے میں آدھے سے زیادہ پیسے دے چکا تھا اور لالچی سوڈھل نے موگو ہاری کے جوان بیٹے ساون سے بھی اسی سلسلے میں پورے پچاس ہزار بٹور لئے تھے اور متواتر اس نے دونوں کو آسرے پر لگایا ہوا تھا۔ میں دودا خان کو جانتا ہوں وہ بڑا پھڈے باز آدمی ہے۔ سوڈھل نے اپنی بے وقوفی میں آکر اسے ضرور دوٹوک لفظوں میں اللہ رکھی کا سنگ دینے سے انکار کر دیا ہوگا اور جوشِ انتقام میں دودا خان نے اسے پھڑکا کر رکھ دیا ہوگا۔" منشی میرل چند لمحے کے لیے خاموش ہوا۔

وڈیرا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے گہری سوچ میں غلطاں تھا وہ شاید منشی کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اس نے منشی کے خاموش ہوتے ہی پوچھا۔ "منشی! آخر تمہیں ان باتوں کا کیسے علم ہوا؟"

"سائیں وڈا! آخر آپ کا پرانا خادم اور نمک خوار ہوں جو بھی کام کرتا ہوں دل اور دماغ لڑا کر کرتا ہوں۔ بھلا ان ساری باتوں کا پتہ چلانا میرے لئے کون سا مشکل کام ہے۔"

"اچھا۔ اچھا آگے بول۔" وڈیرا شاید اب اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

"ہا سائیں! میں کہہ رہا تھا کہ......" منشی نے جدھر سے اپنی بات منقطع کی تھی وہیں سے جوڑ کر دوبارہ کہنا شروع ہوا۔ "اب دودا خان کو پولیس میں الجھا دینے سے ہمارا...... میرا مطلب ہے آپ کا "راستہ" اور "کام" اور بھی صاف ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ دودا خان ہمارے "منصوبے" میں آگے چل کر کاوٹیں ڈالتا۔ ہم نے پہلے ہی اس کا بندوبست کر ڈالا۔ اب میرا خدانخواستہ یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم دودا خان جیسے بوڑھے گدھ سے ڈر رہے ہیں لیکن وہ ذرا دماغ کا کریک ہے۔ جب خود ہی ہمارا کام سہل طریقے سے ہو رہا ہے تو اس سے خوامخواہ الجھنے کا کیا فائدہ...... اب رہا سوال اس چھوکرے ساون کا، تو وہ پہلے ہی ہم سے اتنا بھاری قرض لے کر پھنس چکا ہے کہ وہ ہمارے منہ کو آ ہی نہیں سکتا، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہم پہلے جس مقصد کے لیے خانو دھچر کو استعمال کر رہے تھے اب وہی کام ساون کے ذریعے ہو جائے گا۔" منشی میرل اتنا کہہ کر وڈیرے کی جانب دیکھتے ہوئے چال بازی سے مسکرانے لگا اور وڈیرا لکھمیر خان اسے توصیفی نظروں سے دیکھ کر عجیب انداز میں مسکرایا اور تعریفی لہجے میں بولا۔

"تیرا کام کرنے کا یہی انداز مجھے اچھا لگتا ہے منشی......! کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے......"

منشی اپنی تعریف پر "کھی کھی" کرنے لگا۔

☆======☆======☆

شام سے ہی ہوٹل کے "دخل" پر بیٹھے ہوئے دودا خان کو جانے کیوں اپنا دل گھبراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے اندر عجیب سی بے کلی بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا گھر جا کر ذرا دیر آرام کرنا چاہئے...... اور ابھی وہ کاؤنٹر سے نکل کر باہر ہی آیا تھا کہ اچانک پولیس کی ایک نیلے رنگ کی ڈاٹسن ہوٹل کے قریب آکر رکی اور انسپکٹر ارشد لاشاری کی معیت میں چند سپاہی ڈاٹسن سے اتر کر اس کی جانب تیزی کے ساتھ آنے لگے۔ پولیس کو بڑی پھرتی کے ساتھ اپنی جانب آتے دیکھ کر دودا خان بری طرح ٹھٹک گیا۔ اس کے سان و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ پولیس اتنی جلدی اس کا "جرم" بھانپ لے گی یہ سوچ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جی میں تو آئی کہ فوراً بھاگ اٹھے مگر پھر اگلے ہی لمحے اس نے یہ بچکانہ خیال اپنے دل سے جھٹک دیا اور خود کو ذہنی طور پر اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار کرنے لگا۔

پولیس نے ہوٹل کے احاطے میں پہنچتے ہی دودا خان کو یکدم گھیرے میں لے کر اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں...... دودا خان اپنے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے ڈونگرے برساتے ہوئے احتجاجی لہجے میں انسپکٹر ارشد سے بولا۔ "یہ...... یہ کیا ہے سب۔ مجھے ہتھکڑیاں کیوں لگائی ہیں، میرا جرم کیا ہے؟ انسپکٹر صاحب......" وہ خاصا بوکھلا گیا تھا۔

انسپکٹر ارشد اس کی جانب گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"صدقے تھیاں...... قربان ونجاں...... تیری فنکاری پر...... بندہ پھڑکا کر رکھ دیا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے ہتھکڑیاں کیوں پہنائی گئی ہیں۔ لے چلو اسے تھانے ساری فنکاری اس کی ناک کے راستے نکال دوں گا۔" آخری جملہ انسپکٹر ارشد نے دانت پیس کر دودا خان کو گھورتے ہوئے اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

اور وہ اسے کھینچ کر پولیس ڈاٹسن کی طرف لے جانے لگے تو دودا خان ایک بار پھر احتجاجی انداز میں قدرے چلا کر بولا۔ "آخر مجھے کس جرم میں اور کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

"دودا خان! تمہیں سوڈھل کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔ سیدھی طرح سے تھانے چلتے ہو یا......" انسپکٹر ارشد نے گویا اس پر اپنے تئیں فردِ جرم عائد کرتے ہوئے گرجتی ہوئی آواز ہی میں کہا اور اس کے ساتھ ہی حیران پریشان دودا خان کو پولیس ڈاٹسن میں سوار کر دیا گیا۔ ہوٹل میں موجود سب لوگ اس اچانک افتاد پر دم بخود رہ گئے تھے۔ اس وقت ہوٹل میں دودا خان کا کوئی بیٹا موجود نہ تھا۔

☆======☆======☆

کچے صحن کے در و دیوار پر اداس اور سوگوار سی شام اتری ہوئی تھی...... اللہ رکھی باورچی خانے میں بے دلی کے ساتھ کھانا بنا رہی تھی...... آج صحن میں سکداسی چاولوں کی مہک بھی نہیں رچی ہوئی تھی...... اللہ رکھی نے مٹی کے چولہے پر چڑھی ہوئی مونگ کی پتلی دال کی دیگچی اتاری اور چاولوں کی دیگچی چڑھا کر دم پر رکھ دی۔ اس کے بعد چولہے کی آگ کم کرنے کے لیے اس نے کچھ ادھ جلے دھواں اڑاتے اپلوں کو چمٹے سے پکڑ کر باہر نکال کر انہیں بجھایا پھر باورچی خانے سے نکل کر اندر کوٹھڑی میں آ گئی جہاں ایک چارپائی پر چاچی عنایتاں بیٹھی ہوئی تھی...... اس کا ژولیدہ چہرہ آج بڑے گہرے دکھ کی غمازی کر رہا تھا۔ اللہ رکھی جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی عنایتاں نے بوجھل سی آواز میں اسے قریب بلایا۔ "اللہ رکھی!"

"جی چاچی۔" کہتی ہوئی اللہ رکھی اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی...... عنایتاں گرم موٹی سی رلی اوڑھے بیٹھی تھی۔ پائنتی میلی سی رضائی لپٹی رکھی تھی۔ اللہ رکھی کے چارپائی پر بیٹھتے ہی چاچی عنایتاں نے رلی کے نیچے سے ایک کپڑے کی چھوٹی سی گٹھڑی نکالی...... اور اللہ رکھی کے سامنے اسے کھولنے لگی...... اللہ رکھی خاموشی سے چاچی عنایتاں کو گٹھڑی کھولتے دیکھنے لگی اور جب چاچی عنایتاں نے گٹھڑی پوری کھول دی تو اللہ رکھی ٹھٹک سی گئی...... اس کی نظروں کے سامنے اب بہت سارے نئے اور میلے سے نوٹوں کی گڈیاں بندھی رکھی تھیں...... معاً چاچی عنایتاں افسردہ آمیز آواز میں اپنے سامنے پھیلے ہوئے نوٹوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "اللہ رکھی! یہ نوٹ نہیں ہیں...... یہ سانپ ہیں...... جنہوں نے میرے گھر دھڑیں (سرتاج) کو ڈس لیا...... یہ لے...... میں انہیں رکھنا نہیں چاہتی...... یہ جن کے ہیں انہیں لوٹانا چاہتی ہوں میں۔"

عنایتاں اتنا کہہ کر خاموش ہوئی کمرے میں ایکا ایکی سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

بلب کی کمزور سی روشنی میں اللہ رکھی نے نوٹوں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی چاچی

عنایتاں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "چاچی! تو ٹھیک کہتی ہے...... میں بھی یہی چاہتی تھی...... کہ یہ روپے نہ رکھوں......"

"یہ پورے اسی ہزار ہیں...... میرا خیال ہے اس میں سے 30 ہزار دودا خان اور باقی کا پچاس"...... چاچی عنایتاں یک دم کچھ کہتے کہتے رک گئی اور چور سی نظروں سے اللہ رکھی کی جانب دیکھنے لگی تھی شاید اس میں اللہ رکھی کو یہ بتانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس کے لالچی شوہر سوڈھل نے اس کے سنگ کے عوض دودا خان کے علاوہ ساون سے بھی رقم لی تھی...... اور دونوں کو محض جھوٹے آسرے پر لگا رکھا تھا...... تاہم اللہ رکھی فوراً اپنی چاچی کی خفت بھانپتے ہوئے اسے مزید شرمساری سے بچانے کی خاطر بولی۔

"چاچی میں جانتی ہوں سب...... اور سچے دل سے اپنے چاچا کو معاف کرتے ہوئے اللہ سائیں سے اس کی بخشش کے لیے بھی دعا کرتی ہوں......" یہ کہتے ہوئے اللہ رکھی کی آواز لرز سی گئی اور آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔

عنایتاں نے اللہ رکھی کی بات پر بے اختیار آگے سرک کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی...... کوٹھڑی کے محدود اور سوگوار سکوت میں رونے کی آواز اچھے بھلے انسان کا دل دہلا دینے کے لیے کافی تھی۔

☆======☆======☆

"دودا خان کو سوڈھل کے قتل کے سلسلے میں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔" یہ وہ دوسری اور اچانک خبر تھی جس نے سوڈھل کی موت کی خبر کی طرح ایکا ایکی چار سو پھیل کر لوگوں کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ جب دودا خان کے گھر یہ خبر پہنچی تو خیراں نے یکدم اپنے گھر کے کچے صحن پر بیٹھ کر رونا پیٹنا شروع کر دیا...... اس وقت گھر میں علی بخش اور محرم علی دونوں موجود تھے...... دودا خان کی گرفتاری کی خبر ان کے ہوٹل کے ملازم نے ہی پہنچائی تھی۔ بے چارے دونوں بھائی باپ کی اچانک گرفتاری کی خبر پر حیران و پریشان ہو گئے...... ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں......؟ ماں کو سنبھالیں یا تھانے جا کر باپ کی خبر لیں...... اسی اثناء میں خیراں کے رونے پیٹنے پر محلے کی عورتیں بھی اندر آ گئی تھیں۔

"محرم...... تو یہاں بیٹھ امڑ کے پاس میں تھانے جاتا ہوں......" بالآخر علی بخش نے کہا اور تیزی سے گھر سے نکل گیا۔

وہ گھر سے تھانے جانے کے لیے نکل تو آیا تھا لیکن...... اب یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ وہ وہاں جا کر کیا کر سکے گا؟ پولیس کے جانبدارانہ رویے سے وہ بہ خوبی واقف

تھا۔ پھر اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ وڈیرے لکھ میر خان کے سامنے جا کر اپنی فریاد ڈالے...... آخر کو وہ گوٹھ کا مکھ سردار تھا...... بہر طور...... جب وہ وڈیرے کی اوطاق پہنچا تو اسے وہاں اوطاق میں موجود ملازموں کے سوا کوئی نہ ملا۔ علی بخش وہاں سے مایوس ہو کر سیدھا تھانے کی جانب چل پڑا۔ گوٹھ داد پور کا تھانہ جنوبی سمت شہر جانے والی پکی سڑک کے سرے پر واقع تھا۔

''مجھے انسپکٹر صاحب سے ملنا ہے......'' علی بخش وہاں موجود ایک باوردی سپاہی سے بولا۔

''صاحب اندر نہیں ہے......'' روکھے پن سے کہا گیا۔

''اگر آنے والے ہیں تو میں یہیں بیٹھ کر ان کا انتظار کر لوں......؟'' علی بخش نے پوچھا۔

''کر لو......'' پھر روکھے پن سے جواب ملا...... علی بخش کو اس نامعقول سپاہی کے طرز تخاطب پر غصہ تو بہت آیا مگر وہ ضبط سے کام لیتا ہوا کمرے کے باہر ہی برآمدے کی بوسیدہ سی دیوار سے نصب سنگی بینچ پر بیٹھ گیا۔

شام ابھی پوری طرح سے گہری نہیں ہوئی تھی...... علی بخش کو وہاں صرف دو ہی کمرے نظر آ سکے تھے جن کی چوکھٹ پر چقیں جھول رہی تھیں...... ایک جانب اسے چھوٹا سا سلاخ دار قید خانہ نظر آیا جدھر اسے بھانت بھانت کے کچھ قیدی سالخوردہ سے فرش پر تاش کھیلتے اور سگریٹ کا دھواں اگلتے ہوئے نظر آئے۔

علی بخش کو قریباً نصف گھنٹہ ہو چکا تھا وہاں بیٹھے ہوئے...... وہ اٹھنا چاہتا تھا کہ قید خانے کے قریب جائے کہ اچانک اسے کمرے باہر اٹینشن کھڑے اسی بد دماغ سپاہی کی کرخت آواز سنائی دی وہ اسے درشتگی سے مخاطب کرتے ہوئے بولا...... ''اے چھوکرا بابا ادھر کہاں جا رہا ہے...... تُو...... اندر ہونے کا شوق ہے تو بول......''

علی بخش کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے اور وہ دوبارہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔

ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی...... بالآخر علی بخش کو وہاں بیٹھے بیٹھے رات ہو گئی اور وہ بد دماغ سپاہی بھی کہیں غائب ہو گیا۔ بلکہ سپاہیوں پر مشتمل عملے کی ڈیوٹی بدل گئی تھی...... علی بخش نے نئی ڈیوٹیاں سنبھالنے والوں سے بھی استفسار کیا...... حتیٰ کہ اپنے باپ کے بارے میں بھی پوچھا مگر کسی نے کچھ بتانا تو درکنار سیدھے منہ بات بھی نہیں کی اور نہ ہی کسی کمرے میں

داخل ہونے کی اجازت دی۔

''آخر میں کب تک تمہارے صاحب کا انتظار کروں......؟'' بالآخر علی بخش سے نہ رہا گیا اور وہ آخر تنگ آ کر ایک سپاہی سے بولا...... تو اس کی اس ''بدتمیزی'' پر ایک سپاہی نے اس زور کا چانٹا علی بخش کے گال پر مارا کہ وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑھک گیا۔

''کتے کی طرح چلاتا ہے یہاں...... چل دفع ہو جا یہاں سے......'' مذکورہ سپاہی نے علی بخش کو چانٹے کے ساتھ گالی سے بھی نوازتے ہوئے کہا۔

''چچ...... چچ......'' ایک دوسرا کالا بھجنگ سپاہی عقب سے علی بخش کو تھامتے ہوئے طنزیہ انداز میں پچکارا...... اور اپنے ساتھی سپاہی کو آنکھ مارتے ہوئے بولا...... ''اڑے بخشل...... اس نرم و نازک چھوکرے...... کو کیوں مارتا ہے...... تُو نے اس کے نرم گال پر چانٹا رسید کر کے اچھا نہیں کیا......''

''اڑے مٹھو...... تُو تو ہے ہی پھڈے باز...... جا پھر اس کا کام کر دے...... یہ تیرا کر دے گا......'' بخشل نامی سپاہی نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور وہاں اس اثناء میں آن موجود ہوئے دیگر چند سپاہی معنی خیز انداز میں، مارے خفت اور طیش میں سرخ پڑتے علی بخش کی طرف دیکھ کر ''کھی...... کھی...... کھی......'' کرنے لگے...... بے عزتی اور عزت نفس کی مجروح تصویر بنا علی بخش...... وہاں سے جانے لگا تو قید خانے کے سلاخ دار دروازے کے پیچھے سے ایک قیدی نے بآواز بلند علی بخش سے کہا۔

''ڑے جوان......! یہاں سے چلا جا...... ورنہ یہ سور لوگ مل کر تجھے گندا کر دیں گے...... جا چلا جا......'' وہ قیدی اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ کھڑا علی بخش کو اپنے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہاں سے چلے جانے کو کہہ رہا تھا۔ اسے غالباً علی بخش کی بے بسی اور اس بے حس قانون کے رکھوالوں...... کے ہاتھوں زک اٹھاتے دیکھتے رہا نہ گیا تھا...... مجبوراً علی بخش اپنے اندر کے ابال پر قابو پاتا ہوا تھانے سے بے مراد ہی لوٹ گیا۔

☆======☆======☆

اللہ رکھی چاچی عنایتاں کے اس اقدام سے بہت خوش تھی وہ ساری رقم دودا خان اور ساون کو لوٹا دینا چاہتی تھی...... سب سے پہلے یہ خوش کن اطلاع وہ اپنے محبوب ساون کو دینا چاہتی تھی...... ویسے بھی اللہ رکھی آج بہت خوش تھی اور ساون سے ملنے کو بہت بے چین تھی...... کیونکہ آج چاچی عنایتاں نے اسے ''خاص'' ہدایت دی تھی کہ وہ ساون کو گھر بلائے تاکہ اس کے پچاس ہزار اس کے حوالے کئے جائیں...... اور ان دونوں کے بارے میں

بھی کچھ سوچا جائے۔

اللہ رکھی اپنی چاچی کی آخری بات کا مطلب بہ خوبی سمجھتے ہوئے سرخ ہوگئی تھی اور وہ اب وہ جلد سے جلد ساون سے مل کر اسے دونوں خوش خبریاں سنانا چاہتی تھی کہ تقدیر بعض مرتبہ اس طرح اچانک بھی مہربان ہو جاتی ہے۔

بہر طور...... اللہ رکھی نے جلدی جلدی گھر کے ضروری کام نمٹائے پھر گھڑا اٹھایا...... اور نہر سے پانی بھرنے ...... بہ الفاظ دیگر ساون سے ملنے کے لیے...... اس نے دروازے کی طرف ابھی اپنے قدم بڑھائے ہی تھے کہ معاً دروازے پر کسی نے دستک دی۔

اللہ رکھی دروازے کی جانب بڑھتے بڑھتے ایک لمحے کو ٹھٹک کر رک گئی...... اور سوچنے لگی کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے......؟ تاہم دوسری بار کی دستک پر آگے بڑھی اور دروازے کی اندرونی کنڈی کھول کر دونوں پٹ وا کر دیئے...... پھر سامنے نگاہ پڑتے ہی وہ الجھن میں مبتلا ہو گئی...... اس کے لیے وہ دونوں اجنبی تھے...... جو دروازے کی چوکھٹ کے پار کھڑے اس کی جانب عجیب انداز میں دیکھ کر مسکرا رہے تھے...... ان میں ایک مرد اور دوسری ذرا پختہ عمر کی عورت تھی...... یہ دونوں بہن بھائی خانو ڈھچر اور فضلاں تھے۔

ان دونوں کو دیکھ کر اللہ رکھی ایک لمحے کو ٹھٹکی ضرور مگر فوراً اندازہ لگاتے ہوئے اس نے سوچا کہ مذکورہ دونوں افراد یقیناً اس کے چاچا سوڈھل کی تعزیت کے لیے آئے ہوں گے تاہم اللہ رکھی استفہامیہ نگاہوں سے ان کی جانب تکنے لگی۔ معاً مرد کے ساتھ کھڑی پکی عمر کی عورت جو بلاشبہ فضلاں ہی تھی مسکرا کر اللہ رکھی کو مخاطب کر کے بولی۔ ''ادی...... میرا ناں فضلاں ہے اور یہ میڈا بھراں خانو ہے''۔ فضلاں اچانک کہتے کہتے رکی اور ساتھ کھڑے اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے یوں تکنے لگی جیسے اب اسے بولنے پر اکسا رہی ہو...... خانو ڈھچر...... بہن کا اشارہ پاتے ہی جھٹ سے بولا۔

''سوڈھل سائیں میرا محسن اور دوست تھا...... کیا یہ اس کا ہی گھر ہے......''

''ہا......'' اللہ رکھی نے مختصراً کہا۔

''اور...... تو! اللہ رکھی...... سوڈھل کی بھاتری (بھتیجی) ہے......'' خانو نے تصدیق چاہی...... تو اللہ رکھی ایک کالے اور بدہئیت اجنبی شخص کی زبان سے اپنا نام سن کر ذرا ٹھٹکی...... تاہم اس نے مختصراً ہی جواب دینے پر اکتفا کیا...... ''ہا......'' جواب دینے سے پہلے اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ہمراہ کھڑی اس کی بہن نے اپنے بھائی کو قدرے گھور کر دیکھا تھا۔

''ڑی اللہ رکھی...... کون ہے دروازے پر...... کس سے باتیں کر رہی ہے......'' معاً عقب سے چاچی عنایتاں کی آواز بلند ہوئی اور اللہ رکھی نے جواباً کہا...... ''چاچی کوئی مہمان ہیں...... چاچا کے پُرسے کے لیے آئے ہیں......'' اتنا کہتے ہوئے اللہ رکھی ان دونوں بھائی بہنوں کو اندر آنے کی راہ دیتے ہوئے ایک جانب کھڑی ہو گئی تو وہ دونوں اندر آ گئے...... اندر صحن میں خاصی ٹھنڈ اتری ہوئی تھی...... اللہ رکھی نے اندر کوٹھڑی میں چلنے کا اشارہ کیا...... تو فضلاں اپنے لنگور سے بھائی خانو ڈھچر کو باہر ہی صحن کی چارپائی پر بیٹھ جانے کا کہتی ہوئی اللہ رکھی کے ساتھ اندر کوٹھڑی میں آ گئی...... جدھر ایک کھاٹ پر چاچی عنایتاں بوسیدہ سی رضائی اوڑھے نیم دراز تھی...... جوڑوں کے درد کی تکلیف سے اس کا چہرہ بالکل ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''سلام ماسی......!'' فضلاں نے بڑے مٹھاس بھرے انداز میں چاچی عنایتاں کو سلام کیا...... چاچی عنایتاں کے لیے بھی بلاشبہ وہ عورت اجنبی تھی...... تاہم وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

''آؤ...... آؤ...... بیٹھو...... کم بخت اس جوڑوں کے درد اور بخار نے بالکل ادھ موا کر کے رکھ دیا ہے......''

''ماسی...... آپ کے مڑس (شوہر) کی اچانک وفات کا پتہ چلا...... بہت دکھ ہوا...... وہ میرے بھراں خانو کا پرانا جوڑی دار (لنگوٹیا) دوست تھا...... اسی ناتے ہمارے ہاں آیا کرتا تھا...... ویسے اس کی کسی سے دشمنی تو نہیں ہو سکتی تھی...... وہ تو بہت شریف اور سیدھا سادہ بندہ تھا......'' اس کی تعزیت پر عنایتاں کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات ابھر آئے۔ پھر وہ قریب کھڑی اللہ رکھی کو مخاطب کر کے بولی۔

''دھیئے...... جا...... مہمانوں کے لیے کوئی چاں پاڑیں کر لے......'' متعجب سی کھڑی اللہ رکھی یک دم چاچی عنایتاں کی بات پر چونکی اور واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اسے فضلاں کی بے تکلفانہ آواز سنائی دی......

''نا...... نا...... رہن دے...... چاں پاڑیں کی کوئی لوڑ نہ کر...... بس ہم تو اپنا فرض پورا کرنے آئے تھے...... ایک گوٹھ کے رکھواسی ہیں آخر...... اپنوں کی خبر چاری میں تو آنا ہی پڑتا ہے......''

جانے کیوں اللہ رکھی کو دونوں بھائی بہن ایک آنکھ نہیں بھا رہے تھے شاید اسی لئے کہ ایک تو ان لوگوں کی پہلے سے کوئی شناسائی نہ تھی۔ دوسرے اس عورت کا کالا بھجنگ بھائی

خانو...... اسے انتہائی نامعقول سا لگ رہا تھا...... وہ اسے کبھی کبھار بڑی عجیب وغریب نظروں سے گھورتا اور پھر بڑے معنی خیز انداز میں اپنے کالے اور موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی سجالیتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ہوا...... اللہ رکھی جیسے ہی چاچی عنایتاں کے ایماء پر چائے وغیرہ کے لیے کوٹھڑی سے باہر آئی تو سامنے صحن میں بچھی کھری چارپائی پر بیٹھا ہوا خانو اسے عجیب سی نظروں سے گھور کر مسکرایا...... مگر اللہ رکھی ایک دم اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر کر رسوئی میں چلی گئی...... حالانکہ اب وہ خانو کے سامنے سے ہٹ چکی تھی مگر جانے کیوں رسوئی کی چاردیواری میں بھی اللہ رکھی کو خانو کی تیز نظریں اپنا تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ اسے یہ سوچ کر حیرت ہورہی تھی کہ آخر ان دونوں بہن بھائیوں کی اس کے مرحوم چاچا سودھل سے بھلا کس نوع کی اور کب کی واقفیت تھی...... وہ تعلق داری تو یوں جتارہے تھے جیسے برسوں کی جان پہچان ہو...... اللہ رکھی نے منہ بسور کر سوچا...... اس کا تو چائے بنانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

پھر اچانک اللہ رکھی کو جو چولہے پر چڑھی چائے کی دیگچی پر سر جھکائے بیٹھی تھی...... یوں لگا جیسے کوئی دھیرے دھیرے چلتا ہوا رسوئی کے مختصر سے داخلی راستے پر آکر کھڑا ہوگیا ہو...... اس نے ٹھٹک کر اپنی گردن گھمائی اور سامنے خانو کو دیکھ کر بری طرح چونک پڑی جو اپنی بھدی صورت اور موٹے دیدے پھاڑے اللہ رکھی کو گھورے جارہا تھا۔ اللہ رکھی کو اس کی تیز نظریں اپنے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہوئیں...... وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی...... وہ اس بدہیئت اجنبی مہمان کے بے باکانہ انداز پر غصے سے لال پیلی ہوگئی تھی اور پھر اس سے پہلے کہ اللہ رکھی اس کے ساتھ بری طرح پیش آتی معاً اندر کوٹھڑی نما کمرے سے چاچی عنایتاں کے زور زور سے بولنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ پُرسے کے طور پر آئی ہوئی مہمان عورت فضلاں پر گرم ہورہی تھی اور اسے بری طرح لعن طعن کررہی تھی...... اللہ رکھی اس صورت حال پر پریشان اور متعجب بھی ہوئی کہ آخر ایسی کیا بات ہوگئی تھی فضا یکدم بدمزہ اور مکدر ہوگئی...... اس نے دیکھا خانو بھی چاچی عنایتاں کے زور زور سے بات کرنے پر پریشان اور فکرمند سا نظر آنے لگا تھا یہی نہیں بلکہ وہ اب رسوئی کی چھوٹی سی چوکھٹ سے پرے ہٹ گیا تھا...... اللہ رکھی بھی جلدی سے رسوئی سے باہر نکل آئی...... اور اسی اثناء میں اس نے دیکھا کہ فضلاں نامی اس اجنبی عورت کا چہرہ خفت اور بے عزتی کے احساس سے مسخ ہوچکا تھا۔ وہ کوٹھڑی نما کمرے سے یوں اچانک باہر نکلی تھی جیسے اندر اگر مزید کچھ دیر رکتی تو جانے کیا ہوجاتا...... پھر اللہ رکھی نے دیکھا کہ چاچی عنایتاں بھی لپکتی جھپکتی بہ دقت تمام باہر

برآمد ہوئی اور جسے دیکھ کر فضلاں پھر ٹھٹکی۔

''تم ابھی تک یہاں ہو...... میں کہتی ہوں دفع ہوجاؤ...... یہاں سے کمینوں کی اولادو......'' چاچی عنایتاں کا پارہ ساتویں آسمان تک پہنچا ہوا تھا اور اللہ رکھی بری طرح متحیر تھی کہ آخر یہ اچانک چاچی کو کیا ہوگیا تھا کہ وہ کیوں ان مہمانوں کے درپے ہوگئی تھی۔

اس بار فضلاں کے بھائی خانو نے غصے سے بپھری ہوئی چاچی عنایتاں کو مخاطب کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''ماسی...... ہم سودھل کی وجہ سے تم لوگوں کو پوچھنے آگئے تھے...... اس کا مطلب یہ نہیں ہے تم ہمیں یوں بے عزت کرکے نکالو...... آخر پتہ تو چلے بات کیا ہوئی ہے؟''

''ابھی بتاتی ہوں کمینے...... ٹھہر ذرا......'' چاچی عنایتاں غصے سے سرخ ہوتے ہوئے خانو کی طرف بڑھی اور شدت جوش میں وہ اپنے گھٹنوں کے درد کو بھی بھلا بیٹھی تھی وہ خانو کو مارنے کے لیے لپکی...... مگر اللہ رکھی نے فوراً چاچی کا راستہ روکتے ہوئے اسے سنبھال لیا...... پھر وہ قدرے درشت لہجے میں فضلاں سے بولی جو اب اپنے بھائی کے قریب کھڑی تھی۔

''تم لوگ مہربانی کرکے چلے جاؤ یہاں سے...... میری چاچی کی طبیعت صحیح نہیں ہے...... جاؤ...... جاؤ...... یہاں سے......'' اللہ رکھی کے لہجے کا ان دونوں بہن بھائیوں پر خاطر خواہ اثر ہوا وہ اپنے منہ سے ایک خفت آمیز ''ہونہہ......'' کی آواز نکالتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

اللہ رکھی نے محسوس کیا کہ چاچی عنایتاں کا وجود غصے کی شدت سے کپکپارہا تھا...... وہ جان گئی تھی کہ ضرور فضلاں نامی اس عجیب عورت نے چاچی کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات کی ہوگی جس نے چاچی کو بھڑکا کر رکھ دیا تھا ورنہ وہ ایسی ہرگز نہیں تھی کہ گھر آئے اور وہ بھی پُرسے کے لیے آئے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتی...... بہرطور ان دونوں بہن بھائیوں کے نکلتے ہی اللہ رکھی چاچی عنایتاں کو سہارا دیتے ہوئے واپس کمرے میں لے آئی...... چاچی کا غصہ ابھی تک سرد نہیں ہوا تھا۔

وہ اب بھی انہیں کوسنے دیتے ہوئے بڑبڑائے جارہی تھی...... ''بے غیرت کہیں کے...... آئی تھی کسی اور مقصد کے لیے...... اور کہتی تھی پُرسے پر آئے ہیں...... مجھے تو ان دونوں کے بھائی بہن ہونے پر بھی شک ہے......'' عنایتاں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے زہرخند لہجے میں بولے جارہی تھی...... تاہم اللہ رکھی نے چاچی کو پُرسکون رہنے کو کہا...... پھر وہ فوراً اس

کے لیے پانی کا گلاس بھر لائی اور اس کے بعد جب اس نے محسوس کیا کہ اب چاچی عنایتاں کا غصہ ذرا ٹھنڈا پڑ گیا ہے تو اس نے اس بدمزگی کی وجہ دریافت کی۔

’’اپنے لنگور سے بھائی کے لیے...... تیرا سنگ مانگنے آئی تھی اور کہتی تھی کہ اس کے بدلے میں مجھے......بس اللہ رکھی اب آگے مجھ سے کچھ نہ پوچھ......اگر دوبارہ کبھی یہ دونوں دروازے پر نظر آئیں تو انہیں اسی طرح جوتے مار کر نکالنا......‘‘ چاچی عنایتاں تقریباً ہانپتے ہوئے بولی اور اللہ رکھی کو بھی اس بدمزگی کی اصل وجہ سن کر بہت غصہ آیا......اس نے سوچا اگر وہ دونوں بہن بھائی اس وقت اس کے سامنے موجود ہوتے تو وہ ان دونوں کا منہ نوچ لیتی۔ پھر اچانک اس نے دیکھا کہ چاچی عنایتاں سسک پڑی اور اپنی اجرک کے کونے سے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولی۔

’’اللہ رکھی......اگر تیرا چاچا سوڈھل آج جیندہ (زندہ) ہوتا تو ایسے لوگوں کو یہاں آنے کی جرأت نہ ہوتی......‘‘ اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی......اب اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ وہ دونوں یعنی خانو دھچر......اور اس کی ادھیڑ عمر بہن فضلاں درحقیقت آئے ہی اس کے شوہر سوڈھل کی وجہ سے تھ......اور نہ ہی وہ یہ بات جانتی تھی کہ اس کے مرحوم شوہر سوڈھل نے نہ صرف اللہ رکھی کی شادی کا فیصلہ اس لنگور سے خانو دھچر...... کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور بدلے میں اپنی بھی شادی اس کی بہن فضلاں سے کرنے پر تیار تھا۔ مگر وائے قسمت یا واہ قسمت! کہ سوڈھل اپنے کسی نادیدہ دشمن کی گولی کا شکار ہو کر جہان فانی سے کوچ کر گیا اور بعد میں یہ دونوں بہن بھائی اس کی باقیات پر امید رکھے یہاں تک آن پہنچے تھے مگر انہیں بے نیل و مرام یہاں سے رخصت ہونا پڑا تھا۔

☆======☆======☆

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی پھلکی یخ بستگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ساون دوپہر کے کھانے سے جلدی جلدی فارغ ہوا اور نئے کپڑوں پر اجرک اور ٹوپی پہن کر باہر نکل آیا......اس کا رخ اللہ رکھی کے گھر کی جانب تھا......کل ہی اللہ رکھی سے ملاقات پر اس نے ساون کو خوشی خوشی بتایا تھا کہ عنایتاں چاچی نے اسے کل یعنی بعد دوپہر اپنے گھر بلایا ہے اور اللہ رکھی نے اشاروں کنایوں میں ساون کے یہ بھی گوش گزار کر دیا کہ یہ بلاوا ایک خوش خبری کا باعث بن سکتا ہے......لہٰذا ساون آج سرمست سا اللہ رکھی کے گھر چلا جا رہا تھا......پھر تھوڑی دیر بعد وہ اس کے گھر کے سامنے کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

’’کیر آ......(کون ہے)؟‘‘

اندر سے نسوانی آواز ابھری جسے ساون پہچان چکا تھا لہٰذا درمیانے آہنگ میں بولا......’’میں ہوں......اللہ رکھی......در کھول......‘‘

اگلے ہی لمحے دروازے کے دونوں پٹ وا ہو گئے سامنے اللہ رکھی سرخوشی کے عالم میں کھڑی تھی......مسرت کے شگوفے اس کے گلابی گالوں پر دہکتے ہوئے ساون کو بڑے بھلے محسوس ہوئے......اللہ رکھی کے رخ روشن پر انتظار کی ضوفشانی دمک رہی تھی......بہرطور دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں......معنی خیز پیغامات کا تبادلہ ہوا پھر وہ اللہ رکھی کے راستہ دیتے ہی اندر داخل ہو گیا۔

’’چاچی تو ہے نا گھر پر......‘‘ ساون نے خالی صحن میں آ کر ہولے سے پوچھا۔

’’ہاں اندر ہے......آ جا......‘‘ اللہ رکھی ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹیں بکھیرتی ہوئی بولی اور پھر ساون کو اپنے عقب میں لئے اندر کوٹھڑی میں لے آئی جہاں دو چار پائیوں کے درمیان ایک انگیٹھی رکھی ہوئی تھی......جس میں اپلے دھیمی آنچ میں سلگ رہے تھے اور اس کی وجہ سے کمرے کی فضاء بھی خاصی حرارت بخش ہو رہی تھی......ایک چارپائی پر حسب معمول چاچی عنایتاں نیم دراز تھی۔

’’سلام چاچی......میں ساون ہوں......‘‘ ساون نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چاچی کو سلام کیا اور پھر سامنے کی چارپائی پر خاموش سا بیٹھ گیا......چاچی عنایتاں نے قدرے نرم لہجے میں اس کے سلام کا جواب دیا......اللہ رکھی اسی اثناء میں کوٹھڑی سے باہر چلی گئی تھی۔

کمرے میں ایک لمحے کو سکوت سا چھایا رہا پھر ساون نے ازراہ ہمدردی پوچھا......

’’چاچی تیری طبیعت اب کیسی ہے......اللہ رکھی بتا رہی تھی کہ......تجھے جوڑوں کا آزار ہے......‘‘

’’ہا......پٹ ساون......لگتا ہے یہ جوڑوں کا درد اب مجھے قبر میں ہی لے جا کر چھوڑے گا......‘‘ چاچی عنایتاں آہ بھرتے ہوئے بولی۔

’’نہیں چاچی، دھڑیں سائیں خیر کرے گا......ایسا نہ بول......‘‘ ساون کی درد آویز گفتگو نے چاچی عنایتاں کی آنکھیں نمناک کر دیں جنہیں وہ اپنی رلی کے کونے سے صاف کرتے ہوئے قدرے رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

’’ساون پٹ تجھے دیکھ کر اولاد کا سا درد محسوس ہوتا ہے......میری اولاد آج اگر ہوتی تو وہ بھی بالکل تیری طرح میری یوں غمگساری کرتی۔‘‘

''ارے چاچی...... مجھے بھی اپڑاں پٹ......اور اولاد ہی سمجھ...... تُو میری امڑ جیسی ہے......'' ساون نے اس کا دل رکھا......اسی اثنا میں اللہ رکھی چائے وغیرہ کی ٹرے لئے اندر داخل ہوئی......پھر ذرا دیر بعد وہ تینوں اکٹھے چائے پینے لگے۔

سب سے پہلے چاچی عنایتاں نے اپنی چائے ختم کی اور پھر اپنی چارپائی ہی کے کسی کونے سے ایک بُغچی سی نکالی اور اسے کھولنے لگی......اللہ رکھی اور ساون کی نگاہیں ایک لمحے کو چار ہوئیں اور وہ پھر چاچی کو بغور بُغچی کھولتے دیکھتے رہے......تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ چاچی عنایتاں نے نوٹوں کی دو تین بھاری گڈیاں نکالیں اور ساون کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔''پٹ ساون! یہ تیرے پچاس ہزار ہیں...... جو تُو نے میرے شوہر سوڈھل کو دیئے تھے......یہ تُو رکھ لے......''

ساون یہ دیکھ کر ہکا بکا سا رہ گیا چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد پھر رسان سے بولا......''چاچی...... یہ میں نے چاچا سوڈھل کو اللہ رکھی کے...... اپنے سنگ کے واسطے دیئے تھے......یہ تُو رکھ لے میں نہیں لوں گا انہیں۔''

ساون کی بات سن کر چاچی نرم لہجے میں بولی۔''نہیں ساون پٹ...... یہ بہت زیادہ ہیں......اور میں جانتی ہوں تُو ایک غریب ہاری کا بیٹا ہے......یہ میں اپنی خوشی سے تجھے لوٹا رہی ہوں......لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے میں تجھے اللہ رکھی کا سنگ دینے سے انکار کر رہی ہوں...... میں جانتی ہوں اچھی طرح سے کہ اللہ رکھی تیرے ساتھ بہت خوش رہے گی۔''

آخری الفاظ چاچی عنایتاں نے سرخ ہوتی اللہ رکھی کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیے تھے......اور جن کی حدت محسوس کرتے ہوئے اللہ رکھی خاموشی سے چائے کے برتن اٹھا کر کوٹھڑی سے باہر چلی گئی۔

ساون خاموش تھا...... چاچی پھر ملائمت سے استفسار طلب لہجے میں ساون کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔''پٹ ساون!''

''جی چاچی......'' ساون جھٹ بولا۔

''پٹ...... یہ بتا...... کہ اللہ رکھی کے بیاہ سے تیرے گھر والے تو راضی ہیں ناں......میرا مطلب ہے کہ کبھی اپنے ماں باپ کو بھی یہاں لا...... تاکہ میں اللہ رکھی کے فرض سے سبکدوش ہوسکوں۔''

ساون نے محسوس کیا یہ کہتے ہوئے چاچی کے لہجے میں رقت سی عود کر آئی تھی......ساون نے خاموشی سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ پھر ہامی بھرتے ہوئے جانے کے لیے اٹھ

کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر چاچی عنایتاں کے سر پر روایتاً اپنا ہاتھ دھر کر بولا......''چاچی! میں اللہ رکھی کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کروں گا......لیکن تُو ان روپوں میں سے کچھ رقم اللہ رکھی کے سنگ کے لیے رکھ لے......میرا دل خوش ہو جائے گا......''

اس کی بات پر چاچی عنایتاں نے نمناک آنکھوں اور قدرے ستے ہوئے چہرے سے ساون کی طرف دیکھا پھر سارے نوٹوں کو ایک بُغچی میں لپیٹ کر ساون کی طرف بڑھاتے ہوئے قطعیت سے بولی۔''نہیں ساون! میں اب یہ پیسے نہیں لوں گی تیری جو مرضی ہو کر لے......''

ساون نے خاموشی سے روپوں کی پوٹلی تھامی اس وقت......اللہ رکھی کمرے میں داخل ہوئی......ساون نے آہستگی سے پوٹلی کھولی اور اس میں سے پندرہ ہزار نکال کر چاچی عنایتاں کے قریب ہی چارپائی پر رکھتے ہوئے بولا......''چاچی! یہ میں اپنی خوشی سے تجھے دے رہا ہوں...... پندرہ ہزار ہیں......رکھ لے اسے۔''

قریب کھڑی اللہ رکھی خاموش تھی چاچی بھی چند ثانیے پُرسکوت رہی پھر اپنے قریب رکھے نوٹوں کی طرف دیکھا اور قریب کھڑی اللہ رکھی کو مخاطب کر کے بولی۔''دھیئے! پٹ ساون کو میں نے سارے پیسے واپس کر دیئے ہیں...... پر یہ اپنی خوشی سے تیرے سنگ کے لیے پندرہ ہزار روپے دے رہا ہے...... تیری کیا مرضی ہے......؟ یہ میں تجھ پہ چھوڑتی ہوں......''

اللہ رکھی چاچی عنایتاں کی بات سن کر چند ثانیے خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر پاس کھڑے ساون سے بولی۔''ساون! بس تُو سنگ کے لیے صرف پانچ ہزار روپے دے باقی اٹھا لے۔''

ساون نے اللہ رکھی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر التجا تھی کہ ہر صورت میں ساون اس کی بات مان لے......لہٰذا ساون نے پھر پانچ کی بجائے دس ہزار چھوڑے اور بقیہ چالیس ہزار کی پوٹلی اٹھالی اور چاچی کو سلام کر کے باہر صحن میں آ گیا۔

اللہ رکھی اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تو اسے رخصت کرتے ہوئے تاکیداً بولی ''ساون! یہ پیسے ابھی جا کر منشی میرل کو لوٹا دے......اور اپنے ہمراہ کوئی گواہ ضرور لے جانا......ابھی ان روپوں پر اتنا ''ویاج'' (سود) نہیں چڑھا ہوگا...... میری بات مانے گا ناں......''

آخر میں وہ قدرے رسان سے بولی تھی اور ساون نے اس کی جانب محبت پاش

نظروں سے دیکھ کر دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

پھر لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد وہ ایک شخص رحیمو کو بہ طور گواہ لے کر اوطاق پہنچا...... اتفاق سے منشی فارغ ہی بیٹھا تھا...... ساون نے اسے چالیس ہزار روپے لوٹائے تو منشی یوں چونک اٹھا جیسے کسی بچھو نے ڈس لیا ہو...... ساون نے دیکھا اس کا چہرہ قدرے ناگوار سا ہو گیا تھا۔ تاہم اس کی چندھی آنکھوں میں ایک کرخت آمیز حیرت بھی سمٹ آئی تھی جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو کہ ساون اتنی جلدی اتنی بڑی رقم لوٹا دے گا۔

''منشی صائب...... یہ پورے چالیس ہزار ہیں...... دس میں بعد میں دے دوں گا''۔ ساون نے بالآخر کہا اور پھر اچانک اس کی بات سن کر منشی نے اپنے چہرے کا رنگ گرگٹ کی طرح بدلتے ہوئے کھی کھی کرتے ہوئے اس سے بولا۔

''اڑے...... بابا چھورا...... اتنی جلدی بھلا کیا تھی لوٹانے کی...... ابھی بے شک رکھ لے...... دو چار سال بعد دے دینا......'' یہ کہتے ہوئے منشی میرل ساون کی جانب بہ غور دیکھنے لگا...... مخاطب وہ ساون سے ہی تھا پر درحقیقت...... وہ درون خانہ اسی ادھیڑ بن میں غلطاں تھا کہ آخر ساون یہ رقم اتنی جلدی کیونکہ لوٹا رہا ہے...... کیا اس کا ارادہ اللہ رکھی سے شادی کرنے کا نہیں ہے۔

معاً اس کی سماعت سے ساون کی پُر متانت...... آواز ٹکرائی وہ جواباً اس سے کہہ رہا تھا۔ ''نہیں...... منشی...... تیری وڈی مہربانی...... پر اب یہ روپے میں واپس ہی کر کے رہوں گا...... جتنے چاہئے تھے اتنے میں نے رکھ لئے ہیں...... اب ذرا تُو لکھت پڑھت کر لے تو میں جاؤں......''

پھر طوعاً و کرھاً منشی نے اپنی گول گول عدسوں والی عینک کے پیچھے سے اپنے الوؤں جیسے دیدوں کو گردش دی اور گود میں رکھا رجسٹر کھولا...... پھر ساون سے روپے لے کر گنے اور رجسٹر میں کچھ اندراج کیا...... اور ساون کو رجسٹر سے کاغذ کا ایک پرزہ پھاڑ کر حوالے کر دیا...... ساون نے کاغذ اس سے لے کر پڑھا تو اس میں واپسی کی رقم بجائے چالیس کے تینتیس ہزار لکھی تھی۔

وہ حیرت آمیز پریشانی سے منشی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''منشی سائیں! یہ کیا میں نے تو آپ کو پورے چالیس ہزار دیئے ہیں آپ نے تو...... تینتیس......''

''ہاؤ بابا ہاؤ...... باقی سات ہزار ویاج (سود) کے کاٹے ہیں......'' منشی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''لیکن منشی صائب! یہ تو ظلم ہے قہر...... ہے...... ابھی مجھے آپ سے پچاس ہزار لئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے جو آپ نے اتنا ویاج کاٹ لیا...... اور پھر پورے چالیس میں نے یکمشت بھی تو ادا کر دیئے آپ کو۔'' ساون کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی اس کے ہمراہ گواہ کے طور پر آیا ہوا رحیمو بھی اچنبھے میں مبتلا تھا مگر ہنوز وہ خاموش ہی تھا۔

''اڑے بابا چھوکرا...... اتنی لمبی رقم لے کر پھر جلدی سے لوٹا دینا...... ہمارے لئے بھی نقصان دہ ہی ہوتا ہے......'' منشی میرل...... دو اور دو چار والا لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا...... ''اگر تُو تین چار سال بعد بھی دیتا تو ویاج کے طور پر اتنی ہی کٹوتی ہوتی......''

''اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ یہ چالیس ہزار روپے میں اپنے پاس ہی رکھ لوں ویاج تو ویسے بھی تین سال والا ہی کٹ رہا ہے...... کیوں......''

''اب تُو میری بات سمجھا نا چھوکرا......'' منشی جھٹ بولا جیسے اس کی دیرینہ مراد بر آئی ہو...... درحقیقت وہ یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح سے ساون یہ قرض اتارنے کی بجائے چالیس ہزار واپس اپنے ساتھ لے جائے اور قرض کا طوق ساون کے گلے میں پھنسا کر اسے وڈیرے کا غلام بنا دے تا کہ...... ''وڈے سائیں کا کام'' مزید...... آسان ہو سکے...... اور ساتھ ہی وہ اس کی خوشنودی بھی حاصل کر لے...... لہٰذا وہ مزید بولا...... ''اس لئے تو کہہ رہا ہوں کہ تُو یہ چالیس ہزار بھلے ابھی مجھے نہ لوٹا...... ویاج تو تجھ پر ویسے ہی لگ چکا ہے چاہے ابھی لوٹا یا بعد میں...... تو بہتر یہی ہے تیرے واسطے کہ تُو ابھی ان روپوں کو رکھ لے تیرے کام آئیں گے...... ابھی تو شادی بھی کرے گا...... تیری ضرورت بڑھے گی...... کوئی ڈھور ڈنگر ہی خرید لینا یا...... بیل گاڑی...... سو کام نکل سکتے ہیں تیرے۔''

ساون چالاک اور عیار منشی میرل کی باتوں میں آ کر اپنا سر دھیرے دھیرے اثبات میں ہلاتے ہوئے سوچنے لگا کہ منشی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے...... سود تو ویسے ہی کٹ رہا ہے تو کیوں نہ یہ پیسے ابھی اپنے پاس ہی رکھ لوں...... کبھی کام ہی آ جائیں گے۔ انسان پر مشکل وقت آتے دیر تھوڑا ہی لگتی ہے...... لہٰذا پھر ساون نے منشی کی دی ہوئی رسید پھاڑ ڈالی اور اس سے چالیس ہزار واپس لئے...... گواہ رحیمو کا شکریہ ادا کیا پھر...... گھر کی جانب ہو لیا...... گھر لوٹتے لمحے اس کے ذہن میں یہی بات بار بار گردش کر رہی تھی کہ اللہ رکھی کو اس کا منشی کو قرض لوٹاتے لوٹاتے دوبارہ واپس لے لینا ہرگز اچھا نہیں لگے گا۔ لہٰذا سر دست ساون نے اپنے تئیں مصلحتاً اسے اس بات سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

☆======☆======☆

''واہ ڑے منشی میرل...... کیا دماغ ہے تیرا بھی...... وہ چھوکرا اتنی جلدی قرض کا طوق اپنے گلے سے اتارنے آیا تھا اور تو نے دوبارہ اس کی گردن میں وہ طوق پھنسا دیا......''
وڈیرا الکھ میر خان ایک چوڑے پشت والے سرکنڈوں کے مونڈھے سے ٹیک لگاتے ہوئے بھاری لہجے میں منشی سے بولا اور پاس کھڑا منشی میرل کھی...... کھی کرنے لگا...... وڈیرے کے منہ سے اپنی تعریف سن کر بہت خوش ہو رہا تھا۔

وہ بولا ''ہا سائیں وڈا...... میں تو ایک دم پریشان سا ہو گیا تھا جب یہ چھوکرا ساون اکٹھی چالیس ہزار کی رقم لوٹانے آ گیا...... میں حیران ہوں کہ ابھی تک اس کے پاس اتنی رقم قرضے کی کیونکر سنبھلی ہوئی ہے......؟'' پھر منشی خود ہی کچھ سوچ کر اپنے سوال کا جواب وڈیرے کو دیتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولا...... ''میرا خیال ہے سائیں وڈا...... سوڈھل کے قتل...... میرا مطلب ہے مرنے کے بعد...... ہو سکتا ہے...... کہ اللہ رکھی نے اسے وہ روپے لوٹا دیئے ہوں جو اس کے سوڈھل چاچا...... نے اس کے سنگ کے بطور معاوضہ ساون سے لئے تھے اور جس کی وجہ سے ساون ہم سے قرض لینے پر مجبور ہوا تھا......''

''ہوں۔'' وڈیرے نے ہنکاری بھرنے پر اکتفا کیا جیسے وہ منشی کو مزید اپنی بات جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا ہو...... مگر منشی اتنا بتا کر خاموش ہو گیا تو بالآخر وڈیرے نے کچھ سوچتے ہوئے گہرے انداز میں منشی سے کہا...... ''منشی! کیا تو سمجھتا ہے کہ اگر ساون اللہ رکھی سے شادی کر لے تو ہمارا کام مزید آسان ہو سکتا ہے......؟''

وڈیرے کی بات پر منشی میرل جھٹ مؤدبانہ لہجے میں بولا...... ''ہاؤ سائیں برابر...... کیوں نہیں بھلا...... بس ایک بار اسے ہمارے قرضے کے شکنجے میں جکڑ جانے دو...... پھر دیکھنا یہ خود ہی بے دست و پا ہو کر اللہ رکھی کو آپ کے قدموں میں ڈال دے گا...... اور یوں آپ کی دیرینہ آرزو بھی پوری ہو جائے گی''۔

وڈیرا الکھ میر خان کی آنکھوں میں منشی کی بات پر یکبارگی شکرے جیسی چمک عود کر آئی...... وہ تصور ہی تصور میں اپنے سامنے نازک اندام اور معصوم اللہ رکھی کو سر جھکائے کھڑا دیکھ رہا تھا اور ایک جانب اسے ساون قرض کے بوجھ تلے ہاتھ جوڑے کھڑا نظر آ رہا تھا۔

☆======☆======☆

صحن میں چمکیلی دھوپ اتری ہوئی تھی چاچی عنایتاں کھری چارپائی پر بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی۔ جبکہ اللہ رکھی صبح صادق ہی کھیت پر لابھ کرنے جا چکی تھی۔ ہیرا اور سانولا

بھی بیل گاڑی سمیت اللہ رکھی کے ساتھ ہوتے تھے...... چاچی کے لیے اللہ رکھی دوپہر کا کھانا بنا کر گئی تھی...... جن دنوں گوٹھ کے کھیتوں میں کام زیادہ ہوتا تھا تو لوگ منہ اندھیرے ہی مزدوری کے لیے نکل جاتے تھے اور گھر کے باقی ماندہ افراد صبح صادق کا بنا ہوا کھانا دس گیارہ بجے ہی کھا کر فارغ ہو جایا کرتے تھے۔ لہٰذا چاچی عنایتاں بھی گیارہ بجے سے پہلے پہلے کھانا کھا چکی تھی...... وہی ان کا ناشتہ بھی ہوتا تھا اور دوپہر کا کھانا بھی۔

اس وقت چاچی عنایتاں ایک گہری سوچ میں مبتلا تھی...... اور اس نے اس مسئلے کے لیے پڑوس سے اپنی ایک دیرینہ جاننے والی مائی عجیباں کو بلایا تھا۔ چاچی عنایتاں کو درحقیقت یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ ساون کو اس کے پیسے لوٹا چکی تھی اب دودا خان کے روپے کیسے لوٹائے......؟ ابھی وہ اسی سوچ بچار میں تھی کہ اس کی پڑوسن مائی عجیباں بھی آ گئی...... رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے عجیباں کے سامنے اپنا مسئلہ رکھ دیا اور مشورہ مانگتے ہوئے پوچھا...... ''ڑی عجیباں! ہن تو ہی بتا مجھے کیا کرنا چاہئے...... اس مردود دودے کے پیسے کس طرح لوٹاؤں...... وہ موا تو جیل میں بند ہے......''

''جا کر اس کی گھر والی کو دے دے میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں...... بلکہ دونوں ساتھ ہی چل کر دے آئیں گے۔'' مائی عجیباں نے رائے دی...... اس کی عمر پینتالیس سے متجاوز تھی...... رنگ سانولا اور جسم فربہی مائل تھا...... چاچی عنایتاں نے اس کی بات دھیان سے سنی اور گمان آمیز لہجے میں بولی۔

''کیا ہم اس کی گھر والی کو روپے واپس کرتے ہوئے اسے یہ بتائیں کہ یہ اس کے شوہر نے اللہ رکھی کے ساتھ شادی کے لیے ہمیں دیئے تھے......''

''ظاہر ہے عنایتاں، یہ تو بتانا ہی پڑے گا اسے......'' مائی عجیباں مدھم مگر دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''ویسے عنایتاں میں کہتی ہوں تو خواہ مخواہ اور بیکار کی الجھنوں میں پڑ رہی ہے...... جتنی جلدی ہو سکے...... یہ روپے دودا خان کے گھر والوں کو لوٹا دے...... ویسے بھی اس موذی دودا خان کو ادا سوڈھل کے قتل کے جرم میں پولیس پکڑ کر لے گئی ہے...... یہی موقع ہے اپنی جان چھڑانے کا۔'' اس کی بات پر چاچی عنایتاں تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلانے لگی...... اور چند لمحوں بعد فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے عجیباں...... اللہ رکھی کو ذرا آنے دے...... پھر ساتھ ہی چلتے ہیں...... تو بیٹھ میں تیرے لئے چائے پاڑیں کا بندوبست کرتی ہوں......'' چاچی عنایتاں ابھی اٹھنے ہی لگی تھی کہ مائی عجیباں اسے روکتے ہوئے خلوص سے بولی۔

''اڑی بیٹھ تو...... تو خود اٹھنے سے لاچار ہے...... میں ہی بنا کر لاتی ہوں...... دودھ تو ہے نا رکھا......''

''ہاں...... ہے...... باورچی خانے میں......'' عنایتاں اسے ممنونیت بھری نظروں سے تکتے ہوئے بولی۔

☆======☆======☆

دودا خان کو سوڈھل کے قتل کے جرم میں گوٹھ داد پور کے تھانہ لاک اپ ہوئے آج پورے پانچ روز ہو چکے تھے...... تھانہ انچارج انسپکٹر ارشد لاشاری جواب مکمل طور پر وڈیرا لکھ میر خان کا زرخرید غلام بن چکا تھا۔ اب اسی کے ایماء پر وہ دودا خان پر باقاعدہ قتل کا مقدمہ چلانا چاہتا تھا جس کے لیے اس نے سب سے پہلے اسے شہر کی ڈسٹرکٹ جیل منتقل کرنے کا بندوبست کرنا شروع کیا۔ اس دوران علی بخش کی سرتوڑ کوشش اور مٹھی گرم کرنے کی پالیسی نے بالآخر ایک دن اس کے باپ دودا خان سے ملاقات کرواہی دی۔

''پٹ علی بخش...... اللہ رکھی کا سنگ میرے لئے اب غیرت کا مسئلہ بن چکا ہے اور تیرے لئے بھی عزت کا معاملہ ہے اب...... کیا تو چاہے گا کہ جس عورت کو تیرا باپ اپنی بیوی کی نظر سے دیکھ چکا ہے وہ کسی اور کی بیوی کہلائے......؟'' ملاقات ہونے پر علی بخش کے باپ دودا خان نے بیٹے سے گھن گرج کے ساتھ کہا جس نے علی بخش کی رگ حمیت پھڑکا کے رکھ دی...... تاہم اس کے چہرے پر ایک جوش بھری گہری خاموشی طاری رہی......

دودا خان بیٹے کو خاموش پا کر دوبارہ مگر قدرے ہولے سے بولا...... ''پٹ علی بخش...... یہ سلاخیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں مگر میں ابھی مجبور ہوں...... ورنہ اس چھوکرے ساون کو بھی سوڈھل کی طرح ختم کر چکا ہوتا...... بس ایک بار میں باہر آجاؤں۔''

اس کی بات سن کر علی بخش بری طرح چونک گیا...... اس کا باپ علی الاعلان اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ سوڈھل کو اس نے ہی جوش غیرت میں آ کر قتل کر دیا تھا...... علی بخش کے اندر آندھیاں سی چلنے لگیں تاہم اس نے باپ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی غیرت (اللہ رکھی) کو کسی اور کی عزت نہیں بننے دے گا۔ چاہے اس کا دوست ساون ہی کیوں نہ ہو۔

اس سمے ایک سپاہی نے ڈنڈا فرش پر بجا کر ملاقات ختم ہونے کا اعلان کیا اور جب علی بخش باپ سے رخصت ہونے لگا تو دودا خان نے اس کے کان کے قریب منہ لا کر کہا کہ ہر جمعرات کی رات کو جب اس کے ہوٹل میں شراب کی خفیہ محفل لگتی ہے تو اس رات اس کا ایک جاننے والا شخص آتا ہے جو درحقیقت بدنام۔ اکو دھاڑیل کے نام سے جانا

جاتا ہے...... اسے میرے حال کی اطلاع کر دینا...... وہ ضرور ہمارے آڑے وقت میں کام آئے گا۔

علی بخش باپ سے وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا...... اب اچانک اسے یہ خبر ملی کہ اس کے باپ کے خلاف شہر کی عدالت میں باقاعدہ قتل کا مقدمہ چلنے والا ہے تو وہ ٹھٹک گیا...... یہ خبر بھی اسے تھانے کے سپاہی نے مٹھی گرم ہونے پر دی تھی...... علی بخش کے دل و دماغ میں اب اپنے باپ دودا خان کی باتیں گردش کر رہی تھیں...... ''علی بخش...... اللہ رکھی...... تیرے باپ کے لیے غیرت بن چکی ہے اور تیری ماں کے برابر عزت بھی کیا تو چاہے گا کہ تیری ماں......''

''نہیں...... میں خون کر دوں گا اس کا......'' معاً یک دم علی بخش چلایا اور ہوٹل کے چند ملازم اس کی جانب دوڑے آئے کہ پتہ نہیں چھوٹے مالک کو اچانک کیا ہو گیا...... کیونکہ جس وقت علی بخش کے دل و دماغ میں خیالات کی یلغار ہو رہی تھی اس وقت وہ اپنے ہوٹل کے ''دخل'' پر موجود تھا...... علی بخش کو اب بے چینی سے کل کا انتظار تھا کیونکہ کل جمعرات تھی اور اس کے باپ کا خاص آدمی اکو دھاڑیل نامی شخص نے آنا تھا جس سے علی بخش نے اپنے باپ کی رہائی کے سلسلے میں مدد چاہنی تھی۔

بالآخر صدیوں پر محیط مذکورہ دن کی بھی رات آ گئی...... اس دن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا علی بخش کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ اس کے دو دن بعد اس کے باپ کو گوٹھ داد پور کے تھانے سے ڈسٹرکٹ جیل منتقل کر دیا جانا تھا جبکہ علی بخش اس سے پہلے اپنے باپ کے دوست اکو دھاڑیل سے مل کر کوئی ایسی حکمت عملی طے کرنا چاہتا تھا جس سے تھانہ ہی میں ٹک مکا ہو جائے اور اس کا باپ باعزت رہا ہو جائے۔

اس رات معمول کے مطابق دودا خان کے ہوٹل کی عقبی کوٹھڑی میں کسی قسم کی ''محفل خاص'' نہیں ہو سکی تھی۔ وجہ ہوٹل کے مالک دودا خان کی گرفتاری تھی...... تاہم علی بخش رات گئے تک ہوٹل میں موجود رہا...... جب گوٹھ کے گلیارے اور شکستہ راستے ویران ہو کر دبیز کہرے میں لپٹ گئے اور ہوٹل میں بھی برائے نام گاہک باقی رہ گئے تو اچانک دخل پر بیٹھے علی بخش کے کان میں ایک ملازم نے ہوٹل کی عقبی کوٹھڑی میں ایک ''مہمان'' کی آمد کی اطلاع دی...... علی بخش کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا...... وہ حیران تھا کہ اس نے تو کسی کو بھی اپنے ہوٹل میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ بہرنوع...... وہ جلدی سے اٹھا اور کوٹھڑی کی جانب ہولیا...... اس نے اندازہ لگایا تھا کہ رات کی پُراسرار اور یخ بستہ تاریکی میں آنے

والا اکو دھاڑیل کے سوا کون ہوسکتا تھا۔ علی بخش خود اعتمادی سے چلتا ہوا کوٹھڑی میں داخل ہوا...... اندر بلب کی روشنی میں کچے فرش پر بچھی کھجی کی چٹائی پر ایک بھاری بھرکم شخص اجرک کی بکل سی مارے بیٹھا ہوا تھا...... اس کے قریب ہی ایک روسی ساخت کی ہیوی گن رکھی ہوئی تھی...... یہ صوبائی شہرت یافتہ ڈاکو اکو تھا۔ علی بخش کے باپ دودا خان نے اسے اس شخص سے ہی موجودہ حالات کے سلسلے میں تبادلۂ خیالات کرنے کی تاکید کی تھی۔

''سائیں بسم اللہ میں علی بخش ہوں دودا خان کا پٹ......'' علی بخش اس کے قریب آ کر بولا تو وہ چٹائی پر بیٹھا ہوا شخص اپنا چہرہ اوپر کر کے ایک لمحے علی بخش کو گھورنے کے سے انداز میں تکنے لگا...... اس کی تیز نگاہیں علی بخش کو اپنے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہوئیں...... علی بخش نے اس کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا تو وہ اس قدر سرخ انگارہ ہو رہی تھیں جیسے اس نے بھنگ کا پورا کونڈا چڑھا رکھا ہو...... اسی وقت...... وہ شخص جو بلاشبہ اکو دھاڑیل ہی تھا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دونوں بازو علی بخش سے معانقے کے لیے پھیلا دیئے...... دونوں کے درمیان ایک گرم جوش معانقہ اور پھر مصافحہ ہوا۔ اس کے بعد رسمی گفتگو کے دوران جب علی بخش اسے اپنے باپ کے بارے میں بتانے لگا تو اکو دھاڑیل یک دم اپنی لھرکھراتی آواز میں علی بخش سے بولا۔

''مجھے سب معلوم ہے جوان...... ہم یاروں کے یار ہیں...... جنگلوں میں ضرور بسیرا کرتے ہیں لیکن اپنے یاروں کی بھی خبر رکھتے ہیں......''

''کیا...... اس کا مطلب ہے تم جانتے ہو کہ بابا جیل میں......'' علی بخش نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو اکو دھاڑیل جھٹ بولا۔

''ہاں...... مجھے نہ صرف معلوم ہے بلکہ میں نے دودا خان کو جیل سے رہا کرانے بھی بندوبست کرلیا ہے......''

''کک...... کیا...... تم صحیح کہہ رہے ہو اکو چاچا......'' علی بخش نے مسرت آمیز حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پہلی بار اسے ''اکو چاچا'' پکارتے ہوئے کہا اور اکو دھاڑیل علی بخش کو خوشی سے محظوظ ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کے کاندھے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ رکھ کر بولا۔

''ہاں...... جوان...... تُو گڑتی نہ کر اب...... کل تک تیرا پیو (باپ) اور ہمارا یار دودا خان جیل کی سلاخوں سے باہر ہوگا......''

''مگر چاچا...... کس طرح؟ کیا تم اپنے ساتھیوں سمیت تھانے میں بلہ

گے......؟'' علی بخش جیسے اپنے تئیں اندازہ لگاتے ہوئے اکو دھاڑیل سے بولا۔

''اگر اس کی ضرورت پڑی بھی تو تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں دریغ نہیں کروں گا...... مگر جب مک مکا سے معاملہ حل ہو رہا ہے تو بلاوجہ خون خرابے سے کیا فائدہ جوان۔''

علی بخش اس کی بات سن کر نہ صرف خوش ہوگیا تھا بلکہ اس سے خاصا متاثر بھی نظر آ رہا تھا...... اس نے دل میں سوچا ایسے ہوتے ہیں دوست...... جو اپنے دوستوں کے لیے بالا بالا ہی جان دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

''میں ابھی چلتا ہوں ذرا تکڑا ہوں اور تجھ سے صرف یہی کہنے آیا تھا کہ تُو کسی قسم کی گڑتی نہ کر۔'' معاً اکو دھاڑیل نے رخصت ہونے کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے کہا......

''کل تک میرا ساتھی پولیس تھانے سے رپورٹ لے کر آئے گا کہ انسپکٹر...... ارشد کتنے ٹکوں میں دودا خان کو رہا کرنے پر راضی ہوا ہے......''

علی بخش اس کی بات سن کر مطمئن ہوگیا...... اکو دھاڑیل نے ایک سیاہ موٹی چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹی...... اجرک کا ڈھاٹا چہرے پر باندھا...... اور اپنی ہیوی مشین گن سنبھالتے ہوئے علی بخش کو تاکیداً بولا...... ''جوان! میں پھر کل اسی وقت آؤں گا...... میرا انتظار کرنا......'' اتنا کہہ کر اکو دھاڑیل وہاں سے چلا گیا۔

☆======☆======☆

اگلے دن حسب وعدہ پہر رات میں اکو دھاڑیل ہوٹل پہنچا...... علی بخش یہ دیکھ کر ٹھٹک سا گیا کہ اکو دھاڑیل کے ساتھ پندرہ بیس مسلح ساتھی بھی تھے اور وہ سب سیاہ رنگت کے اصیل گھوڑوں پر سوار تھے...... وہ سب کے سب ہوٹل کی عقبی بلند دیوار کے ساتھ کھڑے دبیز کہر میں لپٹی ہوئی تاریکی ہی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے...... ہوٹل اس وقت ویران تھا حتیٰ کہ ملازمین بھی سب اپنے گھروں کو جا چکے تھے...... آج جاڑا بھی غضب کا اترا ہوا تھا ماحول میں غضب ناک سکوت سا طاری تھا...... آج لوگ باگ بھی وقت سے پہلے اپنے اپنے گھروں میں جا دبکے تھے...... آج کی سناٹے دار رات جانے کیوں فیصلہ کن گھڑی کا پیش خیمہ محسوس ہو رہی تھی...... اکو دھاڑیل اپنے ساتھیوں کو باہر ہی کھڑا کر کے خود اندر کوٹھڑی میں در آیا۔ جدھر علی بخش سوالیہ نشان بنا اسی کا منتظر تھا۔

''اکو چاچا...... خیریت تو ہے......؟'' علی اسے دیکھتے ہی استفہامیہ لہجے میں بولا۔

''ہا...... خیر ہی ہے...... کل ہمارے ایک آدمی نے ہمیں آ کر یہ خوشخبری دی ہے کہ

انسپکٹر ارشد دوداخان کو روکڑ (رشوت) کے عوض چھوڑنے پر رضا مند ہو گیا ہے...... مگر چونکہ دوداخان ایک قتل جیسی سنگین واردات میں ملوث ہے لہٰذا اس کو آسانی سے رہا کر دینا لوگوں کو اور خود متعلقہ محکمۂ پولیس کو شک میں مبتلا کر سکتا ہے...... اس لیے اب انہوں (پولیس والوں) نے ہمیں پیغام دیا ہے کہ ہم پہلے اپنے کچھ مسلح ساتھیوں کے ہمراہ تھانے کی عمارت میں ہلہ بول دیں پھر محض دکھاوے کے لیے ہمارا پولیس مقابلہ ہو گا پھر اسی ہنگامے کے دوران درون خانہ یعنی تمہارے باپ کو ہمارے حوالے کر دیا جائے گا......'' اکو دھاڑیل نے ایک تفاخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ علی بخش کو تفصیل بتائی مگر جانے کیوں علی بخش کو پھر بھی تسلی محسوس نہ ہوئی کہ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا...... تاہم وہ جلدی سے بولا۔

''اکو چاچا...... کیا میرا پیو رہا ہو جانے کے بعد...... میرا مطلب ہے کہ اس طرح جھوٹ موٹ کے فرار کے بعد کیا وہ ایک مفرور کی حیثیت سے ساری زندگی گزارے گا؟''

اس کی بات سن کر اکو دھاڑیل بولا...... ''اڑے نہیں جوان......! یہ تو تیرے باپ کو جیل سے رہا کرنے کا ایک بہانہ ہو گا اسے تو خود پولیس فرار کرائے گی...... ہمارا تو محض یہ نام ہو گا کہ ڈاکو دوداخان کو چھڑا کر لے گئے...... لہٰذا پھر بعد میں خود ہی پولیس بھی اس کیس کو دبا دے گی...... ویسے کچھ روز تو تیرے پیو دوداخان کو روپوشی کے گزارنے ہی ہوں گے...... اچھا میں اب چلتا ہوں مرشد خیر کرے...... اور ہاں...... وہ جاتے جاتے رکا...... ''تو ادھر ہی موجود رہنا ہم تیری تسلی کی خاطر تیرے پیو دوداخان کو سب سے پہلے یہاں لے کر آئیں گے تاکہ تم دونوں مل لو ایک دوسرے سے......'' اتنا کہہ کر اکو دھاڑیل وہاں سے چلا گیا۔

علی بخش دم بخود سا کھڑا رہ گیا۔ جانے کیوں اتنی تسلی کے باوجود اس کا دل کسی انجانے خطرے کے مارے بری طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ وہ بار بار خود سے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال کر رہا تھا کہ کیا یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا...... جس طرح اکو چاچا نے اسے بتایا تھا......؟ وہ وہیں چٹائی پر بیٹھ گیا...... ہوٹل کا راز داں اکلوتا ملازم خیرو اس کے لیے چائے بنا لایا...... جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا...... علی بخش کے اعصاب وسوسوں کے زیر اثر شل سے ہو رہے تھے...... کہرے میں لپٹی دبیز اور سناٹے دار رات بھاری سل کی طرح سرک رہی تھی۔

اکو دھاڑیل کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی...... باہر ہر سو سناٹے کا راج تھا کہ اچانک علی بخش کو کہیں دو[illegible] سے بگٹٹ دوڑتے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور علی بخش ٹھٹک گیا

پھر وہ فوراً عقبی کوٹھڑی کے پرلے دروازے سے باہر تاریکی میں آ گیا جہاں خنک سی چاندنی طلسم بکھیرے ہوئے تھی...... سامنے اکو دھاڑیل اپنے سیاہ پوش ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑے دوڑاتا ہوا اس کے قریب آ گیا...... علی بخش نے ٹھٹکی ہوئی نگاہوں سے گھوڑے پر بیٹھے اکو دھاڑیل کو دیکھا تو بری طرح اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا...... اکو دھاڑیل کی سرخ انگارہ آنکھیں بجھی بجھی ہوئی تھیں...... اس کے ساتھ ایک گھوڑے کی کمر پر کسی کی خون میں لت پت لاش اوندھی دھری ہوئی تھی جس کی باگیں اکو نے تھام رکھی تھیں...... علی بخش کی سناٹے دار نگاہیں گھوڑے پر دھری خون آلود لاش پر جم سی گئیں۔

''علی بخش...... ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔ پولیس نے تیرے پیو دوداخان کو گولی مار دی ہے۔'' رات کے گمان آمیز سناٹے میں اکو دھاڑیل کی غم اور رقت میں ڈوبی ہوئی آواز نے یک ٹک کھڑے علی بخش کی سماعتوں کو چیر کر رکھ دیا اور علی بخش بے اختیار دوڑ کر گھوڑے کی پیٹھ پر دھرے اپنے باپ کے خون میں لت پت وجود سے لپٹ گیا اور غم واندوہ کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر اس نے اپنے باپ کی لاش کو چمٹانے کے لیے کھینچا تو دوداخان کی لاش کے غیر معمولی وزن نے اس کے قدم یکدم ڈگمگا دیئے اور علی بخش، باپ کے جسد خاکی سمیت بھربھری زمین پر آ رہا۔ علی بخش کے کپڑے بھی باپ کے خون سے رنگ چکے تھے۔ وہ اب بھی اپنے باپ کی لاش سے چمٹا ہوا تھا۔ شدید اور اچانک غم ناگہاں کے باعث اس کی آنکھیں پھیل سی گئی تھیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ہونٹوں پر ایک غم آمیز ارتعاش نمایاں تھا وہ اب زمین پر اکڑوں بیٹھا باپ کا سر اپنے خون آلود زانوؤں پر رکھے ایک ٹک دکھ بھری نظروں سے باپ کے مردہ چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ پھر معاً چند ثانیے بعد اس کا غم آمیز سکتہ ٹوٹا۔

''بابا سائیں یہ کیا ہو گیا؟ آنکھیں کھولو بابا اپنی...... میرا کون ہے تیرے سوا؟ بابا اللہ کے واسطے کچھ تو بول۔ بابا...... بابا'' علی بخش ایک دم زار و قطار رونے لگا۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ اثنائے راہ شکست خوردہ سا اکو دھاڑیل اپنے گھوڑے سے نیچے اترا، علی بخش کے قریب آیا اور اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے ازراہ تشفی بولا۔

''جوان داپٹ...... خود کو سنبھال، حوصلہ رکھ بابا۔'' اکو دھاڑیل مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ وہ خود شرمسار تھا۔ علی بخش اب گھٹے گھٹے انداز میں سسک رہا تھا غمناک رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔

☆======☆======☆

پہلے سوڈھل اور پھر اب دوداخان کی اچانک تلے اوپر اموات نے پورے گوٹھ داد پور کے سادہ لوح اور معصوم باسیوں کو ایک بے نام سی سراسیمگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ دوداخان کو اگرچہ دفنایا جا چکا تھا مگر اس کے گھر والوں نے ابھی اسے اپنے سینوں میں دفن نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی موت کے کئی روز بعد تک افراد خانہ ایک کہرام کی زد میں تھے۔

دوداخان کی موت سے متعلق یہ خبر زبان زد عام ہو چکی تھی کہ اس کے کچھ جرائم پیشہ مسلح ساتھیوں نے دوداخان کو پولیس کی قید سے چھڑانے کی غرض سے تھانے کی عمارت پر حملہ کیا اور پھر دوران پولیس مقابلہ دوداخان پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ دوداخان چونکہ ایک مجرم کی حیثیت سے ہلاک ہوا تھا لہٰذا اس بات کے منفی اثرات اس کی بیوی خیراں اور بیٹے محرم علی پر بھی پڑے۔ جبکہ علی بخش نے یہ مؤقف اختیار کر رکھا تھا کہ اس کے باپ دوداخان کو پولیس نے پہلے سوڈھل کے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار کیا اور پھر بعد میں ایک سازش کے تحت جھوٹا ''مقابلہ'' دکھا کر اسے قتل کر ڈالا۔ مگر امر واقعہ یہ تھا کہ دوداخان مکافات عمل کے تحت خود ہی اپنے کیئے کی سزا بھگت کر راہی عدم ہوا تھا اور حالات و شواہد کو مدنگاہ رکھتے ہوئے گوٹھ کے عوام یہی قیاس آرائی کر رہے تھے کہ دوداخان نے واقعی سوڈھل کا قتل کیا یا کروایا تھا۔ جس کا اہم ''محرک'' سوڈھل کی بھتیجی اللہ رکھی تھی اور جس سے دوداخان شادی کا اس حد تک خواہشمند تھا کہ اس نے بعد میں اسے اپنی ضد اور غیرت کا مسئلہ بنا ڈالا تھا۔ انہی ''چہ میگوئیوں'' کو ہوا دینے والے بھی بہت سے افراد تھے جن میں منشی میرل کے بھی آدمی شامل تھے۔ بہر طور اب بعضے لوگوں کا خیال یہی تھا کہ دوداخان کی موت کے بعد اب یہ ''قضیہ'' نمٹ چکا تھا مگر ایسا تھا نہیں۔ دوداخان مرتے مرتے بھی اپنی غیرت اور ضد کو گویا ایک وصیت آمیز قسم کی صورت میں اپنے بڑے بیٹے علی بخش کے سینے میں منتقل کر گیا تھا اور یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا سوائے خود علی بخش کے۔ انہی سماجی منفی رویوں نے جہاں اس کی سوتیلی ماں خیراں اور اس کے بیٹے محرم علی کو پورے گوٹھ میں خفیف سا کر کے رکھ دیا تھا وہاں معصوم اللہ رکھی کو بھی لوگوں سے نظریں چرانے اور کترانے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ سوڈھل اور دوداخان کے بیچ وجہ فساد اس کو گردانا جا رہا تھا۔ خیراں اور محرم علی تو اب یہ گوٹھ چھوڑنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے اور دوسرے گوٹھ جہاں خیراں کا میکہ تھا ہجرت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مزید برآں ان کی مبینہ سوچ کو مہمیز کرنے والے خیراں کے دونوں بھائی دوست محمد اور محمد علی سرفہرست تھے۔

''ادی خیراں، ہمارا خیال ہے کہ اب تم لوگوں کا اس گوٹھ میں رہنا مناسب نہیں۔''

ایک دن خیراں کے بھائیوں میں سے ایک دوست محمد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تو اس کے دوسرے بھائی محمد علی نے بھی بہن کو اکساتے ہوئے کہا۔

''بلکہ ادی میں تو کہتا ہوں کہ یہ گھر اور ہوٹل کو فروخت کر کے اپنے گوٹھ ہی آ جاؤ۔ وہاں کم از کم ہم تیرے اپنے تو ہیں نا۔ ہم ہیں، ماں پیو ہیں تیرے۔ ادا دوداخان تھا تو ہمیں تیری اتنی گرتی (فکر) نہ ہوتی پر اب۔'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو خیراں کچھ سوچتی ہوئی نگاہوں سے اپنے دونوں بھائیوں کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے بولی۔

''ادا...... چاہتی تو میں بھی یہی ہوں۔ پر علی بخش۔'' اپنے سوتیلے بیٹے کے نام پر وہ یکدم چپ ہو رہی تو اس کے قریب بیٹھے محرم علی نے جھٹ کہا جو خود بھی اپنے دونوں ماموؤں کی بات سے متفق تھا۔

''امڑ...... بھلا علی بخش کون ہوتا ہے ہمیں روکنے والا'' وہ شاید اپنی ماں کے ادھورے جملے کا مطلب جان گیا تھا۔

''ہم کوشش کریں گے اسے بھی منانے کی۔'' دوست محمد بولا۔ ''اور اسے ہماری بات ماننی پڑے گی۔ آخر کو تو بھی اس کی ماں لگتی ہے اس واسطے ہم بھی اس کے بڑے لگتے ہیں۔ بھلے سوتیلے سہی۔'' دوسرے بھائی محمد علی نے کہا۔

''لیکن ہم اس کے ساتھ زبردستی بھی نہیں کر سکتے۔ اگر وہ اڑ گیا تو۔''

''تو ہم بھی اس سے نمٹ لیں گے اچھی طرح۔'' معاً خیراں کے بھائی دوست محمد نے اپنی بہن کی بات کاٹتے ہوئے سخت لہجے میں کہا وہ اس کا بڑا بھائی تھا جبکہ محمد علی خیراں سے چھوٹا تھا۔ دوست محمد کی بات پر محمد علی اور محرم علی اس کی بات پر اپنا سر اثبات میں ہلانے لگے۔

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ معاً علی بخش اندر داخل ہوا۔ وہ سب اسے دیکھ کر بری طرح ٹھٹکے تھے۔ انہیں یوں لگا جیسے علی بخش نے ان کی باتیں سن لی ہوں۔ علی بخش کے کاندھوں پر کلہاڑی ٹکی ہوئی تھی اور وہ نہنگ کے چوڑے درخت کی طرح تنا کھڑا انہیں عجیب سی نظروں سے گھورنے لگا۔

☆======☆======☆

دوداخان کی موت پر ساون کو محض اس حد تک دکھ ہوا تھا کہ وہ اپنے گوٹھ کا آدمی تھا بے شک وہ ناپسندیدہ اور متنازع شخصیت تھا مگر انسانیت کے ناتے بہر طور ساون کو اس کی موت پر افسوس ہوا تھا۔ اب ساون نے جلد سے جلد اللہ رکھی کو حاصل کرنے کی اپنی کوششیں

تیز کر دی تھیں، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ دوداخان سے ڈرتا تھا اور اب اس کے مرتے ہی اس نے اللہ رکھی کو حاصل کرنے کی کوشش تیز کر دی تھی بلکہ وہ تو دوداخان کے روبرو ہو کر اسے للکارا کرتا تھا لیکن اللہ رکھی کے خیال سے وہ خاموش رہتا تھا۔ مگر اب ان سب باتوں کے باوجود ساون کو پھر بھی اللہ رکھی کا حصول اتنا سہل نظر نہیں آ رہا تھا جتنا کہ وہ سمجھ رہا تھا کیونکہ وہ اس معاملے میں اپنے باپ موگو کو قائل نہیں کر سکا تھا جو اس کا اور اس کی بہن ہدایتاں کا رشتہ اپنے بھائی پریل کی خواہش کے مطابق اس کے دونوں بچوں سورٹھ اور گل سے کرنے پر بضد تھا۔ لہٰذا جب ساون نے اپنی ماں سے اللہ رکھی کے ہاں جانے پر دوبارہ اصرار کیا تو وہ بیچاری دل مسوس کر بولی۔

''پٹ ساون! تو اللہ رکھی کا خیال دل سے نکال کیوں نہیں دیتا۔''

ماں کی بات سن کر ساون پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا جانے کیوں ماں کا چہرہ دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ یہ جانتی ہو کہ اس کے شوہر موگو کی ضد یا اٹل فیصلے کے سامنے اس کے بیٹے ساون کی مرضی کی کوئی حیثیت نہیں اور وہ یہ تلخ حقیقت ساون کو بھی گوش گزار کر دینا چاہتی تھی۔

''امڑ! یہ تُو کیا کہہ رہی ہے۔ کیا تُو یہ چاہتی ہے کہ میں کبھی گھاتو کی طرح نظر نہ آؤں ......اور بھنبھور کے جیل بھٹ (ریت کے ٹیلے) میں کھو جاؤں۔'' ساون نے کلس کر ماں سے کہا تو وہ بیچاری دہل سی گئی۔

اس وقت چمکیلی دوپہر ڈھل رہی تھی اور ٹھٹھرتی ہوئی شام اپنے یخ بستہ پر تولنے کو تھی۔ ''پٹ ساون! میں جانتی ہوں تیرا پیو نہیں مانے گا۔ وہ اپنی ہٹ کا پکا ہے۔''

''امڑ! پھر میں کیا کروں؟ تو پھر پیو کو بتا دے کہ میں اللہ رکھی کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گا۔''

اس اثناء میں موگو بھی تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا۔ اس کے باہر صحن میں کھانسنے کی آواز ابھری تھی۔ ساون کی ماں فوراً کوٹھڑی سے نکل گئی ساون اندر ہی ٹھہرا رہا۔ وہ ابھی باپ کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے صحن میں سے باپ کی گونجیلی سی آواز سنائی دی وہ اس کی ماں سے مخاطب تھا۔ ''ڑی ساون کی ماں! کیا کہتا ہے پھر تیرا پٹ۔ میں نے اپنے پریل کو آج جواب دینا ہے۔'' باپ کے گفتگو کرنے کی آواز ساون کو صاف سنائی دے رہی تھی جسے سن کر اس کے چہرے پر قدرے ناگواری کے تاثرات عود کر آئے تھے اور وہ غصے سے سوچنے لگا کہ آخر اس کا باپ اس پر کیوں اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اس

نے محسوس کیا کہ جواباً اس کی ماں کی کوئی آواز نہیں ابھری تھی وہ غالباً خاموش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ساون کو دوبارہ اپنے باپ کی آواز سنائی دی اس بار وہ قدرے غصیلے لہجے میں اس کی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''تُو بات نہیں کرتی تو میں آپے ہی بات کرلوں گا اس سے۔ میرے خیال میں وہ اندر ہی کوٹھڑی میں ہے۔''

ساون کا دماغ شل سا ہونے لگا۔

''ڑے چھورا...... باہر آ بات کرنی ہے تیرے ساتھ۔'' معاً ساون کو پھر باپ کی تیز آواز سنائی دی اس نے باہر ہی بیٹھے بیٹھے اسے پکارا تھا۔ تب ساون کو اپنی ماں کی بھی آواز آئی۔ وہ اس کے باپ سے مخاطب تھی۔

''ذرا ماٹھ کر۔ ساون کے پیو۔ آپڑاں پٹ ہے......تُو......تُو اسے۔''

''چنگا چنگا تُو بند کر اپنی بکواس......'' موگو نے اپنی بیوی کی بات کاٹتے ہوئے غصیلے لہجے میں اسے ٹوکا۔ ساون کے لیے اب اندر ٹھہرے رہنا محال ہونے لگا اور وہ باہر صحن میں آ گیا۔ جہاں ایک کھری چارپائی پر اس کا باپ موگو براجمان تھا۔ اس کی چارپائی کے قریب ساون کی ماں اور بہن ہدایتاں کچھ اس انداز میں مبتلائے اضطراب کھڑی تھیں جیسے ابھی دونوں باپ بیٹے کے بیچ کوئی جھگڑا ہونے والا ہو اور وہ دونوں درمیان میں کودنے کے لیے تیار ہوں۔

''ہاں بابا...... ساون...... کیا کہتا ہے پھر تُو۔ تیرے چاچے پریل کو کیا جواب دوں میں۔'' ساون کو دیکھتے ہی موگو نے پوچھا۔ انداز ایسا تھا جیسے ابھی ساون نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے منہ سے کوئی لفظ نکالا تو وہ اس پر چڑھ دوڑے گا۔ ساون نے ایک نگاہ باپ کے چہرے پر ڈالی۔ پھر اسے جھکا کر اعتماد سے بولا۔ ''بابا...... میں اپنی مرضی کہہ چکا ہوں۔ میں اگر شادی کروں گا تو صرف اللہ رکھی......''

''ہونہہ...... اللہ رکھی...... اللہ رکھی...... کیا دیکھا ہے اس چھوکری میں۔'' موگو جیسے ادھار کھائے بیٹھا تھا وہ بیٹے کی بات کاٹ کر تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔ ''تجھے پتہ ہے وہ چھوکری منحوس ہے۔ جس کے پیچھے دو قتل ہو گئے۔ گوٹھ کے سارے لوگ اسے کیا سمجھنے لگے ہیں جانتا ہے تُو...... نہ جانے اور کتنوں کو اس نے اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔''

''بابا۔'' ساون اتنی زور سے چلایا کہ اس کا باپ ایک لمحے کو یک ٹک اسے تکتا رہ گیا۔ ساون کی تیز نگاہیں باپ کے دم بخود چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ مگر پھر اگلے ہی لمحے جیسے ساون خفت محسوس کرنے لگا اور پھر جب اپنا پاؤں پٹختا ہوا باہر جانے کے لیے......

باپ کی چارپائی کے قریب سے گزرنے لگا تو اسے اپنے باپ کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''گھر واپس لوٹنے سے پہلے تجھے ایک فیصلہ کرنا ہوگا اگر تجھے میری بات قبول نہیں تو تُو بھی مجھے قبول نہیں۔'' باپ کی دھمکی نے ساون کو مزید خودسر اور سرکش بنا دیا۔ لہٰذا وہ بغیر رکے دانت پیستا ہوا گھر سے نکل گیا۔ صحن میں غصے سے کانپتے ہوئے موگو کی چارپائی کے قریب سہمی کھڑی ماں بیٹیوں کے چہروں پر مردنی سی چھاتی چلی گئی۔

☆======☆======☆

بالآخر ڈرتے اور جھجکتے ہوئے چاچی عنایتاں مائی عجیباں کے ساتھ اپنی بیل گاڑی میں سوار ہو کر خیراں کے ہاں پہنچیں۔ اس وقت اتفاق سے وہ گھر پر تنہا موجود تھی۔ بعد تبادلۂ رسمی کلمات کے چاچی عنایتاں تیس ہزار کی رقم کی پوٹلی دوداخان کی بیوہ خیراں کو لوٹاتے ہوئے بولی۔ ''میں اللہ رکھی کی چاچی ہوں دوداخان نے یہ رقم میرے مڑس سوڈھل کو اللہ رکھی کے سنگ کے واسطے اسے دی تھی۔ رب سائیں دونوں کو جنت نصیب کرے اب وہ دونوں نہیں رہے اس دنیا میں۔ مگر تیرے مڑس دوداخان کی رقم میرے پاس امانت کے طور پر تھی جواب میں تمہیں لوٹا رہی ہوں۔ پورے تیس ہزار ہیں۔''

خیراں کے چہرے پر اس کی بات پر عجیب سے تاثرات ابھرے، پھر روپوں کی پوٹلی کی جانب دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک رنگ سا گزرا اور اگلے ہی لمحے خیراں نے بھیدوں بھری خاموشی کے ساتھ عنایتاں کے ہاتھ سے روپوں کی پوٹلی لے لی۔

''ادی ماں واری! گن لو تو چنگی بات ہے۔'' عنایتاں رسان سے بولی تو جواباً خیراں بولی۔

''ادی! آج کے دور میں اس طرح کون روپے لوٹاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پورے ہوں گے۔''

''بس ادی تُو نے یہ روپے لے کر میرے سر سے بار اتار دیا۔ اب چلتی ہوں۔'' عنایتاں طمانیت بھرے لہجے میں بولی اور چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اڑی ادی بیٹھو ذرا پانی ٹکر تو کھاؤ۔'' خیراں بولی۔ مگر چاچی عنایتاں نے معذرت کی اور مائی عجیباں کے ساتھ گھر سے باہر آ گئی۔ جدھر اس کی بیل گاڑی کھڑی تھی اس میں اللہ رکھی کے دونوں بیل ہیرا اور سانولا جتے ہوئے تھے۔ چاچی عنایتاں نے چابک کے طور پر باریک سی درخت کی شاخ تھام رکھی تھی۔ وہ خود ہی بیل گاڑی چلاتی ہوئی یہاں تک پہنچی

تھی۔

گزرتا ہوا وقت سہ پہر میں داخل ہو رہا تھا معاً سامنے گلی میں علی بخش نمودار ہوا۔ وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ چاچی عنایتاں اور علی بخش دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ علی بخش قریب آیا۔ ایک اچٹتی سی نگاہ بیل گاڑی پر بیٹھی دونوں عورتوں کی جانب ڈالی اور پھر اپنے گھر کا ٹاٹ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھی خیراں روپوں کی پوٹلی اپنی گود میں پھیلائے نوٹ گن رہی تھی۔ علی بخش کو دیکھتے ہی جلدی سے اس نے وہ پوٹلی لپیٹ لی اور اپنی اجرک والی چادر کے اندر چھپالی۔ علی بخش کی تیز نظروں نے فوراً بھانپ لیا کہ اس کی سوتیلی ماں نے کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم وہ اس کی اس مشکوک حرکت کو خاطر میں لائے بغیر اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں آ کر وہ اپنی چارپائی پر نیم دراز ہو کر سوچنے لگا کہ آخر وہ دروازے پر موجود دو بوڑھی عورتیں کون تھیں؟ علی بخش نے چونکہ اپنی ماں کے ہاتھ میں نوٹوں کی پوٹلی دیکھ لی تھی جو اس نے اپنی چادر کے اندر جلدی سے چھپالی تھی۔ لہٰذا اس نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ روپوں کی اس بھاری پوٹلی کا تعلق ان دونوں اجنبی بوڑھی عورتوں کے ساتھ تھا۔ حالات نے اسے بچپن سے ہی زود فہم بنایا ہوا تھا لہٰذا ایک خیال جھماکے سے اس کے دماغ میں ابھرا اور پھر وہ جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اب صحن میں بچھی چارپائی پر اس کی ماں خیراں موجود نہ تھی۔ شاید وہ دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔ علی بخش فوراً گھر سے باہر نکلا اور بیل گاڑی کے پہیوں کے نشانات دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ ذرا ہی دور اسے وہ بیل گاڑی نظر آ گئی۔ بیل گاڑی درمیانی رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی اور علی بخش بھی محتاط روی سے تعاقب میں تھا۔ ذرا دیر بعد جب بیل گاڑی ایک گھر کے دروازے پر رکی تو علی بخش ٹھٹکا وہ سوڈھل کا گھر تھا۔ جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اب اس کا خیال جو شک کا مرہون منت تھا یقین میں بدلنے لگا۔ تاہم وہ خاموشی سے واپس اپنے گھر کی جانب ہو لیا۔ وہ دوبارہ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ آج اسے اپنی ماں کی آنکھوں میں ایک چور سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے صاف اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ اس کی ماں اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ علی بخش اپنے کمرے میں آ کر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

☆======☆======☆

یہ صبح کا وقت تھا۔ آج اللہ رکھی کھیتوں میں نہیں گئی تھی اسی لئے گھر میں موجود تھی۔ حسب معمولی چاچی عنایتاں صحن میں بیٹھی دھوپ کے قدرتی وٹامن ڈی سے اپنی جان

استخواں کو مستفید کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' اللہ رکھی اس وقت دروازے کے قریب ہی موجود تھی۔ جدھر وہ پیال کی ڈھیری اکٹھی کر رہی تھی۔ تب جواباً باہر سے کسی اجنبی کی آواز آئی۔

''میں علی بخش ہوں۔ دوداخان مرحوم کا وڈا پٹ۔'' یہ سن کر اللہ رکھی سامنے بیٹھی اپنی چاچی عنایتاں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ چاچی عنایتاں نے فوراً اللہ رکھی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ متذبذب کھڑی اللہ رکھی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے اسے ایک لمبا سا لڑکا کھڑا دکھائی دیا جو سپاٹ سی نظریں جمائے اللہ رکھی کی جانب گھور رہا تھا۔ یہ علی بخش تھا۔

''دھیئے! اس کو اندر ہی بلا لے آپڑاں ہی بچہ ہے...... آجا پٹ علی۔'' چاچی عنایتاں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اللہ رکھی اور پھر علی بخش کو بیک وقت مخاطب کرتے ہوئے قدرے اپنائیت سے کہا تو علی بخش اللہ رکھی پر نظریں جمائے جمائے اندر آ گیا۔ اللہ رکھی کو اس کا یہ انداز ذرا نہیں بھایا تھا تاہم وہ ایک طرف ہو چکی تھی اسے علی بخش کے چہرے پر دوداخان کی شبیہہ نظر آ رہی تھی جو اسے کافی ناگوار گزرتی تھی وہ اس کی اچانک آمد پر کچھ الجھن آمیز پریشانی میں بھی مبتلا ہونے لگی تھی۔

علی بخش نے عنایتاں کے قریب جا کر اسے سرسری انداز میں سلام کیا پھر پوچھا۔

''کیا تُو نے میری سوتیلی ماں خیراں کو کوئی رقم دی ہے۔'' لہجہ حد درجہ اکھڑ تھا چاچی عنایتاں یک ٹک اس کا چہرہ تکنے لگی۔ پھر چونکی اور اٹکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ہاں...... ہاں میں نے خیراں کو پورے تیس ہزار روپے لوٹا دیئے ہیں جو دوداخان نے اللہ رکھی کے سنگ کے لیے میرے مڑس سوڈھل کو دیئے تھے۔''

''ٹھیک ہے پھر تجھے اب اللہ رکھی کا سنگ...... میرا مطلب ہے اس کی شادی گوٹھ کے باہر کرنی ہوگی۔ میرا مطلب تو سمجھ رہی ہے نا کراڑی (بوڑھی)۔'' علی بخش نے قدرے بدتمیزی سے کہا تب چاچی عنایتاں کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ بھی تیز لہجے میں اسے سرزنش کرتے ہوئے بولی۔

''تجھے شرم آنی چاہئے چھورا (لڑکے) میں تیری ماں جیسی ہوں۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے ماسی۔'' علی بخش نے جواب طلب لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں درشتگی برقرار تھی۔

''تو سن لے پھر اللہ رکھی میری دھی ہے اور یہ میری مرضی ہے کہ میں اس کا بیاہ اس

گوٹھ میں کروں یا گوٹھ سے باہر، تُو کون ہوتا ہے ہم پر اپنی مرضی جمانے والا۔'' چاچی عنایتاں اس بار پوری طرح جوش میں آ گئی تھی۔

اللہ رکھی ایک جانب پریشان سی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی علی بخش پر غصہ آ رہا تھا جو خواہ مخواہ اپنی ہٹ دھرمی دکھا رہا تھا۔ علی بخش کی آنکھوں میں چاچی عنایتاں کی تیز وتند گفتگو پر معاندانہ سی چمک لہرائی پھر اسی لہجے میں دوبارہ بولا۔ ''ماسی! تیری دھی اللہ رکھی میرے پیو دوداخان کی منگ تھی۔ کیونکہ تیرے مڑس سوڈھل نے اللہ رکھی کو میرے پیو کے نام کر دیا تھا۔''

''تُو یہاں سے چلا جا چھوکرا...... یہ مت سمجھنا کہ یہاں کوئی مرد نہیں اور ہم زنانیاں اکیلی ہیں، سمجھ گیا۔ آپڑیں وڈوں کو واڈھرلا......'' چاچی عنایتاں کا غصہ اب آسمان کو چھونے لگا تھا اور وہ بپھری ہوئی نگاہوں سے علی بخش کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ اب چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ علی بخش نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور ایک بار پھر چاچی عنایتاں اور اللہ رکھی کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا پاؤں پٹخ کر وہاں سے چلا گیا اور قریب کھڑی اللہ رکھی نے علی بخش کے جاتے ہی اپنے منہ سے ''ہونہہ'' کیا اور آگے بڑھ کر دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

☆======☆======☆

ان دنوں خیراں کی شادی شدہ بیٹی اور محرم علی کی بڑی بہن شمع اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کی گود میں اس کا ننھا منا بیٹا بھی تھا اور اس کا ایک ماموں دوست محمد بھی آیا ہوا تھا۔ ان تینوں نے محرم علی کے رشتے کے سلسلے میں پریل کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا، وہ سورٹھ کا رشتہ لینے جا رہے تھے۔ یہ پریل ساون کا چاچا تھا۔ جس کی جوان بیٹی سورٹھ سے محرم علی بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ زور وشور کے ساتھ خوشی خوشی تیاریوں میں مشغول تھے۔ صحن میں کچھ پھول اور مٹھائیوں کی ٹوکریاں بھی بندھی پڑی تھیں جوان لوگوں نے پریل کے ہاں لے جانی تھیں۔ اس وقت علی بخش بھی گھر میں موجود تھا اور انہیں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ اپنے باپ دوداخان کی موت کے بعد سے وہ اب خود کو اس گھر میں اس قدر تنہا محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے بعض مرتبہ یہاں گھٹن سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ دوداخان اس گھر کا سربراہ تھا۔ اگرچہ اس کی زندگی میں بھی علی بخش اپنی سوتیلی ماں کی طرف سے بے اعتنائی کا شکار رہتا تھا مگر اب اس کی موت کے بعد سے تو جیسے اس گھر میں اس کی حیثیت عضوِ معطل کی سی ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ علی بخش کی جب اپنے سوتیلے بھائی محرم علی

سے گرما گرمی ہونے لگتی تھی تو سب مل کر اسے کھانے کو دوڑتے تھے اور ان میں سرفہرست محرم علی کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی ہوتے تھے۔ جو اپنے بہنوئی دودا خان کی موت کے بعد سے بہن کے گھر کچھ زیادہ ہی آنے لگے تھے۔

اس وقت یہ لوگ دوپہر کے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ علی بخش اپنی کوٹھڑی میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا دماغ یہ سوچ سوچ کر شل ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ماں خیراں سے پوچھے کہ اس نے اللہ رکھی کی چاچی عنایتاں سے پیسے واپس لے کر رکھ لئے اور اُسے بتایا بھی نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بہر طور اور تو اسے کچھ نہ سوجھا۔ بس وہ اٹھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

''ہونہہ...... جب دیکھو غصے میں بھرا رہتا ہے پتہ نہیں کس بات کی اسے گرمی چڑھی رہتی ہے۔'' علی بخش کے گھر سے نکلتے ہی اس کی سوتیلی ماں خیراں نے تضحیک آمیز لہجے میں منہ بسورتے ہوئے کہا تو پاس کھڑا اس کا چہیتا بھائی دوست محمد بھی ''بہن'' کی چاپلوسی کرتے ہوئے ہاں میں ہاں ملا کر بولا۔

''تو صحیح کہتی ہے ادی خیراں! گرمی تو اب اسے ہمیں دیکھ کر چڑھے گی نا۔ آخر کو لاوارث جو ہوا۔''

شمع جو پاس ہی کھڑی برقعہ اوڑھ رہی تھی اسے اپنے ماموں کے یہ الفاظ قدرے برے لگے۔ علی بخش اس کا سوتیلا بھائی سہی مگر وہ اپنے سوتیلے بھائی علی بخش کی عزت کرتی تھی۔ وہ ماموں سے بولی۔ ''ماما سائیں! ایسا مت بول وہ بیچارا غریب ہے۔ اکیلا ہے اگر ہم اس طرح اس کے بارے میں سوچیں گے تو وہ خود کو مزید تنہا سمجھنے لگے گا۔''

''اچھا...... چل زیادہ طرفداری نہ کر اس کی تیاری پکڑ اور اٹھا اپنے ننھے خوشی محمد کو۔'' اس کی ماں خیراں نے جز بز ہو کر کہا اور پھر یہ تینوں گھر سے نکل گئے۔

پریل کا گھر اگرچہ خاصا کشادہ تھا لیکن گارے مٹی کی کچی دیواروں سے بنا ہوا تھا۔ کمرہ نما کوٹھڑیوں میں بھی گنجائش زیادہ تھی اور صحن بھی اس حد تک وسیع تھا کہ اس کے ایک جانب گائے بھینسوں کے لیے چارہ کترنے والی آہنی مشین نصب تھی جو ہاتھ کی مدد سے چلائی جاتی تھی اور دوسرے حصے میں پھوس اور سرکنڈوں سے بنے چھپر نما سائباں تلے ایک کھرلی کے قریب گائے بھینسیں جگالی کر رہی تھیں۔ چند ایک بکریوں کے علاوہ دیسی مرغیاں بھی کڑکڑاتی پھر رہی تھیں۔

پریل اور اس کے گھر والوں نے خیراں وغیرہ کا پُرتپاک استقبال کیا۔ پریل اور اس

کا بیٹا گل محمد تو دوست محمد کے ہمراہ اوطاق نما ایک کمرے میں براجمان ہو گئے جبکہ دیگر گھر کی عورتیں اندر کوٹھڑی میں مصروف گفتگو ہو گئے۔

''سنگت سائیں! اور سب خیر ہے نا...... بال بچہ خوش ہے۔'' پریل نے روایت کے مطابق اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے دوست محمد سے کہا۔ وہ دبلا پتلا اور سانولی رنگت کا شخص ایک سیدھا سادہ ہاری نظر آ رہا تھا۔ عمر چالیس سے کچھ متجاوز ہی تھی۔

دوست محمد نے بھی جواباً ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''ہا سائیں...... مولا سائیں کا فضل ہے عزت کی مانی ٹکر کھا رہے ہیں۔''

وہ لوگ سب چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ گل محمد اب تک چپ تھا اس کے بعد پھر پریل جب دوست محمد کے بہنوئی دودا خان کی موت سے متعلق رسماً اظہار افسوس اور اس کی شان میں قصیدے گنوانے کے بعد چپ ہوا تو دوست محمد گلا صاف کر کے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ''سائیں پریل چاچا تم تو جانتے ہی ہو گے کہ اگر گھر کا کوئی فرد اچانک چلا جائے تو اس کی یاد عرصے تک در و دیوار سے چمٹی رہتی ہے۔ ویسے تو کوئی دوسرا جانے والے کی جگہ نہیں لے سکتا مگر ایک تبدیلی کے تحت کسی کو اپنا لیا جائے تو وہ بھی گھر کے فرد ہی کی طرح خوشیاں بکھیرتا ہے۔'' دوست محمد چند ثانیے رکا اور پھر بولنا شروع ہو گیا۔ ''میری بیوہ بہن خیراں کا ایک ہی پٹ ہے۔ محرم علی نام ہے اس کا، اچھا لڑکا ہے اپنا ہوٹل سنبھالتا ہے۔ اب گھر کی اداسی کو ختم کرنے کی خاطر ہم چاہتے ہیں کہ اس کا سہرا سجا دیں۔ چاچا سائیں! تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔'' دوست محمد نے اسے مخاطب کیا۔

مخاطب کرنے پر وہ چونک کر بولا۔ ''ہا...... ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔'' اس کے تفہیمی لہجے نے دوست محمد کو مطمئن سا کر دیا۔

''میں لڑکے کا ماموں ہوں سگا۔ باپ تو اس کا رہا نہیں، پر اب یہ ذمہ داری آخر مجھے ہی نبھانی ہے۔'' دوست محمد اتنا کہہ کر خاموشی سے پریل کا چہرہ تکنے لگا جو کسی گہری سوچ میں غلطاں تھا وہ ان کے آنے کا مقصد تو کب کا جان چکا تھا کہ وہ اس کی جوان بیٹی سورٹھ کا رشتہ لینے آئے ہیں اور سردست اس کا انکار کرنے کا بھی ارادہ نہیں تھا مگر اس سلسلے میں وہ کچھ اور چاہتا تھا۔ اسے خاموش پا کر دوست محمد اپنے تئیں یہ سمجھا کہ پریل ''عوضانے'' کی مالیت جاننا چاہتا ہے بیٹی کا رشتہ دینے کے سلسلے میں...... لہٰذا وہ اس بار صراحتاً بولا۔ ''سائیں مان وارا...... آپ عوضانے کی گڑتی نہ کریں بس ''ہاں'' کر دیں۔''

''نہیں...... نہیں یہ بات نہیں ہے بابا۔'' پریل اس کا مطلب سمجھتے ہوئے قدرے

خفیف ہو کر بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنی بیٹی سورٹھ کے سنگ کے سلسلے میں روپیہ نہیں بلکہ اپنے بیٹے گل محمد کے لئے سنگ لینا چاہتا ہوں اسی لیے میں اپنے بڑے بھائی موگو سے بھی بات کر چکا ہوں لیکن......''

''لیکن کیا؟'' دوست محمد یوں جلدی سے بولا جیسے اسے کچھ امید سی ہو چکی ہو۔

''لیکن...... میرے بھائی موگو نے ابھی تک مجھے کوئی واضح جواب نہیں دیا ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے اگر عوضہ کے طور پر سنگ ہی لینا چاہتے ہو تو پھر ہمیں منظور ہے تمہاری یہ شرط۔'' دوست محمد جلدی سے اس کی بات سن کر بولا اور پریل ہولے ہولے پُرسوچ انداز میں اپنا سر اثبات میں ہلانے لگا۔

☆======☆======☆

اس شام ساون اپنے باپ موگو سے ناراض ہو کر پہلے کادو جکھرانی کے چھپر ہوٹل میں بیٹھا رہا پھر اس کے بعد وہاں سے نہر پر پہنچا جدھر حسب معمول اللہ رکھی پانی کا کلسا لئے واپس لوٹ رہی تھی۔ ساون نے اسے دیکھتے ہی ساری صورت حال بتا دی۔

''ساون! تُو آپڑیں پیو سے نہ لڑا کر۔ وہ وڈا ہے تیرے سے۔'' باپ سے ناراضگی کا سن کر وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی تو وہ حیرت ناک نظروں سے اللہ رکھی کی جانب تکتے ہوئے بولا۔

''میں آپڑیں پیو سے اس لیے لڑتا ہوں کہ وہ اپنی ضد زبردستی میرے سر پہ تھوپ رہا ہے۔ کیا میں اس سے یہ بھی نہیں کہوں کہ زندگی میں نے گزارنی ہے۔ اپنی گھر والی کے ساتھ۔''

''تُو ایسا کر چاچی امڑ کو بول کہ وہ تیرے پیو کو سمجھائے۔'' اللہ رکھی نے گویا اسے مشورہ یا اس کا اشارہ ساون کی ماں کی طرف تھا۔

ساون نے ناگواری سے اپنے سر کو ہولے سے جھٹکا دیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ''یہ بھی کر چکا ہوں۔ پر پیو نہیں مانتا اس کی بھی، اسے بیوی اور بیٹے سے زیادہ اپنے بھائی پریل کے تعلقات عزیز ہیں۔''

اس کی بات سن کر اللہ رکھی کے شگفتہ سے چہرے پر فکرمندی کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ پھر جیسے اچانک اسے کسی بات کا خیال آیا اور یکدم پریشان کن انداز میں چونکی اور کچھ کہتے کہتے رک گئی، لیکن ساون نے اس کی پریشانی کو بھانپ لیا وہ بولا۔ ''کیا بات ہے اللہ رکھی۔ تُو کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔''

''ہاں...... وہ...... ساون، علی بخش آیا تھا۔ گھر ہمارے۔'' اللہ رکھی نے بالآخر اٹکتے

ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا؟'' ساون غیر یقینی سے انداز میں چونکا۔ ''علی بخش آیا تھا؟ دودا خان کا بیٹا!''

''ہاں۔'' اللہ رکھی نے کہا اور پھر اسے بتانے لگی کہ وہ کس طرح اسے اور چاچی عنایتاں کو سنگ کے سلسلے میں دھمکا کر گیا ہے۔

''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی اتنی جرأت ہوئی کیسے۔'' ساون اللہ رکھی کی بات سن کر یکدم آپے سے باہر گیا۔

''نہیں ساون! تجھے میری قسم ایسا مت کرنا۔ تجھے کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا؟'' اللہ رکھی یکدم غمزدہ لہجے میں بولی۔

''نہیں اللہ رکھی مجھے کچھ نہیں ہو گا علی بخش کو سبق سکھانا پڑے گا۔'' ساون دانت پیس کر بولا اور اللہ رکھی متوحش چہرے کے ساتھ اس کی جانب دیکھنے لگی۔

☆======☆======☆

علی بخش کے ہوٹل میں بیٹھنے کے اوقات کار وہی صبح کے ہی تھے مگر وہ شام میں بھی کبھی کبھار چلا جایا کرتا تھا۔ ہوٹل کے دونوں وقتوں کی کمائی خیراں اپنے پاس رکھتی اور اس میں سے بطور جیب خرچ اپنے بیٹے محرم علی اور علی بخش کو بھی دیا کرتی تھی۔ علی بخش بیچارے کو تو حسب توقع برائے نام ہی جیب خرچ ملتا تھا، لیکن وہ کہتا کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے ''کہنے'' کی کوئی ''شنوائی'' نہیں ہو گی۔ بھلا بھرے پُرے گھر میں ایک تنہا شخص کی کس کو پروا ہو سکتی ہے۔ پھر دن بدن اس کی سوتیلی ماں اور بھائی محرم علی کی چیرہ دستیوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا اب اس کے سوتیلے ماموں دوست محمد اور محمد علی بھی علی بخش کے منہ کو آنے لگے تھے اور اکثر بہن کے گھر پر ڈیرہ جمائے رہتے تھے۔ محرم علی اور اس کی ماں خیراں ان کی شہ پر اکڑتے پھرتے تھے۔ علی بخش کے دل میں شدت سے باپ دودا خان کے لیے پھر نفرت کا خوابیدہ آتش فشاں سلگنے لگا۔ وہ اپنے اکیلے پن اور دکھوں کا ذمہ دار اپنے باپ کو ٹھہراتا۔ اس کی وجہ سے وہ آج ایک خاندان کا فرد ہوتے ہوئے بھی تنہا اور بیگانہ تھا۔ اس کے باوجود اس کا باپ دودا خان مرتے ہوئے اس کی رگ حمیت بھڑکا گیا تھا۔ علی بخش جیسے انسان غیر معمولی طور پر حساس ہونے کی وجہ سے انتقال وصیت کا پاس بھی زیادہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے لیے اللہ رکھی کے سلسلے میں چپکا بیٹھ رہنا ناممکن اور دشوار تھا۔ اس دن وہ یونہی جب اپنے ہوٹل گیا تو وہاں حسب معمول محرم علی اپنے دونوں ماموؤں کے ہمراہ بیٹھا ایک بھنا ہوا مرغ مسلم اڑا رہا تھا۔ علی بخش دل میں کڑھتا ہوا کاؤنٹر

کے ایک جانب جا بیٹھا۔

''اڑے یار علی بخش...... آ بابا شامل ہو جا تو بھی۔ ہم تیرے اپنے ہی ہیں آ جا۔'' اس کے ایک سوتیلے ماموں نے قدرے خلوص کے ساتھ دعوت دی۔ اس کے دانت مرغ کی ٹانگ بھنبھوڑنے میں مصروف تھے۔ علی بخش کو اس کے دوستانہ لہجے سے حیرت سی ہوئی۔ تاہم وہ چپ رہا تو اس کا دوسرا ماموں محمد علی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی جانب آیا اور بڑی ہمدردی سے اسے شانوں سے پکڑ کر زبردستی اپنے درمیان کھینچ لایا۔

''یار تو خود کو ہم سب سے کیوں الگ سمجھتا ہے۔ لے کھا موج کر۔'' دوست محمد نے ایک سالم ٹانگ اس کی جانب بڑھائی۔

علی بخش جیسے انسان کی نفسیات بہت معصوم ہوتی ہے۔ پیار اور انس کے دو بول انہیں متاثر کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ وہ ہنوز ورطۂ حیرت میں مبتلا تھا کہ آج اس کے سوتیلے ماموؤں کا رویہ کیوں اچانک بدل گیا تھا۔ جبکہ محرم علی چپ چاپ کھانے میں مشغول تھا۔

علی بخش خاموشی سے ایک بھنی ہوئی ٹانگ چبانے لگا۔ ''دیکھ علی بخش ہم تیرے بڑے ہیں اور تمہارا فائدہ بھی چاہیں گے۔'' بالآخر دوست محمد نے کہنا شروع کیا۔ ''اس گوٹھ میں رہنا اب تم لوگوں کے لیے مناسب نہیں۔ میں کہتا ہوں یہ ہوٹل اور گھر بار بیچ باچ کر ہمارے گوٹھ مدد پور آ جاؤ۔''

علی بخش نے فوراً بھنویں سکیڑ لیں اور اب وہ اپنے سوتیلے ماموں کی مکاری سمجھنے لگا تھا لہٰذا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور ناگواری سے ایک جانب گھورنے لگا۔ ''آئندہ مجھ سے ایسی بات نہ کہنا میں اپنے باپ دادا کی نشانیاں نہیں چھوڑ سکتا۔'' علی بخش نے زہر خند لہجے میں کہا وہ جان گیا تھا کہ اس کے ماموں اس پر اس قدر التفات کیوں کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علی بخش کی جوابی کارروائی نے ان کے چہروں سے ہمدردی اور ملنساری کا ملمع اتار دیا اور وہ دونوں ایک ساتھ غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ محرم علی بھی طیش کے مارے کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ماموؤں کو مخاطب کرتے ہوئے علی بخش کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''ماما سائیں میں نے تیرے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ سیدھے منہ بات کرنے والا نہیں۔ بھلا یہ کون ہوتا ہے ہمارے معاملے میں دخل اندازی کرنے والا، ہماری مرضی ہم اس ہوٹل کو بیچیں یا نہیں۔''

محرم علی کی زہریلی گفتگو نے علی بخش کو بھی بھنا کر رکھ دیا اور وہ بھی جواباً محرم علی سے زہر خند لہجے میں بولا۔ ''میں تیرا بڑا بھائی ہوں اور میرا ہر چیز پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ایک باپ کی اولاد کا ہوتا ہے۔ میری مرضی کے خلاف تم ہوٹل تو کیا اس کی ایک بینچ بھی نہیں بیچ سکتے...... سمجھے۔''

اس کی بات نے تو جیسے محرم علی کو غضب ناک بنا دیا اور آستینیں چڑھاتا ہوا علی کے خاصے قریب آ کر بولا۔ ''میں یہ سب بیچ کر رہوں گا تو کیا کر لے گا۔''

''میں راجواڑیں فیصلہ کرواؤں گا پوری برادری بٹھاؤں گا کچہری کراؤں گا۔'' علی بخش بھی غیظ آلود لہجے میں بولا۔ تو پہلی بار محرم علی کے ماموں دوست محمد اور محمد علی کے چہروں پر الجھن سی تیر گئی۔ خود محرم علی بھی علی بخش کی بات پر متردد نظر آنے لگا تھا، ان کی اس گرما گرمی کو دیکھ کر ہوٹل کے ملازمین اور دیگر لوگ بھی بغرض صلح صفائی ان کے قریب آ موجود ہوئے تھے مگر خیر رہی کہ بات ہاتھا پائی کے بغیر ہی موقوف ہو گئی اور وہ سب ایک دوسرے کی جانب گھورتے ہوئے اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھے۔ علی بخش بھی نخوت کے ساتھ اپنی جگہ کرسی پر بیٹھ گیا مگر پھر اس نے وہاں سے جانے کا ارادہ کیا اور ابھی وہ اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ ساون پر پڑی وہ اس کی جانب تیز تیز قدموں سے چلا آ رہا تھا۔ علی بخش نے اس کے کاندھے پر ٹکی کلہاڑی دیکھ لی تھی۔ خود اس کے کاندھے پر بھی اس وقت کلہاڑی موجود تھی۔ ساون کے بپھرے ہوئے تیوروں کو بھانپتے ہوئے علی بخش بھی محتاط ہو کر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ ''علی بخش!'' ساون اسے گھورتے ہوئے دھاڑ کر بولا۔ ''تو بھی وہی غلطی کر رہا ہے جو تیرے باپ دودا خان نے کی تھی۔''

''میرے باپ کا نام نہ لے ساون ورنہ۔'' علی بخش گرج کر ساون کو دھمکی دینے والے انداز میں بولا تو ساون کی آنکھوں میں شعلے رقصاں ہو گئے اور وہ زہر خند لہجے میں قدرے حقارت سے علی بخش کو گھورتے ہوئے بولا۔

''تو کیا سمجھتا ہے خود کو...... دو معصوم عورتوں کو دھمکانے کے بعد تو مجھے بھی دھمکا دے گا۔'' ساون کا اشارہ واضح طور پر اللہ رکھی اور اس کی چاچی عنایتاں کی طرف تھا علی بخش اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔ دیگر لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ محرم علی اور اس کے دونوں ماموں بھی بڑی دلچسپی سے علی بخش اور ساون کے درمیان ہونے والی اس تکرار کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز و اطوار میں ذرا بھی علی بخش کے لیے حمایت کا شائبہ موجود نہ تھا بلکہ وہ

سب محوِ تماشا تھے۔

''اللہ رکھی میرے پیو کی غیرت ہے جس کا سنگ اس کا چاچا سوڈھل میرے پیو دودا خان کو دے چکا تھا۔'' علی بخش نے غصیلے لہجے میں ساون کو بتایا۔

''جھوٹ ہے یہ سب اور تُو میری بات کان کھول کر سن لے علی بخش۔'' ساون زہر خند لہجے میں بولا۔'' آئندہ اگر تُو ہمارے بیچ آیا تو اچھا نہ ہوگا۔''

''تو کیا بگاڑے گا میرا؟'' علی بخش نے غصے سے کہا اور اپنے کاندھے پر ٹنگی کلہاڑی اتار لی۔ دیکھا دیکھی ساون نے بھی اپنی کلہاڑی ہاتھوں میں لے لی اور ابھی وہ ایک دوسرے پر کلہاڑیوں کے وار کرنے کے لیے پر تول رہے تھے کہ ایک دم دیگر افراد بیچ میں آ گئے۔ علی بخش اور ساون ایک دوسرے کو خونی نظروں سے دیکھتے ہوئے لوگوں کی گرفت سے نکلنے کے لیے بے چین ہونے لگے مگر لوگوں نے انہیں قابو کیے رکھا۔ دونوں کے منہ سے ایک دوسرے کے لئے مغلظات کا طوفان گرم تھا۔ ادھر دکھاوے کے طور پر محرم علی اور اس کے ماموں بھی علی بخش کو سنبھالے ہوئے تھے۔ بالآخر ساون کو سمجھا بجھا کر لوگوں نے وہاں سے بمشکل چلتا کر دیا۔ لوگ بھی اب واپس اپنی جگہوں پر چلے گئے تھے۔

علی بخش کا غصہ ابھی تک سرد نہیں ہوا تھا اس کی آنکھوں میں ہنوز ساون کے لیے معاندانہ چمک موجود تھی پھر یوں ہوا کہ وہ بھی ہوٹل سے چلا گیا۔

شام ڈھلی، رات ہوئی تو محرم علی اپنے دونوں چہیتے ماموؤں کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تینوں نے خیراں کے ساتھ کچھ چہ میگوئیاں کیں اس کے بعد خیراں نے علی بخش کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''تُو اب کیا اپنی بیکار کی حرکتوں سے ہمیں پریشان کرے گا۔'' خیراں اس پر چڑھ دوڑی۔ اس کے تینوں ''سپوت'' بھی وہاں موجود تھے جو علی بخش کو گھور رہے تھے۔ علی بخش چہرے پر ناگواری لیے چپ کھڑا تھا۔

''پہلے میرے پٹ اور بھائیوں سے تُو نے جھگڑا کیا اس کے بعد ہوٹل کے گاہکوں سے بھی تُو نے اب لڑنا شروع کر دیا۔ پہلے کیا ہم تیرے باپ کی وجہ سے پورے گوٹھ میں کم بدنام ہوئے ہیں جواب تُو بھی...... ہمیں پریشان کر رہا ہے۔''

علی بخش اپنی سوتیلی ماں کی بات سن کر دنگ رہ گیا اور شاکی نگاہوں سے محرم علی اور اس کے ماموؤں کی طرف دیکھنے لگا جنہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے ماں کو غلط اطلاع دی تھی یا پھر ''ملی بھگت'' کے تحت اسے آڑے ہاتھوں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے اپنی ماں کی اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ اس کے باپ دودا خان کے لیے اتنی غیریت اور

تضحیک آمیز الفاظ استعمال کر رہی تھی جیسے وہ اس کا شوہر نہیں دشمن رہ چکا ہو۔ علی بخش کو ماں کی اس بات پر دکھ تو بہت ہوا مگر جواب دینا بھی ضروری تھا۔ اگرچہ وہ دیکھ رہا تھا کہ ان سب کے تیور آج کچھ ٹھیک نہیں نظر آ رہے تھے۔

''میں نے محرم علی سے کوئی جھگڑا نہیں کیا تھا اور نہ ہی گاہکوں سے میں لڑا ہوں۔''

''ہاؤ...... ہاؤ...... تُو تو بڑا شریف ہے بس میرا پُٹ بدمعاش ہے۔'' خیراں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی اور پھر فیصلہ کن لہجے میں علی بخش سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بس بہت ہو گیا ہم اس گوٹھ میں نہیں رہ سکتے یہ گھر اور ہوٹل ہم بیچ رہے ہیں، تُو بھلے ادھر رہ کر جھگڑتا پھر لوگوں سے۔'' پھر وہ اپنے ایک چہیتے بھائی سے مخاطب ہوئی۔ ''ادا دوست محمد، کاغذ دکھاؤ علی بخش کو۔''

علی بخش سپاٹ نظروں سے اپنی ماں کو دیکھنے لگا اس اثناء میں دوست محمد نے علی بخش کی طرف کاغذوں کا مختصر سا پلندہ بڑھایا۔

''کیا ہے یہ؟'' علی بخش جھٹکے دار لہجے میں پلندے کی جانب گھورتے ہوئے بولا۔

''بابا یہ ملکیت کے کاغذ ہیں ہوٹل اور گھر دونوں ملا کر...... گڑتی نہ کر اس میں تیرا ناں بھی شامل ہے۔'' دوست محمد قدرے مکاری اور نرم لہجے میں بولا۔

''کیا کروں میں اس کا؟'' علی بخش نے پھر اسی لہجے میں کہا البتہ اب اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو چکی تھیں۔

''اڑے بابا...... اس پر اپنا انگوٹھا لگا دے۔'' دوست محمد نے پلندے میں سے ایک اور کاغذ جو ایک اسٹیمپ پیپر تھا علی بخش کو دکھاتے ہوئے کہا اور مکارانہ انداز میں اضافہ کیا۔ ''یار علی بخش تُو ہم سب سے الگ تھوڑا ہی ہے۔ اس میں تیرا بھی فائدہ ہے میں نے ہوٹل اور مکان دونوں کا گاہک ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ دونوں کے اچھے پیسے دے رہا ہے۔ ان پیسوں سے تم سب ہمارے گوٹھ مدد پورا آ جاؤ۔ ایک بڑا گھر لے کر مل جل کر رہیں گے سب، ہوٹل بھی کھول لیں گے وہاں۔ چل شاباش میڈا پٹ اس پر آپڑاں انگوٹھا لگا دے۔''

علی بخش یہ سن کر ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ اسے ایکا ایکی ایک گہری سازش کی بو آنے لگی۔ ایسی سازش...... جو اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکالنے والی تھی۔ اس نے باری باری اپنی سوتیلی ماں خیراں اس کے دونوں بھائیوں دوست محمد اور محمد علی کو اور اس کے بعد محرم علی کو دیکھتے ہوئے دوست محمد سے اسٹیمپ پیپر جھپٹ کر اس کے پرزے پرزے کر دیئے۔ یہ دیکھ کر دوست محمد سمیت وہ سب علی بخش کو اس طرح گھورنے لگے جیسے اس کے

ساتھ ان کی جانی دشمنی ہو۔

"کمینے...... ذلیل۔" دوست محمد خونخوار نظروں سے علی بخش کو گھورتا گالیاں بکتا چڑھ دوڑا۔ جس کی تقلید اس کے بھائی محمد علی اور محرم علی نے بھی کی۔ انہیں علی بخش کی اس حرکت پر اتنا طیش آ گیا تھا کہ وہ پاگل کتوں کی طرح علی بخش کو بھنبھوڑنے کے لیے اس پر بیک وقت چڑھ دوڑے تھے۔

ان تین کے مقابلے میں علی بخش تنہا تھا...... لیکن حوصلہ اس کا تیرہ کے برابر تھا۔ علی بخش کو پچھاڑنے کے لیے سب سے پہلے دوست محمد نے اس پر حملہ کیا مگر علی بخش تب تک خود کو ذہنی اور جسمانی جنگ کے لیے آمادہ کر چکا تھا یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی اس نے دوست محمد کو جارحانہ عزائم لیے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کی داہنی ٹانگ کی سیدھی اور جچی تلی ضرب نے دوست محمد کے پیٹ کی تواضع کر ڈالی۔ دوست محمد "اوغ" کی آواز کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑتا رہ گیا۔ ادھر محمد علی اور محرم علی بھی علی بخش کے سر پر نہ صرف پہنچ چکے تھے بلکہ انہوں نے بیک وقت گھونسوں کی ضرب علی بخش کے جبڑے اور گردن پر رسید کر دی۔ ان دہری ضربات نے علی بخش کا دماغ چند ثانیے کے لیے جھنجھنا کر رکھ دیا اور اس کے حلق سے ایک تیز غراہٹ نکل گئی۔ اسے اپنے وجود میں چنگاریاں بھڑکتی محسوس ہوئیں جنہوں نے اس کے اندر برقی رو کا کام کیا اور ایک بار پھر اس کے دہانے سے نکلنے والی غضبناک "آواز" نے اس کی طاقت اور جوش کو سوا کر ڈالا' وہی قوت اس نے اپنے ایک گھونسے میں منتقل کرتے ہوئے محرم علی کی ٹھوڑی پر جڑ دیا اور جب تک اسی ہاتھ کی کہنی کے نشانے پر تیسرے حملہ آور محمد علی کا چہرہ بھی آ چکا تھا۔ لہٰذا علی بخش کی کہنی اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے تیزی سے حرکت میں آئی اور محمد علی بھی اپنے مضروب بھانجے محرم علی کی طرح تکلیف دہ انداز میں کراہتا ہوا چند قدم پیچھے لڑکھڑاتا چلا گیا۔

خیراں ایک جانب حیران و پریشان کھڑی انہیں لڑتے ہوئے دیکھ رہی تھی...... اسی اثناء میں دوست محمد غضبناک بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا علی بخش کی طرف طوفانی رفتار سے بڑھا اور اپنے گینڈے جیسے سر کی ٹکر علی بخش کے پیٹ میں ماری۔ نتیجتاً علی بخش خود کو سنبھالتا رہ گیا۔ دوست محمد نے محض اپنے سر کی ٹکر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ علی بخش کو دھکیلتا ہوا چارپائی پر دے مارا...... علی بخش مار کھا گیا کیونکہ وہ کمر کے بل چارپائی کے ایک ابھرے ہوئے "پائے" پر آ گرا تھا جس نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور پہلی بار ایک کرب انگیز چیخ علی بخش کے حلق سے خارج ہوئی تھی اسے اپنی کمر کی ہڈی تڑختی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس نے اٹھنے کی ایک ناکام سعی کی...... مگر محمد علی اور محرم علی اس کے سر پر پہنچ چکے تھے...... وہ بیک وقت اس پر پل پڑے۔ علی بخش کو کمر والی چوٹ نے پہلے ہی نڈھال کر ڈالا تھا لیکن باوجود اس کے، اس نے اپنا کمزور سا دفاع کرتے ہوئے ان دونوں بدمست گینڈوں کو حملے سے روکنا چاہا مگر بے سود...... محمد علی نے ایک ٹھوکر اپنے پاؤں کی اس کے چہرے پر رسید کی اور ادھر محرم علی اور دوست محمد نے بھی مضروب علی بخش پر تابڑ توڑ گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی حتیٰ کہ علی بخش بے چارہ نڈھال ہو کر زمین پر ڈھے گیا۔

"اب بس کرو...... مار دو گے کیا اسے جان سے......" بالآخر ایک طرف کھڑی "محو تماشا" خیراں حق ثالثی نبھاتے ہوئے اپنے دونوں بھائیوں اور بیٹے محرم علی سے بولی۔ یہی نہیں بلکہ وہ باقاعدہ انہیں جھنجھوڑنے بھی لگی تھی۔ تب کہیں جا کر ان تینوں نے بے سدھ پڑے علی بخش کے زخمی وجود کو چھوڑا۔ علی بخش کے ناک اور منہ سے خون کی لکیریں سی نمودار ہو گئی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

"اب کیا کریں اس کا......" خیراں ان تینوں کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کرنا کیا ہے......؟ اٹھا کر جنگل میں پھینک آتے ہیں اسے۔" دوست محمد نے زمین پر بے ہوش پڑے علی بخش کے مضروب وجود کی طرف دیکھتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا۔

"میں کہتا ہوں اس راستے کے پتھر کو اپنی راہ سے ہٹانے کا ہمارے پاس یہ ایک سنہری موقع ہے کہ اس کا گلا دبا کے اسے مہر شاہ کے قبرستان میں گاڑ دیا جائے۔" محمد علی نے اپنی بے رحمانہ رائے سے نوازا۔

"بے وقوفوں والی باتیں مت کرو۔" خیراں اپنے بھائیوں کو جھڑکتے ہوئے بولی۔ "میں کہتی ہوں اسے ہوش میں لاؤ...... ورنہ ہم سب ہی کسی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔" اس کے مرتعش لہجے میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔

"نہیں امڑ......! ماموں درست کہتے ہیں...... اس کا قصہ پاک ہی کر دینا چاہئے...... نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔" خیراں کے بیٹے محرم علی نے بھی اپنی رائے دینا ضروری سمجھی۔ اس وقت ان سب کے چہرے خونی اور انتہا درجے کے سفاک ہو رہے تھے۔ بے رحم رات کا سناٹا چہار سو طاری تھا۔ شکستہ مگر کشادہ کچے صحن میں سرد ہوا سسکنے کے انداز میں ٹھٹھر رہی تھی۔

خیراں نے اپنے بیٹے کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ’’لیکن یہ وہ بانس ہے جو اگر نہ رہا تو ہماری بانسری ضرور بجا دے گا...... میں کہتی ہوں اسے فوراً ہوش میں لاؤ اور اپنے مند بند رکھو۔‘‘ اس کی بات پر وہ تینوں رضامند نظر آنے لگے۔ باہر دبیز کہرے میں لپٹی ہوئی رات انتہائی سرد تھی۔

☆======☆======☆

’’دیکھ ساون اگر تُو نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں کچھ کھا کر اپنی جان دے دوں گی...... اور...... اور......‘‘ سورٹھ رندھے ہوئے مگر قدرے جارحانہ انداز میں کہتے کہتے رک گئی۔

’’ہاں...... ہاں بول اور...... اور کیا کرلے گی تُو میرا...... ہیں......‘‘ ساون نے قدرے تلخ لہجے میں اس کا ادھورا جملہ پورا کرنے کے لئے اکسایا۔ اس پر سورٹھ خود کو قدرے سنبھالتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

’’اور...... یہ...... کہ ساون...... میں تجھے بھی بدنام کر کے مروں گی...... تیرا نام لے کر مروں گی۔‘‘ اتنا کہہ کر وہ دیوار گیر کھڑکی نما دروازے سے گزر کر دوسری طرف اپنے گھر میں چلی گئی اور ساون اپنی جگہ دم بخود کھڑا رہ گیا۔ سورٹھ کی اس جذباتی دھمکی نے ساون کو ہک بک کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ عصر کا وقت تھا اور گوٹھ کی اکلوتی مسجد سے مؤذن کے اذان دینے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ جس کے نتیجے میں گوٹھ کی واحد آٹے کی چکی کی مخصوص ’’پک...... پک...... پک......‘‘ بھی بند ہو چکی تھی۔

ساون گھر میں آج اتفاق سے تنہا تھا۔ وہ جب بھی اکیلا ہوتا...... تو جانے کس طرح دشمن جاں اور قتالۂ جہاں سورٹھ کو خبر ہو جایا کرتی تھی اور پھر وہ ’’چھم‘‘ سے ایک شعلۂ خوابیدہ کی طرح نازل ہو کر ساون کے گلے کا ہار بن جاتی۔ فتنہ گر سورٹھ کے فوری اور ’’بروقت‘‘ نازل ہونے کی ایک بڑی اور اہم وجہ...... وہ دیوار گیر آدم گزار کھڑکی تھی جو دونوں گھروں کے مکینوں کے قریبی روابط کے لیے بنائی گئی تھی چونکہ دونوں گھروں میں قریبی رشتے داری تھی۔ اسی لئے اس اندرونی دیوار میں نصب شدہ کھڑکی دونوں خاندانوں کے لیے باہمی قربت کا ایک ’’فوری‘‘ وسیلہ تھی۔ چنانچہ یہ بات بعید از قیاس نہ تھی کہ سورٹھ کو مذکورہ کھڑکی سے ’’میدان‘‘ صاف ہونے کا علم نہ ہو سکے...... کیونکہ مذکورہ کھڑکی جسے مقامی زبان میں ’’کھاڑ‘‘ کہا جاتا ہے۔ سورٹھ...... کے لیے ہر سمے اپنے محبوب ساون کے دیدار خفتہ کا ایک سہل ذریعہ تھی۔ جس سے لگی وہ منتظر محبوب رہتی تھی۔ لہٰذا

اس بار بھی ایسا ہی ہوا جیسے ہی اس نے دیکھا کہ ساون آج اپنے گھر میں تنہا ہے...... تو وہ فی الفور کھڑکی پار کر کے اس کے گلے کا ہار بن گئی...... بہر طور...... سورٹھ کی واپسی اک طوفان بلاخیز کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ ساون بھی جھنجھلاتا اور سورٹھ کی دھمکی آمیز گفتگو پر دل ہی دل میں کڑھتا ہوا اندر کوٹھڑی میں آ گیا اور چارپائی پر گر سا گیا۔

آج سورٹھ نے اپنی دھمکی آمیز گفتگو سے خاصا ژولیدہ کر کے رکھ دیا تھا...... جانے کیوں ساون کو اب اپنی چچازاد سورٹھ سے انجانا سا خدشہ محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک ایسا خدشہ...... جو اچانک ہی شعلۂ ناگہانی کی طرح بھڑک کر ہر شے کو بھسم کر دیتا ہو۔

پھر اس سے اگلے دن صبح کو ساون کی طبیعت اور متنفر ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ صبح دم ہی اس کا چاچا پریل اور چاچی آن دھمکے۔ اس وقت سب گھر میں موجود تھے۔ ساون کے باپ موگو نے اپنے بھائی کا پُر تپاک استقبال کیا لیکن ساون نے اپنی تیز نظروں سے چاچا اور چاچی کے چہروں کو دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ خاصے سرد اور بے مہر ہو رہے تھے۔ ایک اجنبیت سی جیسے کھنڈی ہوئی تھی ان کے چہرے پر۔ ساون کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی کہ وہ کسی ’’مقصد‘‘ کے تحت آج صبح صبح ہی آن دھمکے تھے۔ ساون کو اب یہ سوچ کر بڑی کوفت سی ہونے لگی اور اس خدشے کا احساس بھی بڑھ گیا کہ آج اس کا ضدی باپ موگو پھر اسے آڑے ہاتھوں لے گا...... اور بالآخر دونوں باپ بیٹوں کے درمیان ہونے والی تکرار نہ صرف فیصلہ کن ثابت ہو گی بلکہ آخری بھی...... اور پھر یہی ہوا۔ ساون تو چاچا اور چاچی کو دیکھتے ہی نکل گیا تھا لیکن بہر طور موجودہ حالات سے مفر اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ گھر سے نکل تو گیا تھا لیکن دوپہر کو پھر اسے لوٹنا پڑا تو کیا دیکھتا ہے اس کا باپ موگو صحن میں بچھی کھری چارپائی پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اس کا ہی منتظر ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ساون کو دیکھتے ہی چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں حیران پریشان سی دونوں ماں بیٹیاں بھی موجود تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آج دونوں باپ بیٹوں میں کوئی معرکہ ہونے والا ہو۔

’’ساون......!‘‘ موگو نے قدرے بلند آواز میں ساون کو پکارا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور انداز تخاطب بھی ایسا ہی تھا جیسے وہ ابھی ساون کو لٹھ مار دے گا۔

’’جی...... بابا......‘‘ ساون نے باپ کی طرف الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی اثناء میں اس کی ماں درمیان میں اپنے شوہر سے بولی۔ ’’میڈے لعل کو مانی ٹکر تو کھا لینے دے...... پھر بات کر لینا......‘‘

"امڑ...... بابا کو بات کرنے دے پہلے، مانی (روٹی) کی خیر ہے......" ساون نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور باپ سے بولا۔ "ہاں بابا...... میں سن رہا ہوں کرو بات......"

"بات وہی پرانی ہے جسے میں بار بار دہرانا نہیں چاہتا۔ میڈا ابھرا آخری وری یہاں آیا تھا جواب لینے...... اس لئے اب تو بھی مجھے آخری فیصلہ سنا دے تاکہ میں پھر تیرے لئے کوئی فیصلہ کرسکوں۔" موگو، بیٹے کے چہرے پر بغیر پلکیں جھپکائے گھورتے ہوئے بولا۔ وہ خود کو عقل کل سمجھتا تھا اس لئے بیٹے پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ روش اس کے بیٹے کو سرکشی میں مبتلا کرسکتی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ساون اپنی ہٹ کا پکا تھا اور پہلے ہی سے ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کا تہیہ کر چکا تھا...... مگر ایک حکمت عملی کے تحت وہ سردست باپ کو واضح جواب نہیں دینا چاہتا تھا لہٰذا باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"بابا......! ٹھیک ہے...... مجھے کچھ سوچنے کا موقع دے۔"

اس کی بات پر موگو چند ثانیے سپاٹ نظروں کے ساتھ ساون کے چہرے کی جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے...... میں تجھے کل تک مہلت دیتا ہوں سوچنے کی...... لیکن یاد رکھنا کہ یہ آخر مہلت ہوگی۔" اتنا کہہ کر وہ باہر چلا گیا اور بے چاری ساون کی ماں اور اس کی بہن ہدایتاں کی جان میں جان آئی۔

ماں نے ساون کو کھانا لاکر دیا جسے ساون نے چاروناچار زہر مار کیا...... اور اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ کسی گہری سوچ کا غماز نظر آنے لگا تھا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ باپ کی بات پر غور کر رہا تھا بلکہ وہ کچھ اور ہی سوچنے میں محو تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے گھر کو خیرباد کہہ کر اللہ رکھی کے ساتھ ساری زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ وہ کب کا یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اللہ رکھی سے ہی شادی کرے گا...... لہٰذا اس نے اب آئندہ کا لائحہ عمل یہی ترتیب دیا تھا کہ اللہ رکھی سے فوری شادی کر کے پہلے اپنے قدموں پر کھڑا ہوگا اور پھر اس کا باپ موگو ایک دن خود گزرتے سمے کے ساتھ اسے معاف کر دے گا اور پھر وہ اللہ رکھی کے ساتھ ہی اپنے گھر دوبارہ واپس آجائے گا...... لیکن آگے تقدیر کو کیا منظور تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

پھر اچانک ساون چارپائی سے اٹھا۔ کمرہ نما کوٹھڑی کے کچے فرش پر اکڑوں بیٹھا اور چارپائی کے نیچے سے ایک زنگ آلود ٹرنک گھسیٹ کر اسے کھولا۔ اندر تلے اوپر رکھے

کپڑوں کے نیچے سے ایک پوٹلی برآمد کی۔ ان میں چالیس ہزار کی وہ رقم بندھی ہوئی تھی جو چاچی عنایتاں نے اسے لوٹا دی تھی۔ ساون نے وہ پوٹلی اپنی بڑے گھیر والی شلوار کے نیفے میں اڑس لی پھر چند اور ضرورت کی اشیاء سنبھالیں اور بہانے سے گھر سے نکل گیا۔

اسے اپنے وجود کے اندر ایک کپکپاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سے احساس تلے اس کا دل گھبرا بھی رہا تھا تو کبھی انجانی سی مسرت بھی محسوس کر رہا تھا۔ بہرطور چند ثانیے بعد اس کا چہرہ عزم صمیم کا عکاس نظر آنے لگا۔ اس کا رخ اللہ رکھی کے گھر کی جانب تھا۔

اس وقت سرمئی شام شب ظلمت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اللہ رکھی کے گھر کی جانب تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ وہ اللہ رکھی کو کس طرح اپنے فیصلے سے آگاہ کرے؟ کیونکہ چاچی عنایتاں کو بھی اعتماد میں لینا ضروری تھا تاہم اسے اللہ رکھی پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ اس کا ہر صورت ساتھ دے گی۔ انہی سوچوں کے گرداب میں ڈوب اور ابھر کر وہ بالآخر اللہ رکھی کے گھر پہنچ گیا۔

دروازے پر دستک دیتے ہوئے ساون نے یونہی دائیں بائیں تاریکی میں دیکھا۔ گلی میں اس وقت سناٹا تھا...... جاڑوں کی راتیں ویسے بھی جلد اتر آتی ہیں اور گہری بھی بہت ہوتی ہیں۔ ساون نے فقط اجرک اپنے جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ دستک کے جواب میں دروازہ اللہ رکھی نے ہی کھولا تھا...... لیکن ساون مدھم سی روشنی میں اللہ رکھی کا چہرہ دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ اللہ رکھی کا چہرہ پریشان کن اور آنکھیں نمناک ہو رہی تھیں۔ وہ یوں اچانک غیر متوقع طور پر ساون کو اپنے دروازے پر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ مگر پھر اس کے پریشان چہرے پر ایک طمانیت سی دوڑ گئی اور وہ بولی۔ "ساون! اچھا ہوا تو آگیا......!"

"خیریت تو ہے...... اللہ رکھی......! کیا ہوا؟" ساون نے چونک کر کہا اور پھر اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف بغور دیکھتا ہوا اندر چلا آیا۔ صحن میں سحر انگیز ٹھنڈی چاندنی اتری ہوئی تھی۔

"ساون......! چاچی کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔" اللہ رکھی نے مضطربانہ انداز میں اسے اپنی پریشانی بتائی۔ اب وہ دونوں ساتھ ہی چلتے ہوئے اندر کوٹھڑی میں داخل ہوگئے۔ جہاں ایک چارپائی پر موٹی سی رلی اوڑھے چاچی عنایتاں لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ کوٹھڑی میں پھیلی ہوئی بلب کی کمزور سی روشنی میں اس بے چاری کے چہرے کے تاثرات کسی موذی عارضے کی غمازی کر رہے تھے۔

"کسی حکیم کو دکھایا ہے چاچی کو......" ساون نے مارے درد کے کراہتی ہوئی چاچی

عنایتاں کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ رکھی سے پوچھا۔

’’ہاں...... دکھایا تھا مگر کوئی افاقہ نہیں ہو...... اور اب تو طبیعت پہلے سے بھی زیادہ بگڑتی جا رہی ہے۔‘‘ اللہ رکھی نے اپنی بات جاری رکھی اور مزید بولی۔ ’’اب تو سب نے جواب دے دیا ہے...... حتیٰ کہ حکیم بڈھل اور ڈاکٹر شاہ سائیں نے بھی جواب دیتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ چاچی کو شہر کے وڈے ہسپتال میں لے جاؤ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔‘‘ یہ بتاتے ہوئے اللہ رکھی کی جھیل ایسی آنکھوں میں مزید آنسوؤں کی نمی تیر گئی۔

ساون نے اسے تسلی دی۔ ’’اللہ رکھی...... تُو فکر نہ کر میں ہوں ناں...... اللہ سے دعا کر، وہ اچھا کرے گا۔‘‘ پھر ساون نے آگے بڑھ کر چاچی عنایتاں کی پیشانی پر اپنا الٹا ہاتھ رکھا تو وہ تپ رہی تھی۔ اس نے بغور چاچی کا چہرہ دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر بھی گہری فکر نمایاں ہو گئی تھی۔ چاچی بدستور نڈھال سی آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی۔

’’اللہ رکھی! چاچی کو تو بہت تیز تاپ (بخار) ہو رہا ہے۔‘‘ ساون نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

اللہ کھی اب پریشان کن نظروں سے ساون کا چہرہ تکنے لگی۔ ساون سوچ میں محو تھا پھر اللہ رکھی کو مخاطب کر کے بولا۔ ’’اللہ رکھی! میرا خیال ہے چاچی کو اسی وقت شہر لے جانا پڑے گا۔‘‘

’’لل...... لیکن......‘‘ وہ بے چاری کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

’’اللہ رکھی! حوصلہ رکھ...... لاڑکانہ ہمارے گوٹھ سے اتنا زیادہ دور نہیں...... میرا خیال ہے اگر تم ہمت سے کام لو تو ہم چاچی کو بآسانی بیل گاڑی میں ڈال کر شہر لے جا سکتے ہیں۔‘‘

اللہ رکھی بے چاری کیا جواب دیتی اس کے تو آنسو تک حلق میں گھٹ کر رہ گئے تھے اور بات بھی نہیں کی جا رہی تھی بس خاموش نگاہوں سے وہ اپنے محبوب کو تکے جا رہی تھی۔ ساون کو اس کی نمناک آنکھوں میں بے بسی اور بے چارگی کی جھلک صاف دکھائی دے گئی۔ ساون کو اس پر یک گونہ ترس سا آنے لگا۔ وہ اس کے قریب آیا اور اس کی گھنیری پلکوں کے سائے تلے جھیل ایسی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے محبت پاش لہجے میں بولا۔ ’’اللہ رکھی میرے ہوتے ہوئے تُو کوئی دکھ نہیں دیکھے گی۔ تجھ پر ایک ذرا بھی آنچ نہیں آنے دوں گا میں...... بس تُو رب سائیں سے دعا کر وہ ہماری مشکلیں آسان کرے۔‘‘ ساون کے لہجے

نے اللہ رکھی کو بے اختیار سا کر دیا۔

’’اللہ رکھی...... ! تم جلدی سے عام ضرورت کا تھوڑا سا سامان سمیٹ لے...... میں جب تک بیل گاڑی تیار کرتا ہوں۔‘‘

’’لیکن ساون! اتنی رات کو ایسی سردی میں......‘‘ اللہ رکھی نے اٹکتے ہوئے کہا۔

’’اللہ رکھی...... ! خوشی اور غمی کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسان کو ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہئے۔ یہ ایک بیماری کا معاملہ ہے...... جو کسی وقت بھی جان کے لیے خطرہ بن سکتی ہے...... اللہ رکھی...... ! درحقیقت میں چاہتا تو یہی تھا کہ تجھے اپنے ساتھ شہر نہ لے کر جاؤں...... لیکن تجھے تنہا میں یہاں چھوڑ کر بھی نہیں سکتا اور نہ میرے گھر کے حالات ایسے ہیں کہ تجھے کچھ دنوں کے لیے وہیں چھوڑ کر چاچی کو شہر لے جاتا...... مگر مجبوری ہے کہ تجھے بھی اپنے ساتھ......‘‘

’’نہیں ساون! مجبوری کیسی...... میرا تو اب جینا مرنا تیرے واسطے ہے، میں تجھ سے جدا ہو کے ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔‘‘ اللہ رکھی ساون کی بات پر تڑپ کر بولی۔

ساون نے دانستہ اللہ رکھی کو اصل بات سے بے خبر رہنے دیا کہ اس کی خاطر وہ اپنا گھر بار چھوڑ آیا ہے۔ تاہم اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مناسب وقت پر وہ اللہ رکھی کو آگاہ کر دے گا...... ابھی مسئلہ چاچی کو جلد از جلد شہر پہنچانے کا تھا۔ پھر وہ دونوں جلدی جلدی تیاریوں میں مصروف ہو گئے...... باہر ٹھٹھرتی ہوئی رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔

☆======☆======☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ علی بخش کی آنکھ کھلی۔ ہوش آتے ہی اس کے محسوسات جاگے تو اسے اپنے پورے وجود میں ٹیسیں سی اٹھتی محسوس ہوئیں۔ ایک ہلکی سی کراہ اس کے حلق سے خارج ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی سوتیلی ماں خیراں اس کے قریب چارپائی پر بیٹھی زخموں کو سہلا رہی تھی۔ علی بخش نے ناگوار اور نفرت انگیز نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور دوسری طرف کروٹ لینے کی کوشش میں اسے پھر اپنے مضروب وجود سے درد کی لہریں سی اٹھتی محسوس ہونے لگیں۔

’’نامیڈ العل...... ! ایسے ہی پڑا رہ...... میں تیرے کو ٹکور کر رہی ہوں۔ مرہم بھی لگا دی ہے میں نے......‘‘ خیراں نے جلدی سے اسے مخاطب کر کے کہا۔ اس کے لہجے میں ندامت آمیز ارتعاش تھا۔

علی بخش کا دل ایک بار پھر نفرت سے بھر گیا۔ اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواباً

خیراں سے کہا۔ ''تُو چلی جا...... میں چاک (ٹھیک) ہوں...... جا...... یہاں سے......'' اس نے جیسے نفرت انگیز لہجے میں اسے دھتکارتے ہوئے گھورا تو خیراں کی نرماہٹ بخارات بن کر دھواں ہوگئی اور وہ منہ بسورتی کمرے سے نکل گئی۔

اب علی بخش اپنے کمرے میں تنہا رہ گیا تھا۔ وہ چند ثانیے یونہی پڑا...... اپنے اوپر بیتے بے رحمانہ پیش آمدہ واقعات کو ترتیب وار سوچنے لگا کہ کس طرح اس کے ساتھ اس کے سوتیلے ماموؤں اور بھائی نے انتہائی بے حسی اور بے رحمی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے مارا پیٹا تھا۔ اس تلخ واقعے کے بعد سے وہ خود کو اس گھر میں غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ اس پر ایک بار پھر ''خطرناک'' قسم کی دیوانگی آمیز قنوطیت طاری ہونے لگی...... اور کمرے کی در و دیوار اسے کاٹنے کو دوڑتی محسوس ہو رہی تھی اور سینے میں دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈ کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس گھر کے سارے مکینوں کو جلا کر بھسم کر دے۔ جب اس کی اعصاب زدگی حواسوں کو معطل کرنے لگی تو وہ ایک دم گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ حیرت ناک بات تھی کہ اسے اس بار کسی قسم کی ٹیس محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس کا زخم دروں زیادہ ہرا تھا جو بیرونی زخموں کو خاطر میں نہیں لایا تھا۔ پھر وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا ایک لمحے کو اس کے قدم ڈگمگائے...... ذہن میں تاریک سے جھماکے ہونے لگے مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے وجود کی کپکپاہٹ پر قابو پایا۔ اجرک اٹھا کر اوڑھی اور کمرے سے باہر کچے ٹھٹھرتے صحن میں آ گیا۔ پھر وہاں سے بہ آہستگی بیرونی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

باہر گلی میں دبیز کہرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں اور شروع کی تاریخوں کے چاند کی مدھم اور سحر انگیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے کہرا مزید دودھیا سا نظر آ رہا تھا۔ علی بخش مشینی انداز میں چلتا ہوا گلی سے نکل کر ٹیڑھے میڑھے شکستہ سے راستے پر ہو لیا۔ وہ آہستہ روی مگر بغیر رکے انجانی منزل کی جانب بڑھا چلا جا رہا تھا۔ چہار سو گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ملگجی سی دھندلی تاریکی اطراف میں پُراسراریت سی طاری کیے ہوئے تھی۔ آوارہ جانور تک کونے کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ علی بخش بے خوف چلتا ہوا بالآخر گوٹھ کے ایک پرانے اور واحد قبرستان میہر شاہ جا پہنچا۔ پورے ماحول پر سکتہ سا طاری تھا۔ علی بخش کے چہرے کی تمتماہٹ گہری ہوئی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ناپختہ قبر کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس کی مغموم سی نگاہیں سامنے قبر پر جمی ہوئی تھیں۔ ایکا ایکی آنکھوں میں آنسو جھلملانا شروع ہو گئے...... اور چہرہ کسی اندرونی شکست و ریخت کے باعث مرتعش سا نظر

آنے لگا۔

''امڑ! (ماں) میں کس سے شکایت کروں...... تُو بھی چلی گئی۔ بابا...... بھی نہ رہا...... میں کسے بتاؤں کہ مجھ پر میری سوتیلی ماں، اس کی بھائی اور بیٹا کتنا ظلم ڈھا رہے ہیں۔'' رات کے مہیب سناٹے میں علی بخش اپنی ماں حضوراں بی بی سے شکوہ کناں تھا۔ جو جانے کتنے عرصے سے ابدی نیند سو رہی تھی۔ ''امڑ...... ! آج مجھے سب نے بہت پیٹا ہے۔ امڑ...... تُو بتا مجھے، میں کس کی گود میں اپنا سر رکھ کر روؤں۔'' علی بخش پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کا سینہ دکھ سے بھر گیا تھا اور پھر وہ وہیں ٹھٹھرتی ہوئی سرد رات میں اپنی ماں کی قبر کے ساتھ لیٹ گیا۔

☆======☆======☆

صبح دم جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے سخت بخار چڑھا ہوا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس حالت میں گرتا پڑتا اپنے گھر آ گیا۔ خیراں اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر ذرا پریشان سی ہو گئی۔ پھر جانے اس کے دل میں کس طرح رحم آ گیا اور وہ اس کے لیے گرم گرم دودھ لے آئی۔ علی بخش نے دودھ پیا اور موٹی سی رلی اوڑھ کر سو رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو خاصا بہتر پایا۔ اسے اپنا آپ اب ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ دماغ ذرا سوچنے کے قابل ہوا اس نے از سرنو اپنے حالات کا جائزہ لیا۔ اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی جا چکے تھے محرم علی بھی گھر میں موجود نہ تھا۔ علی بخش کو اس تلخ حقیقت کا بخوبی ادراک ہو چکا تھا کہ اگر اس نے جلد اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا کوئی سدباب نہ کیا تو کسی بھی وقت اسے اس کے حق سے محروم کر دیا جائے گا کیونکہ اب وہ یہ بات واضح طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی سوتیلی ماں کی چیرہ دستیاں کھل کر سامنے آ چکی تھیں...... اور وہ اپنے مفاد کی خاطر ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کب تک اکیلا ان بے حس لوگوں کے درمیان پستا رہے گا۔ اسے اکیلا جان کر ان کی چیرہ دستیاں دن بہ دن بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ نوبت یہاں تک آ چکی تھی کہ وہ سب اسے جائیداد تک سے محروم کرنے کے لیے اس کی جان کے دشمن ہو چلے تھے۔ یہی سوچتے سوچتے شام اور پھر رات آ گئی تو معاً اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کوندا۔ اسے یہ خیال سر پر آتی اس رات کو دیکھ کر آیا تھا۔ ہاں...... اس رات یعنی جمعرات کی رات...... بدنام دھاڑیل اکو صرف اس سے ملنے کے لیے آیا کرتا تھا...... اور شاید دودا خان نے اپنے تجربے کی نگاہ سے ان رویوں کو پہلے ہی سے بھانپ لیا تھا جو اس کی موت کے بعد اس کے بڑے بیٹے علی بخش کے ساتھ روا رکھے جانے تھے...... اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ جب تک وہ خود زندہ ہے علی بخش کے ساتھ کوئی ایسی ناانصافی نہیں ہو گی مگر اس کی آنکھ بند ہوتے ہی ''سوتیلے'' رشتے ہی ناگ بن کر علی بخش کو ڈس سکتے تھے...... لہٰذا اس کے لیے دودا خان

نے پہلے ہی بندوبست کے طور پر اکو دھاڑیل کو اشارۃً اور بالخصوص اپنے بڑے بیٹے علی بخش کے لیے کہا تھا کہ وہ ہر مشکل وقت اور معاملے میں اس کی مدد کرے...... اکو دھاڑیل آج تک اپنے دوست دودا خان سے کیا ہوا وعدہ نبھاتا چلا آیا تھا...... اور اب بھی محض علی بخش سے ملنے اور اس کی خیر خیریت پوچھنے اکثر آ جایا کرتا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی علی بخش فوراً ہوٹل جا پہنچا۔ محرم علی اچانک اسے دیکھ کر ٹھٹک سا گیا...... لیکن اس نے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ تاہم اسے اس بات پر حیرت ضرور ہوئی تھی کہ علی بخش اس وقت جبکہ ہوٹل کے بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا کیوں چلا آیا۔ اس کی آمد اسے ایک شک آمیز اچنبھے میں مبتلا کر رہی تھی...... لہٰذا اس نے اپنے ایک ''گماشتے'' خیرو کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ آج کی رات علی بخش کی خفیہ نگرانی کرے اور اگلے دن اسے بتائے کہ اتنی رات گئے علی بخش ہوٹل میں کیا کرتا رہا تھا۔

بہر طور محرم علی اپنے وقت پر ''دخل'' سے اٹھ کر گھر چلا گیا۔ دیگر ملازم بھی جانے لگے۔ بس چند ایک وہی ملازم رہ گئے تھے جنہوں نے ہفتے وار نشے وغیرہ کا بندوبست کرنا تھا...... جہاں نامی گرامی چور اچکے اور بدنام زمانہ ڈاکو آ کر محفل رنگ و بو جماتے اور اسی دوران جوا بھی چلتا تھا۔

محرم علی کا متعین کردہ گماشتہ ''خیرو'' بڑی توجہ کے ساتھ علی بخش کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ''وزن پاڑیں'' کی محفل اندر ہوٹل کی عقبی کشادہ مگر کچی کوٹھڑی میں شروع ہو چکی تھی جبکہ علی بخش ''دخل'' سے اٹھ کر چائے اور کھانا بنانے والے چبوترے کے قریب بینچ پر بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ اسے بے چینی سے اکو دھاڑیل کا انتظار تھا۔ ہوٹل کی اس سرگرمی کا ''منتظم اعلیٰ'' بہ الفاظ دیگر روح رواں ایک منشی تھا جس کا نام خیر بخش تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا سیاہ رو شخص تھا عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ اس کی جو اچانک نگاہ علی بخش پر پڑی تو وہ اس کی جانب بڑھا اور مؤدبانہ مگر قدرے معنی خیز انداز میں بولا۔ ''چھوٹے سائیں...... جی گھبرا رہا ہے تو اندر کوٹھڑی میں آ جاؤ...... ذرا دل بہل جائے گا۔''

علی بخش کو ان چیزوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی لہٰذا اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اسے چلے جانے کو کہا اور منشی خیر بخش موالیوں کے سے انداز میں منہ ہلاتا ہوا چلا گیا۔

علی بخش کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس پر ایک ناقابل بیان کوفت اور کبھی بیزاری سی طاری ہونے لگتی تھی۔ رات اپنے انجام کی طرف محو سفر تھی...... معاً علی بخش کی سماعتوں سے گھوڑوں کی مخصوص ٹاپوں کی آواز ٹکرائی۔ آواز عقبی سمت سے ابھری تھی۔ علی بخش جان گیا تھا

کہ گھوڑوں کی معیت میں آنے والا کون ہوسکتا تھا۔ وہ بینچ سے اٹھا۔ اجرک سنبھالی اور ہوٹل کے چھپر احاطے سے نکل کر پچھواڑے آ گیا۔ دھندلی اور غبار آلود سرد ٹھٹھرتی فضا میں اسے سامنے چند اونچے اونچے قد و قامت کے اصیل گھوڑے دکھائی دے گئے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ پانچوں سوار گھوڑے سے اتر آئے تھے اور وہ اب وہ ایک کچی گارے مٹی سے بنی ہوٹل کی عقبی کوٹھڑی کے پچھواڑے بنے ایک پٹ کے دروازے والی بند چوکھٹ کے قریب کھڑے تھے۔ چاند کی دھندلی اور مدھم روشنی میں ان کے ہیولے بڑے پُراسرار نظر آ رہے تھے۔ وہ سب سیاہ لباس میں ملفوف تھے اور چہروں پہ ان کے اجرکوں کے ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سیون ایم ایم کی رائفلوں کے علاوہ کلاشنکوفیں بھی تھیں۔

انہوں نے شاید علی بخش کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ اپنی جگہ جم سے گئے تھے۔ پھر معاً ان پانچوں میں سے ایک جو نسبتاً طویل القامت تھا اپنے دونوں بازو پھیلاتا ہوا علی بخش کی جانب آیا اور ایک بھرپور معانقہ کرنے کے بعد بولا۔ ''آ...... جوان...... کیسا ہے تُو...... لگتا ہے تو کچھ پریشان ہے۔'' یہ اکو دھاڑیل تھا جس کی تیز نگاہیں علی بخش کو اپنے وجود میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

جواباً علی بخش نے کہا۔ ''ہاں چاچا...... ایسی ہی بات ہے، کہیں بیٹھ کر بتاؤں گا۔''

''ہا...... بابا...... ٹھیک ہے۔'' اکو دھاڑیل کھلے دل کے ساتھ بولا پھر عقب میں اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کھرکھراتی آواز میں بولا۔ ''اڑے دشمن...... بابا تم لوگ اندر جا کر موج میلا کرو...... میں ذرا اس جوان کے ساتھ کچھ راز کر لوں۔'' پھر وہ علی بخش کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں جوان کہاں بیٹھیں بابا......''

''آؤ چاچا سائیں!'' علی بخش نے کہا۔ پھر وہ دونوں ہوٹل کی عقبی کچی دیوار سے لگے ایک چھپر تلے مٹی کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ یہاں اپلے اور لکڑی کے ٹوٹوں کا الاؤ روشن تھا۔ درحقیقت یہ جگہ شبینہ ڈیوٹی انجام دینے والے چوکیدار کے استعمال میں تھی۔

''ہاں بابا...... اب بول کیا پریشانی ہے تجھے......'' اکو دھاڑیل نے اپنی عقابی نگاہوں سے گردوپیش کے تاریکی اور غبار آلود سناٹے کا جائزہ لیتے ہوئے علی بخش کو مخاطب کر کے کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی بات کی جلدی ہو۔

''چاچا...... ! میری سوتیلی ماں اور اس کے بھائی وغیرہ میری جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔'' علی بخش نے بتایا اور اکو دھاڑیل چونکتی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب خاموشی سے تکنے لگا جیسے وہ اس اجمال کی تفصیل جاننے کے لیے بے چین ہو۔ پھر علی بخش اسے تفصیلاً

بتانے لگا۔ وہ اس بات سے یکسر بے خبر تھا کہ محرم علی کا ایک گماشتہ ان کی ٹوہ میں ہے۔

☆======☆======☆

''خیرو...... ! علی بخش جس شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، وہ کون تھا؟''

محرم علی نے اپنے گماشتے خیرو سے اگلے دن اس کی کارگزاری کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔ خیرو ایک اٹھارہ انیس سالہ پیش گار چھوکرا تھا بولا۔ ''نہیں سائیں! میں اسے پہچان تو نہیں سکا ویسے اس آدمی کا حلیہ مجھے کسی بدنام دھاڑیل (ڈاکو) ہی کا لگ رہا تھا۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ دودا سائیں کی ہفتہ وار وزن پاڑیں کی محفل میں دھاڑیل بھی آتے تھے۔ ہوسکتا ہے اس نے کسی دھاڑیل سے واسطے داری (راہ و رسم) بڑھالی ہو۔'' خیرو نے گویا اپنا خیال ظاہر کیا اور محرم علی اس کی بات سے زیادہ اس کی قیاس آرائی پر ٹھٹک گیا۔ خیرو کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔ محرم علی کو ایک واضح نوعیت کے خدشے اور ''خطرے'' نے گھیر لیا تھا۔ اب...... اسے اس بات کا ادراک ہو چلا تھا کہ ہوسکتا ہے علی بخش اپنا بدلہ لینے کے لیے کسی دھاڑیل سے راہ و رسم بڑھانا چاہ رہا ہو چونکہ وہ ان کے مقابلے میں اکیلا تھا اس لیے وہ اب ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے جرائم پیشہ افراد کے ساتھ ملنے کی کوششیں کر رہا تھا...... اور یہ بات محرم علی کے لیے ہی نہیں بلکہ اس کی ماں خیراں اور ماموں دوست محمد اور محمد علی کے لیے بھی باعث تشویش تھی۔ محرم علی نے لمحے بھر کی خاموشی کے بعد پھر اپنے گماشتے خیرو سے پوچھا۔ ''خیرو...... ! تُو نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ کیا باتیں کر رہے تھے آپس میں وہ دونوں......''

''سائیں...... وہ دونوں چوکیدار والے چھپر تلے بیٹھے تھے...... وہاں سے ان کی باتیں سننا بہت مشکل ہو رہا تھا...... لیکن پھر بھی میں نے یہ سنا تھا کہ......'' خیرو تھوک نگلنے کے لیے ذرا رکا تو محرم نے جلدی سے کہا۔

''ہاں...... ہاں بول...... کیا سنا تھا تُو نے؟''

خیرو بتانے لگا۔ ''علی بخش کچھ ایسی باتیں کر رہا تھا جیسے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی یا زیادتی ہو رہی ہو اور اس شخص یعنی دھاڑیل سے وہ مدد بھی مانگ رہا تھا۔''

محرم علی کو اب اپنے خدشے کی حقیقت کا انداز ہونے لگا تھا...... تاہم وہ چند ثانیے خاموشی کے بعد بولا۔ ''خیرو! اب میری بات غور سے سن......''

''جی سائیں! حاضر......'' خیرو مستعدی سے بولا۔

''دیکھ خیرو...... ! اب تُو علی بخش کی مسلسل نگرانی کرنا اور ساتھ ہی اس دھاڑیل نما

شخص کا بھی پتہ چلانا کہ وہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ بس جہاں تک ہو سکے اس شخص کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر کے مجھے بتانا...... کیونکہ اب ان دونوں کے درمیان اور بھی ملاقاتیں ہوں گی، سمجھ گیا۔''

''ھا...... سائیں......! آپ فکر ہی نہ کرو۔ بڑا اپچل کام کروں گا۔'' خیرو مخصوص لب و لہجے میں بولا پھر محرم نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی جیب سے اجرت خاص کے طور پر چند بڑے نوٹے نکال کر تھما دیئے تو خیرو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

☆======☆======☆

باہر ٹھٹھرتی ہوئی رات میں غضب کا جاڑا اترا ہوا تھا۔ چہار سو گہرا سکوت طاری تھا۔ علی بخش اپنے کوٹھڑی نما کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔ البتہ ایک دوسرے کمرے میں موجود وہ چاروں متفکر سے آمنے سامنے کی چارپائیوں پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ یہ خیراں اور اس کے دونوں بھائی دوست محمد اور محمد علی کے علاوہ بیٹا محرم علی تھے۔ ان کے بیچ کچے فرش پر کوئلوں کی انگیٹھی روشن تھی جس میں دہکتے ہوئے شعلوں نے کمرے کی محدود فضا کو قدرے گرم کر دیا تھا۔

''ادی خیراں! پٹ محرم علی کا خیال بالکل درست ہے۔'' معاً دوست محمد کی سرگوشی ابھری۔ اس نے اپنے بھانجے محرم علی کی کسی بات کی تائید میں یہ کہا تھا لہٰذا وہ مزید بولا۔ ''یہ کمینہ علی بخش......! ہمارے خلاف اندر ہی اندر کوئی محاذ بنا رہا ہے...... اور یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ علی بخش کسی بدنام دھاڑیل کی اس سلسلے میں مدد حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔ کیونکہ اتنا تو مجھے بھی پتہ ہے کہ ادا دودا خان کے ہوٹل میں ہفتہ وار جو وزن پاڑیں (نشہ، جوا) وغیرہ کی محفل جمتی ہے وہاں نامی گرامی دھاڑیل مختلف بھیس میں آتے ہیں...... ضرور علی بخش نے وہیں کسی دھاڑیل سے گٹھ جوڑ کر لی ہو گی۔'' دوست محمد نے اپنی گفتگو ختم کی تو محمد علی بولا۔

''اب آگے کا سوچو...... اس کا کیا کیا جائے۔ اس طرح تو یہ ہم سب کے لئے بڑا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے؟''

''میں تو کہتا ہوں کہ اچانک پولیس کا چھاپہ لگوا کر ان دونوں کو ہی پکڑوا دیتے ہیں۔'' دوست محمد نے اپنی رائے دی لیکن محرم علی اس سے اختلاف کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں ماما سائیں...... اس طرح تو خود ہمارے ہوٹل ہی کی بدنامی ہے۔''

''خیر اب ایسی بات بھی نہیں ہے...... جاننے والے سب جانتے ہیں کہ ہمارے

ہوٹل میں ہر جمعرات کی رات کیا ہوتا ہے؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وڈے بھرا کی بات درست ہے، ہمیں پولیس کو بروقت مطلع کر کے دونوں کو اندر کروا دینا چاہئے...... نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری......'' محمد علی نے اپنے بھانجے محرم علی کی بات سے اختلاف اور بھائی دوست محمد کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

اس دوران خیرں بالکل خاموش بیٹھی اپنے دونوں بھائیوں اور بیٹے کی گفتگو سن رہی تھی۔ کمرے میں ایک لمحے کو پھر سکوت سا چھا گیا۔ انگیٹھی میں سلگتے ہوئے شعلوں کی حدت سے ان سب کے چہرے تپے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''ادی خیراں! تُو بھی کچھ بتا...... آخر کیا کیا جائے۔'' انجام کار دوست محمد نے اپنی بہن خیراں کو مخاطب کرتے ہوئے رائے لی تو وہ پُر خیال لہجے میں بولی۔

''ادا...... خیال تو میرا بھی یہی ہے کہ جس وقت علی بخش اور اس کا دوست دھاڑیل...... ایک ساتھ موجود ہوں تو پولیس کو خبر کر دینی چاہئے اور رہی بات ہوٹل کی بدنامی کی تو وہ تو ہم ویسے ہی فروخت کر رہے ہیں...... پھر بھلا ہوٹل کی بدنامی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟'' خیراں نے آخری بات اپنے بیٹے محرم علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہی تھی کیونکہ یہ اعتراض اس نے ہی کیا تھا...... لہٰذا وہ پُر زور لہجے میں بولا۔

''بات پھر وہیں پہ آئی امڑ گودی! ہوٹل کی بدنامی کے بعد بھلا کون اسے خریدے گا۔''

''میرا خیال ہے پھر بھی یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے، خریدنے والے بہت ہیں۔'' محمد علی نے کہا اور وہ سب بالآخر اس کی بات پر متفق نظر آنے لگے۔

☆======☆======☆

سرد اور یخ بستہ رات میں بیل گاڑی کا شہر تک کا سفر اگرچہ بیزار کن اور انتہائی تھکا دینے والا تھا مگر...... شاید ساون کے لیے یہ سفر ایک خوشگوار تبدیلی کا باعث تھا کیونکہ یہ سفر اس کی محبوبہ دلنواز اللہ رکھی کی سنگت میں جو تھا...... لیکن ساون محسوس کر رہا تھا کہ اللہ رکھی کافی پریشان اور مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔ ساون خاموشی کے ساتھ کوچبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ چاچی عنایتاں کو پیال کے اوپر گودڑ وغیرہ ڈال کراُوپر دو تین موٹی موٹی رلیوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا...... اللہ رکھی بھی بیل گاڑی کی ایک جانب اور ساون کی پشت کے ذرا قریب رلی اوڑھے سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ ساون بیل گاڑی چلاتے ہوئے حتی الامکان کوشش کر رہا تھا کہ دوران سفر اللہ رکھی کا دل بہلتا رہے یہی وجہ تھی کہ وہ گاہے بہ گاہے شاہ لطیف'' کی سر کوھیاری...... بھی گنگناتا جاتا...... لیکن اللہ رکھی کا اضطراب کسی طور

بھی کم نہیں ہو پا رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں بیل گاڑی کے ناہموار چوبی پہیوں کی چوں...... چک...... چوں...... چک...... چک کی مخصوص آواز انتہائی عجیب اور قدرے ناگوار لگ رہی تھی۔

بیل گاڑی اب کچا راستہ چھوڑ کر سیدھی شہر جانے والی پکی سڑک پر آ گئی تھی۔ پختہ سڑک کے شروع ہوتے ہی ساون نے بیل گاڑی کی رفتار ذرا تیز کر دی تھی۔ آسمان میں کہیں کہیں ٹمٹماتے تاروں کی مدھم مدھم روشنی میں سامنے سڑک کھیتوں کھلیانوں کے درمیان سے بل کھاتی ہوئی دور تاریکی میں گم ہو رہی تھی۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ ساون کی چونکہ اللہ رکھی کی جانب پشت تھی اسی لئے وہ اس کی سرمگیں آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ دیکھنے سے قاصر تھا۔ درحقیقت اللہ رکھی کو آج سے کافی عرصہ قبل کا وہ دردناک منظر یاد آ رہا تھا جب اسی طرح وہ اپنے بیمار بوڑھے باپ مٹھل کو بہ غرض علاج ایسی ہی ٹھٹھرتی تاریک رات میں شہر لے جا رہی تھی اور اس وقت اس کا چاچا سوڈھل اس کے ہمراہ تھا...... مگر بدقسمتی سے اس کا باپ راستے ہی میں دم توڑ گیا تھا۔ اگرچہ وہ اس تلخ اور سفاک حقیقت سے بے خبر تھی کہ اس کا بیمار بوڑھا باپ بیماری سے نہیں مرا بلکہ...... اس کے لالچی اور سفاک چاچا نے ہلاک کر ڈالا تھا اور بعد میں وہ خود بھی عبرتناک موت سے ہمکنار ہو کر جہنم واصل ہو چکا تھا۔

''اللہ رکھی کیا سوچ رہی ہے تُو...... چاچی تو ٹھیک ہے ناں......'' دفعتہً ساون نے پیچھے سکڑی سمٹی بیٹھی اللہ رکھی سے پوچھا تو وہ چونک کر خیالات سے باہر نکلی۔ پھر دھیرے سے قریب لیٹی چاچی عنایتاں کے بیمار وجود پر سے رلی اٹھا کر اس کی پیشانی پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے جواباً مغموم سے لہجے میں بولی۔

''ساون! چاچی کو ابھی تک بخار چڑھا ہوا ہے۔'' اس کی مرتعش آواز سے ساون نے اس کے گہرے غم کا اندازہ لگایا لہٰذا وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''اللہ رکھی...... رب سائیں سے دعا کر...... وہ ٹھیک کرے گا...... پریشان نہ ہو۔ ہم صبح تڑکے شہر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ تیرے دونوں بیل ہیرا اور سانولا بہت تگڑے ہیں، یہ تھکنے والے نہیں۔'' اللہ رکھی کو ساون کی گفتگو نے کافی تسلی دی تو اسے ذرا حوصلہ ہوا۔ پھر اللہ رکھی نے ساتھ لائی ہوئی دوا کی ایک شیشی کا ڈھکنا کھولا اور اس کے ڈھکن میں دوا الٹ کر عنایتاں چاچی کے چہرے سے رلی تھوڑا ہٹائی پھر وہ دوا اس کے ادھ کھلے ہونٹوں کے بیچ انڈیل دی۔ بیل گاڑی کے ہچکولوں کی وجہ سے دوا ذرا چھلکی مگر اس نے جیسے تیسے کوشش

کر کے ایک اور دوا سے بھرا ڈھکن چاچی کے منہ میں انڈیلا۔ یہ دوا حکیم بڈھل نے دی تھی۔ جو محض عارضی افاقے کے سوا اور کوئی خاص فائدہ نہیں دیتی تھی...... مگر اللہ رکھی کو اس وقت یہی دوا غنیمت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بیمار چاچی عنایتاں کی صحت یابی کے لیے اور جلد از جلد شہر کے ہسپتال پہنچنے کی دعائیں مانگے جا رہی تھی۔ ساون شاید اس طویل خاموشی کا مطلب جانتے ہوئے اب خاموشی سے بیل ہانکنے میں محو تھا۔

☆======☆======☆

اگلے دن پورے گوٹھ داد پور میں ساون سے متعلق یہ افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ ساون نہایت ہی چالاکی سے اللہ رکھی کو شہر بھگا کر لے گیا ہے اور اس فرار میں چاچی عنایتاں بھی ملوث ہے۔

ان افواہوں کو تقویت پہنچانے والے منشی میرل کے آدمی سرفہرست تھے۔ یوں تو درون خانہ گوٹھ کے لوگوں کو اس حقیقت کا علم تھا کہ ساون اور اللہ رکھی کے درمیان کسی قسم کا تعلق ہے...... لیکن اب ان افواہوں نے ایسے لوگوں کے منہ بھی وا کر دیئے تھے...... یہ بھی ایک امر واقعی ہے کہ جو واقعہ جس قدر اچانک رونما ہوتا ہے وہ اسی قدر زیادہ افواہوں کی زد میں آ کر مشہور بھی ہوتا چلا جاتا ہے...... ہر چند کہ کچھ مثبت انداز فکر رکھنے والے افراد نے یہ قیاس بھی لگایا تھا کہ چونکہ چاچی عنایتاں کافی عرصے سے بیمار تھی...... اور گوٹھ میں اس کا مرض بھی لاعلاج ہو چکا تھا لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہو اور ساون ازراہِ ہمدردی اسے شہر لے گیا ہو...... لیکن بات پھر گھوم پھر کر وہیں آتی تھی کہ...... آخر یہ کارِ خیر ساون ہی نے کیوں انجام دیا جبکہ دونوں کے گھر شمالاً جنوباً واقع تھے...... مزید یہ کہ اتنی رات گئے آخر ان کا اتصال کیوں کر ممکن ہوا تھا۔

☆======☆======☆

''اڑے میرل تیری ہنڈیا تو پھر الٹ گئی...... وہ چھوکرا تو اس حور پری کو ہی لے اڑا...... اب کیا ہو گا؟'' وڈیرے لکھ میر خان نے قریب کھڑے منشی میرل کو مخاطب کر کے کہا...... تو وہ کھسیانی سی ہنسی کے بولا۔

''برابر سائیں وڈا...... کچھ کرنا پڑے گا۔ یہ چھوکرا ساون کچھ زیادہ ہی چالاک ثابت ہو رہا ہے...... وڈے خان جیسے شخص کو اس نے تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا......''

''میرل...... اڑے میں نے تجھے اس چھوکرے کی تعریفیں کرنے کے لیے نہیں بلایا ہے...... سمجھا...... مجھے کھرا تیل چاہئے، نتیجتاً...... کام...... سمجھ۔'' وڈیرا خشمناک نظروں سے

منشی میرل کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ منشی! میرا کام بہت جلد ہونا چاہئے......؟ اگر تُو نے دس دنوں کے اندر اندر اللہ رکھی کو میری حویلی کی باندی نہ بنایا...... تو...... آگے تُو خود جانتا ہے چنگی طرح......'' اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

منشی میرل کی حالت دیدنی تھی۔ اسے وڈیرے نے جو کام سپرد کیا تھا اس کے لیے تو پورا مہینہ بھی کم تھا...... پہلے وہ جس کام کو سہل سمجھ رہا تھا اب وہی اسے کارِ دارد نظر آ رہا تھا...... کیونکہ جب تک ساون اور اللہ رکھی گوٹھ میں موجود تھے تو اسے امید تھی کہ وہ ان دونوں کو انجام کار بہلا پھسلا کر حویلی کا غلام بنا لے گا...... اور اسی لئے اس نے ساون کو بھاری قرض دے کر گویا ایک طرح اس کے گلے میں غلامی کی زنجیر ڈالنا چاہی تھی...... لیکن اب ساون اور اللہ رکھی کے اچانک غائب ہو جانے سے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا...... تاہم وڈیرے کو تسلی دینے کی غرض سے بولا۔

''سائیں بھوتار! پچاس ہزار کی رقم میں ساون کے تو فرشتوں سے بھی وصول کر کے رہوں گا...... نہیں تو میں اس کے پورے کنبے کو بیگار پر زمینوں پر گھسیٹ لوں گا...... آپ بے فکر رہو...... میں نے پکے کاغذ پر اس کا انگوٹھا لگوا لیا ہے......''

وڈیرے نے منشی میرل کو خشمناک نظروں سے گھورا اور نخوت آمیز لہجے میں بولا......

''ارے میرل...... میں نے کہا نا بابا...... مجھے دس دنوں کے اندر اندر اللہ رکھی چاہئے اور بس......!'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا جانے کے لیے...... اب منشی اوطاق میں اکیلا رہ گیا...... اس کے اندر شدید قسم کی پکڑ دھکڑ جاری تھی...... اس نے اپنے کان میں اٹکی ہوئی پنسل نکال کر ایک جانب پھینکی اور ہاتھ میں پکڑے رجسٹر کو قریب ہی مونڈھے پر اچھالا...... پھر وہ اوطاق سے باہر نکل آیا...... وہ اب تیز تیز قدموں سے خانو دھچر کے گھر کی طرف جا رہا تھا...... دل ہی دل میں وہ اس وقت کو کوسنے لگا...... جب اس نے اللہ رکھی کے حسن و جمال سے وڈیرے لکھ میر خان کو آگاہ کرتے ہوئے اسے اس حد تک مجنوں بنا دیا تھا کہ اب وہ میرل کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ بالآخر میرل نے اب یہ طے کیا کہ منشی گیری کرتے ہوئے وہ یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتا اس کے لیے اب اسے بدمعاش بننا پڑے گا اور اس سلسلے میں اسے خانو دھچر سے زیادہ کوئی اور سودمند شخص نظر نہیں آیا تھا...... وہ جانتا تھا کہ خانو دھچر ایسا شخص تھا جو ہر دم ان کے پاؤں چاٹنے کے لیے تیار رہتا تھا...... یہی نہیں بلکہ اپنے ''سائیں وڈوں'' کی خوشنودی اور سرخروئی حاصل کرنے کے لیے انتہا درجے کی بے غیرتی اور کمینے پن کی مثال بننے سے بھی نہیں چوکتا تھا...... یہی وجہ تھی کہ خانو دھچر وڈیرے لکھ میر خان جیسے

با اثر اور منشی میرل جیسے سودمند شخص کا آشیرواد حاصل کرنے کے لیے ان کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کیے رہتا تھا...... اور اکثر اپنی طلاق یافتہ بہن فضلاں کو بھی بوقت ضرورت حویلی میں خدمت چاکری کے لیے بھیجتا رہتا تھا لہٰذا میرل نے اللہ رکھی کو سہل طریقے سے وڈیرے کی حویلی کی ''باندی'' بنانے کے لیے خانو دھچر کو آگے کیا تھا...... مگر عین وقت پر سوڈھل کی موت نے منشی میرل کا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا۔

بہرطور میرل...... خانو کے گھر پہنچا تو اس وقت شام کافی اتر آئی تھی۔ حسب توقع خانو دھچر کے کچے مکان کی دیواروں پر اپلے تھپے ہوئے تھے...... اس نے اپنی ناک سکیڑی پھر شکستہ سی چوکھٹ پر جھولتے ٹاٹ کے پردے کو پرے کرتے ہوئے اس نے زور سے دستک دی...... تھوڑی دیر بعد اندر سے کسی نے پوچھے بغیر دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔ یہ خانو دھچر کی بہن فضلاں تھی...... منشی میرل کو دیکھتے ہی اس کے سانولے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ مچل گئی اور پھر وہ جیسے بچھتے ہوئے بولی۔

''آؤ منشی صائب...... ! تساں نے ہمارے گریب خانے کی رونقاں ہی بڑھا دی...... آؤ سائیں...... آ جاؤ اندر......'' وہ جھکتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئی...... منشی میرل نے اندر قدم رکھا، کچے اور ناہموار صحن کے ایک جانب چھپر تلے ایک انگیٹھی سلگ رہی تھی۔ فضلاں نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک خستہ سا سرکنڈوں کا بنا مونڈھا...... سلگتی انگیٹھی کے قریب سرکا دیا اور میرل سے مخاطب ہوئی...... ''آؤ...... سائیں...... ادھر بیٹھو...... آگ کے پاس...... آج تو دوپہر ہی سے سردی زوروں پر ہے......''

فضلاں کا خیال تھا کہ حسب عادت منشی میرل اسے ہی آگ کی مثال ٹھہراتے ہوئے جگت بازی سے کام لے گا...... لیکن اسے اس وقت مایوسی ہوئی جب میرل کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا اور وہ خاموشی سے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر گہری تفکیر گھنڈی ہوئی تھی جسے دیکھ کر فضلاں کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

''خانو دھچر......! کہاں ہے!'' دفعتاً میرل نے پوچھا۔

''ابھی آتا ہوگا...... وہ چاولوں کا آٹا پسانے گیا ہے عبدالغفور کی چکی پے......'' لمحہ بھر توقف کے بعد وہ بغور میرل کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے متفسر ہوئی

''سائیں خیر تو ہے نا...... آج تمہارے چہرے پر بڑی گڑتی (پریشانی) نظر آ رہی ہے...... اچھا بیٹھو...... میں چاں پا ڑین...... کا بندوبست کرتی ہوں۔''

''نہیں اس کی لوڑ نہیں...... بس میں آگ تاپ رہا ہوں اور خانو دھچر کا انتظار کروں

گا۔‘‘ میرل نے کہا...... اس کے سپاٹ لہجے سے ژولیدگی مترشح تھی۔ فضلاں گومگو کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔

☆======☆======☆

علی بخش اکو دھاڑیل سے ملنے کے بعد خاصا مطمئن ہو گیا تھا...... اس کے چہرے پر اب الجھن یا پریشانی کی بجائے بے خوفی اور دلیری نے لے لی تھی...... جس کا نفسیاتی اثر اس کی سوتیلی ماں، خیراں، دونوں ماموؤں دوست محمد اور محمد علی علاوہ ازیں اس کے بھائی محرم علی پر یوں پڑا کہ انہوں نے فوری چپ سادھ لی تھی...... یعنی وہ اس پر اب کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے...... علی بخش کو ان کے گومگو چہروں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اب ایک بے نام سے خوف میں مبتلا ہوں...... تاہم علی بخش کا جب بھی ان سے سامنا ہوتا تھا انہیں ایسی زخمی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا جیسے اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا ایک ایک حساب لینے کے لئے بے چین ہو۔ بہر طور علی بخش اپنے اوقات کار کے مطابق صبح ہوٹل سنبھالتا اور دوپہر کے بعد گھر رہتا۔ ایک دن وہ اپنا ’’وقت‘‘ پورا کر کے گھر آیا تو خیراں نے اس سے پوچھا...... ’’محرم علی آج صبح بھی تیرے ساتھ تھا ہوٹل میں......؟‘‘

’’نہیں......‘‘ علی بخش نے سرد لہجے میں مختصر جواب دیا......

’’تو پھر کہاں ہے وہ...... آج صبح ہی سے گھر بھی نہیں آیا......‘‘ اس کی ماں خیراں کے لہجے میں تفکر تھا۔

’’مجھے کیا معلوم......؟‘‘ علی بخش کے اندر دھکڑ پکڑ شروع ہو گئی تھی...... وہ اب اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا...... دوپہر کا کھانا وہ ہوٹل ہی سے کھا کر آتا تھا...... ادھر خیراں اپنے بیٹے محرم علی کے لیے پریشان ہوئی جا رہی تھی اور ساتھ ہی علی بخش کی بے اعتنائی پر وہ اندر ہی اندر گھل بھی رہی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ علی بخش اس کے بیٹے کو ڈھونڈنے جائے...... وہ اسے بول بھی نہیں سکتی تھی...... کیونکہ وہ جانتی تھی کہ انہوں نے علی بخش کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ مگر اس وقت اسے مزید پریشانی نے آ گھیرا جب شام میں...... ہوٹل سے ایک ملازم محرم علی کو بلانے کے لیے آیا تو خیراں اپنا سینہ پیٹ کر علی بخش کے آگے بین کرنے لگی‘‘...... جا...... پٹ...... میڈے لعل کو ڈھونڈ جا کر...... پتہ نہیں کہاں ہے وہ......‘‘

علی بخش نے ایک نظر خیراں کو دیکھا...... پھر خاموشی سے باہر نکل گیا...... مگر باہر آتے ہی وہ محرم علی کو ڈھونڈنے کی بجائے ہوٹل آ گیا...... وہ جان گیا تھا کہ اکو دھاڑیل نے اپنا

جوہر دکھایا ہے...... وہ اب خوش تھا اپنی سوتیلی ماں خیراں کو پریشان دیکھ کر...... رات گئے وہ گھر آیا تو...... اسے اس وقت مزید طمانیت حاصل ہوئی جب خیراں کو اس نے انتہائی بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں اپنے سامنے گڑگڑاتے ہوئے پایا...... وہ اسے دیکھتے ہی بولی...... ’’پٹ علی بخش...... کیا ہوا...... میڈا لعل نہیں آیا...... تجھے نہیں ملا وہ...... کہاں ہے میڈا محرم علی...... علی بخش تجھے رب سائیں کا واسطہ...... اپڑیں مرشد کا واسطہ...... جا میرے لعل کو ڈھونڈ کر لا دے......‘‘

علی بخش نے ایک نفرت انگیز نگاہ سے خیراں کو گھورا...... جیسے دل میں اس سے کہہ رہا ہو کہ...... اس وقت تیری ممتا کہاں جا سوئی تھی جب تُو نے اپنے دونوں بھائیوں اور بیٹے سے مجھے پٹوایا تھا...... میں بھی آخر کسی کا بیٹا تھا؟ مگر وہ چپ رہا...... ’’اچھا تو نہیں جاتا تو میں خود جاتی ہوں اپنے لعل کو ڈھونڈنے......‘‘ خیراں اسے بدستور خاموش دیکھ کر بولی...... اور سر پہ چادر اوڑھ کر ابھی باہر ہی نکلنا چاہتی تھی کہ علی بخش نے اس کا راستہ روک لیا۔

’’اس وقت رات ہو رہی ہے، تو کہاں جائے گی...... ذرا ماٹھ (صبر) کر...... ہو سکتا ہے وہ یار دوستوں کے ساتھ شہر نکل گیا ہو......‘‘ علی بخش نے اسے بالآخر تسلی دینے کی کوشش کی مگر اسے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن محسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خیراں کو بھی تشفی نہیں ہوئی۔ لہٰذا قدرے تیز لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

’’علی بخش...... تُو میرے آگے سے ہٹ جا...... میرا محرم جب تک گھر نہیں آئے گا میں چین سے نہیں بیٹھ سکتی......‘‘ مگر علی بخش اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں...... اس بار خیراں نے پہلے سے بھی تیز اور قدرے غصیلے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا...... ’’علی بخش! میں کہتی ہوں ہٹ جا...... میرے راستے سے...... مت بھول کہ میں تیری ماں بھی ہوں۔‘‘

’’میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تُو میرے پیو (باپ) کی زال ہے اور اس کی لج (عزت) بھی...... اتنی رات کو میں تجھے نہیں نکلنے دوں گا......‘‘ علی بخش نے بلند آواز اور سپاٹ لہجے میں ماں کی جانب تکتے ہوئے کہا...... اس کے لہجے کی قطعیت نے خیراں کا سارا جوش بخارات بنا کر ہوا میں تحلیل کر دیا مگر چپ وہ پھر بھی نہ رہ سکی، تنک کر بولی۔

’’میں تیرے پیو (باپ) کی اگر لج (عزت) ہوں تو تیری ماں بھی ہوں...... اور محرم علی بھی تیرا بھائی لگتا ہے۔ مگر تُو اسے ڈھونڈنے کی بجائے آرام سے گھر چلا آیا ہے ہونہہ۔‘‘ اس کا رویہ حسب فطرت تضحیک آمیز ہو گیا......

علی بخش کو اس کی بات پر غصہ تو بہت آیا اور جی میں بھی اس کے آئی کہ اس سے کہے

کہ......تُو نے مجھے بیٹا سمجھا ہی کب ہے......اور نہ ہی محرم نے اسے اپنا بھائی......اس کا وجود ایک بار پھر تلخ ہوتا چلا گیا......تاہم وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں جو بے شک سوتیلی اور بری سہی لیکن بہرحال اس کی ماں تھی......اس کا یوں رات میں اکیلے نکلنا کسی طور مناسب نہ تھا......لہٰذا وہ محض اسے دکھاوے کی غرض سے باہر چلا گیا......مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ پھر سیدھا اپنے ہوٹل چلا آیا۔ مگر جاتے جاتے اس نے کسی ''اندیشے'' کے تحت دروازے کو باہر سے کنڈا لگا دیا تھا تاکہ اس کی ماں خیراں مغلوب الحواس ہو کر باہر نہ نکل جائے۔ اس کے دل میں یہی کھد بد ہو رہی تھی کہ ہو نہ ہو یہ ''کام'' اکو دھاڑیل کا ہی ہو سکتا ہے......جس کا مقصد یہی تھا کہ علی بخش کو اس کے گھر میں تنہا اور کمزور نہ سمجھا جائے۔ اس لئے ہو سکتا ہے وہ ذرا پریشان کرنا چاہ رہا ہو......بہرطور جو کچھ بھی تھا علی بخش اس سے خوش تھا......علی بخش کو اس قدر مجروح کیا گیا تھا کہ آج وہ اپنے اوپر زیادتی کرنے والوں کو پریشان اور ژولیدہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا......پھر وہ ہوٹل میں بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا تھا اور گھر واپس آ گیا دروازے پر ویسے ہی کنڈا چڑھا ہوا تھا جیسا وہ لگا کر گیا تھا......گھر کے اندر قدم رکھتے ہی اسے اپنی سوتیلی ماں کے رونے سسکنے کی آواز سنائی دی تھی جبکہ اس کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ عود کر آئی۔

☆======☆======☆

ادھر ساون کی اچانک گمشدگی پر اس کے گھر والے بھی پریشان تھے......اُڑتی اُڑتی یہ افواہ ان کے کانوں سے بھی ٹکرائی تھی کہ ساون اللہ رکھی کو لے کر بھاگ گیا تھا۔ ساون کی ماں کا تو رو رو کر برا حال ہو رہا تھا اور کم و بیش یہی حال اس کی جوان بہن ہدایتاں کا بھی تھا......جبکہ اس کے باپ موگو ہاری پر جنون سوار تھا۔

''ساون کے پیو (ابا) تیکوں رب سوہڑیں دا واسطہ میڈے لعل کو ڈھونڈ لا......'' ساون کی ماں موگو سے التجائیہ آمیز لہجے میں بولی۔

موگو نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا اور درشت لہجے میں بولا......''ماٹھ (چپ) کر کے بیٹھ......جو دوبارہ اس بدذات کا نام لیا تو......ایسے نافرمان بیٹے کو میں ڈھونڈنے نکلوں......ہونہہ......'' مگر موگو کے درشت لہجے میں دور کہیں دکھ کی بھی آمیزش تھی......ایک جانب ساون کی بہن ہدایتاں بھی اپنے سر پہ دھری اجرک کے کونے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ بھائی ساون کی اچانک گمشدگی نے اسے غم سے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا......وہ باپ سے التجا کرتے ہوئے بولی۔

''بابا! ادا ساون کو ماپھ کر دے......پتہ نہیں کہاں ہو گا......آج تیسرا دن ہے اس کو......کچھ کرو بابا......'' یہ کہہ کر وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ موگو کا دل بھی بیٹی کو روتے دیکھ کر پسیجنے لگا......مگر اس نے اپنی رقت غم ان پر ظاہر نہیں ہونے دی......اس کے چہرے پر تفکیر آمیز لکیریں سی نمودار ہونے لگی تھیں۔ آخر کو وہ ساون کا باپ تھا......بے شک اپنے بیٹے سے ناراض تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اپنے جوان کڑیل بیٹے کی گمشدگی پر چپکا بیٹھا رہے......مگر جب اس کی نافرمانی یاد آنے لگتی تو اس کا دل پتھر ہونے لگتا کیونکہ اس کے چھوٹے بھائی پریل نے بھی اس سے تعلقات مکمل طور پر منقطع کر ڈالے تھے......اس کے کانوں میں بھی اُڑتی اُڑتی یہ بھنک پڑ چکی تھی کہ ساون کسی اللہ رکھی نامی لڑکی سے شادی کا خواہاں ہے اور گوٹھ سے ان دونوں کا بیک وقت گم ہونا بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی......اس کے ناراض بھائی پریل نے دونوں گھروں کو ملانے والی کھڑکی بھی توڑ کر اس میں کچھ اینٹیں چنوا کر بند کر دی تھی۔

ان سب باتوں کے باوصف اب موگو......یہ سوچ رہا تھا کہ بھائی تو ناراض ہوا سو ہوا......پر اپنے بیٹے ساون کو بھی ناراض کر کے اسے کھونا دانشمندی نہ تھی......پھر اس ضمن میں جب اس کی بیوی اور بیٹی ہدایتاں کے روتے بلکتے چہروں کی طرف دیکھتا تو وہ ذرا اور خفیف سا ہونے لگتا تھا......بالآخر اس نے ہامی بھر لی اور فوری شہر لاڑکانہ جانے کا قصد کیا......ساون کی ماں اور بہن کے غمناک چہرے یک دم کھل اٹھے تھے۔

☆======☆======☆

لاڑکانہ کے اس سرکاری ہسپتال میں بھانت بھانت کے مریضوں کا رش تھا۔ ہسپتال کے وسیع احاطے میں جابجا مریضوں کے ہمراہ آئے لوگوں نے رلیاں، میلی گودڑیاں بچھا کر عارضی قیام کیا ہوا تھا......یہ وہ افراد تھے جو لاڑکانہ کے اریب قریب کے گاؤں گوٹھوں سے آئے تھے اور ان کے مریض مختلف بیماریوں کے وارڈز میں داخل تھے۔ ایسے میں ہسپتال کے احاطے کی بوسیدہ سی دیوار کے کونے میں رلی اور گودڑی بچھائے ساون اور اللہ رکھی بھی متفکر بیٹھے تھے۔ وہ صبح دم ہی اپنے گوٹھ جاگیرداد پور سے یہاں پہنچے تھے اور یہاں پہنچتے ہی جاں گسل اور تکلیف دہ مراحل سے گزرنے کے بعد چاچی عنایتاں کو آرتھوپیڈک (ہڈی) وارڈ میں داخل کرایا تھا۔ آرتھوپیڈک سرجن ڈاکٹر نے چاچی عنایتاں کو چھ دن داخل رہنے کی تاکید کی تھی۔ مذکورہ سرجن ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق چاچی عنایتاں کو آرتھرائٹس ہو گیا

تھا اور علاج میں دیر کرنے کی وجہ سے وہ نہ صرف ایک مستقل قسم کے عذاب ناک درد نما بخار میں مبتلا ہو چکی تھی بلکہ اس بیماری نے اب اس کے دل پر بھی حملہ کر ڈالا تھا یہی وجہ تھی کہ چاچی عنایتاں کو روزانہ دل کے وارڈ میں بھی لے جایا جاتا تھا جہاں دل کے ڈاکٹر سے ہدایت لینے کے علاوہ دیگر متعلقہ روٹین ٹیسٹ بھی ہوتے تھے..... علاوہ ازیں باہر کی ادویات انہیں خود اپنے پیسوں سے ہی لینی پڑتی تھیں..... کیونکہ سرکاری ہسپتال میں برائے نام ہی ادویات مریضوں کو میسر ہوتی تھیں۔

اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے اور حسب معمول یہ لوگ مختلف وارڈز کی راہداریوں میں رات بھر قیام کرنے کے بعد اب ہسپتال کے نچلے عملے نے انہیں باہر احاطے میں بسیرا کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا..... کیونکہ اس وقت وارڈز میں متعلقہ شعبہ کے سرجن اور ڈاکٹر پروفیسر وغیرہ راؤنڈ لگاتے تھے۔

ساون اور اللہ رکھی دونوں باہر دھوپ میں رلی پر پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے۔

''ساون! ہمیں کتنے دن اور یہاں رہنا پڑے گا.....؟ میرا تو بڑا دل گھبرا رہا ہے یہاں.....'' دفعتاً اللہ رکھی نے لرزیدہ لہجے میں ساون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ساون نے بڑے رسان کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور تشفی آمیز لہجے میں بولا..... ''اللہ رکھی! حوصلہ پکڑ..... میں ہوں نا تیرے ساتھ، جتنے دن رہنا پڑے..... رہیں گے یہاں.....بس دعا کر اللہ سائیں سے کہ وہ ہماری چاچی کو جلد اچھا کر دے.....'' ساون نے اتنا کہا اور پھر جانے کہاں کھو سا گیا..... اللہ رکھی چپ ہو گئی تھی پھر لحہ بھر توقف کے بعد وہ پھر بولا..... ''اللہ رکھی! تو یہاں بیٹھ..... چاچی کی دوائیں ختم ہونے کو ہیں میں.....'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ..... معاً..... وارڈ کی عمارت سے ایک باوردی وارڈ بوائے باہر احاطے میں نکل کر آیا اور با آواز بلند چلایا۔

''ہڈی وارڈ کے بیڈ نمبر بارہ کی مریضہ کے ساتھ کون ہے۔'' بیڈ نمبر بارہ اور ہڈی وارڈ کا سن کر ساون چونکا، کیونکہ بارہ نمبر کا بیڈ چاچی عنایتاں کا تھا..... وہ جلدی سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔

''یہ لو بابا.....! یہ دوائیاں لے آؤ.....'' وارڈ بوائے نے ایک کاغذ ساون کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور مشینی انداز میں واپسی کے لیے گھوم گیا۔ ساون واپس اللہ رکھی کے پاس آیا..... پرچہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

''اللہ رکھی! میں دوائیاں لے کر آتا ہوں.....'' اس نے اللہ رکھی سے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اللہ رکھی نے اسے روکا اور ایک چھوٹی سی میلی پوٹلی کو کھولنے لگی..... ساون جان گیا وہ کیا کرنا چاہ رہی تھی لہٰذا اسے منع کرتے ہوئے بولا۔ ''رہنے دے اللہ رکھی.....! ہیں پیسے میرے پاس.....'' یہ کہہ کر وہ رکا نہیں، اللہ رکھی اسے دیکھتی رہ گئی۔

میڈیکل اسٹورز زیادہ دور نہیں تھا..... ساون ہسپتال کے احاطے کے گیٹ سے باہر آ گیا تھا۔ اس کے پاس خاصی رقم موجود تھی..... وہ اب تک اس میں سے ہی خرچ کرتا چلا آ رہا تھا۔ اللہ رکھی کو ہنوز اس نے یہ نہیں پتہ چلنے دیا تھا کہ یہ رقم وہی ہے جو اس نے وڈیرے لکھ میر خان سے اس کے رشتے کے بدلے لی تھی۔ اللہ رکھی کو اگرچہ یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ ساون سارا خرچہ اٹھا رہا تھا لیکن..... وہ جب اس ضمن میں ساون سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو ساون اس کو مصنوعی انداز میں جھڑک کر خاموش کرا دیا کرتا تھا..... بہر طور ادھر اللہ رکھی رلی پر بیٹھی ساون کی منتظر تھی..... فضا قدرے صاف تھی..... چمکیلی دھوپ کی تمازت بھلی محسوس ہو رہی تھی..... ہسپتال کی عمارت کے اندرنی گوشے میں رفتہ رفتہ مریضوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی مختلف آوازوں کے علاوہ بچوں کے رونے چلانے کی بھی آوازیں آ رہی تھیں۔ اللہ رکھی نے جہاں ڈیرا جما رکھا تھا وہ احاطے کے بیرونی گیٹ سے اندر داخل ہونے والے لوگوں کو تکے جا رہی تھی۔ جن میں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سب تھے اسے شاید ساون کا انتظار..... پھر اچانک ایک شخص کو دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکی بلکہ اسے دیکھتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ وہ خانو دھچر تھا۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ خانو دھچر نے بھی اللہ رکھی کو دیکھ لیا تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ پھر خانو دھچر نے جیسے اللہ رکھی کو دیکھا ان دیکھا کرتے ہوئے یک دم قدم بڑھا لئے تھے اور اللہ رکھی نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ خانو دھچر نے اسے پہچانا نہیں تھا..... ورنہ خاصی ذہنی پریشانی اٹھانی پڑتی۔ مگر معصوم اور سادہ لوح اللہ رکھی کی یہ خوش فہمی تھی جبکہ خانو دھچر نہ صرف اسے بلکہ باہر گیٹ سے نکلتے ساون کو بھی دیکھ چکا تھا تاہم وہ کسی مقصد کے تحت اللہ رکھی کو یہ تاثر دے کر محتاط نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھ چکا ہے۔ درحقیقت وہ منشی میرل کی ہدایت کے مطابق..... ساون اور اللہ رکھی کو تلاش کرنے کی غرض سے صبح دم ہی گوٹھ سے نکلنے والی پہلی مسافر بس میں سوار ہو کر شہر آ دھمکا تھا..... وہ ایک چالاک اور زیرک شخص تھا۔ لاڑکانہ پہنچتے ہی اِدھر اُدھر خوار ہوتے رہنے کے بجائے سیدھا اِدھر ہی چلا آیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ چاچی عنایتاں بیمار تھی اور وہ اس جگہ

کے علاوہ بھلا اور کہاں ہو سکتے تھے۔

لہٰذا اب وہ الٹے پاؤں اسی دن گوٹھ داد پور لوٹ گیا اور ذرا دیر بعد وہ منشی میرل کے سامنے اوطاق میں بیٹھا اپنی مکار پردازی کی تفصیل بتا رہا تھا۔

''منشی سائیں! اب جو کچھ کرنا ہے ذرا تکڑا (جلدی) کرلو...... ورنہ وہاں سے بھی وہ چڑیا اڑی تو اس کا ہاتھ آنا مشکل ہو جائے گا...... وہ چھوکرا ساون اسے کسی بھی قیمت میں واپس گوٹھ لوٹنے نہیں دے گا......'' خانو ڈھچر ساری تفصیل بتانے کے بعد پُر زور لہجے میں سامنے مونڈھے پر بیٹھے منشی میرل سے بولا تو منشی میرل دھیرے دھیرے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ پھر بولا۔

''خانو! بابا...... تُو ابھی اپنے گھر جا...... میں سائیں بھوتار سے بات کرتا ہوں...... پر صبح تڑکے ادھر ہی آ جانا، ہوسکتا ہے تمہیں پھر شہر جانا پڑے اور اس بار...... میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا......'' منشی نے کہا اور خانو ڈھچر مؤدبانہ انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر......

''حاضر سائیں......'' کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا...... اور ادھر منشی میرل نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا، وہ خانو ڈھچر کے جاتے ہی اوطاق سے نکل آیا...... اس کا رخ وڈیرے کی حویلی کی جانب تھا...... اسے معلوم تھا کہ وڈیرا اس وقت حویلی میں اپنے کمرۂ خاص میں موجود ہوگا۔

☆======☆======☆

''سائیں بھوتار......! ان دونوں چھوکری اور چھوکرے کا پتہ چل گیا ہے......'' منشی میرل وڈیرے کو اپنی کارگزاری بتاتے ہوئے قدرے پھول کر بولا...... تو وڈیرے لکھ میر خان نے ایک ہی جھڑک میں اس کی ساری ہوا نکالتے ہوئے کہا۔

''اڑے بابا! تو میں کیا کروں پھر......؟ پتہ معلوم ہو گیا ہے تو وار کرنا بابا...... دونوں کو پکڑ لے پھر...... مجھے اللہ رکھی چاہئے بس......'' منشی میرل اپنی جگہ دبک سا گیا...... پھر فوراً بولا۔

''سائیں وڈا...... برابر...... وہ بات یہ ہے کہ ساون اور اللہ رکھی نے چاچی عنایتاں کو شہر کے بڑے سرکاری ہسپتال میں داخل کرایا ہوا ہے...... اب مجھے خانو ڈھچر اور چند آدمیوں کے ساتھ شہر جانا ہوگا...... ظاہر ہے پھر وہاں کچھ روز رکنا بھی پڑے گا...... تو......'' منشی میرل دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو رہا اور الوؤں جیسے دیدوں سے وڈیرے کی جانب تکنے لگا...... وڈیرا اس کی بات کا مقصد سمجھتے ہوئے بولا۔

''چنگا بابا چنگا...... شہر میں بنگلہ ہے نا آپڑاں...... بھٹائی ولا...... ادھر تم لوگ رہ لینا...... وہاں چھوٹی جیپ بھی ہے...... باقی ادھر سے تم کو ملکھا آپڑیں لینڈ روور میں لے جائے گا...... بس اب جاؤ......''

''وڈی مہربانی سائیں بھوتار...... ہمارا کام آسان ہوگیا......'' منشی میرل یکدم جیسے خوش ہوگیا پھر مزید بولا...... ''بس سائیں اب تھوڑے دونوں کی بات اور ہے...... میں......''

''اچھا بالا...... بالا...... اب جا میرے شغل پاڑیں کا وقت ہو رہا ہے......'' وڈیرے نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا...... اور منشی ہاتھ جوڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

''بھٹائی ولا......'' لاڑکانہ کے قدرے متمول علاقے میں واقع ایک قدیم طرزِ تعمیر کا خوبصورت بنگلہ تھا۔ یہاں زیادہ تر ایم این اے اور ایم پی اے ٹائپ کے سیاستدان فروکش تھے...... بالخصوص الیکشن کے دنوں میں یہاں بڑی گہما گہمی دیکھنے میں آتی تھی۔ اس کے بعد عام دنوں میں یہ بنگلے ویران پڑے رہتے تھے...... مکمل طور پر یہاں نوکروں، چاکروں، باورچیوں اور چوکیداروں کا تسلط رہتا تھا۔ وڈیرا لکھ میر خان بھی بلدیاتی الیکشن کے سلسلے میں یہاں ہفتوں قیام کرتا تھا مگر اب یہ خالی تھا...... منشی میرل اور خانو ڈھچر لگ بھگ چھ سات دوسرے گماشتوں سمیت یہاں پہنچ چکے تھے۔

☆======☆======☆

پھر ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا...... یعنی پورے چھتیس گھنٹے پُراسرار طور پر گم شدہ رہنے والا محرم علی...... ایک دن خود ہی گھر آگیا...... اس کی اچانک صحیح سلامت واپسی پر گھر کے سب افراد پہلے تو متحیر ہوئے پھر خوشی سے نہال ہوگئے۔ البتہ علی بخش...... محرم علی کو صحیح سالم لوٹتے دیکھ کر ذرا بجھ گیا تھا۔

شام کا وقت تھا...... خیراں اپنے گھر میں بیٹھی رو رہی تھی اور اس کے دونوں بھائی دوست محمد اور محمد علی اس کے پاس بیٹھے اپنی بہن کو تسلی دے رہے تھے کہ اچانک محرم علی گھر میں داخل ہوا اور پھر وہ سب اس کے گرد جمع ہوگئے...... محرم علی کا چہرہ کسی انجانے خوف کے زیر اثر اترا ہوا تھا۔ وہ اندر سے بہت خوف زدہ تھا اور اس پر ایک سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ اس وقت تو اس نے کسی سے بات نہیں کی اور نہ ہی کسی کے سوالوں کا جواب دیا۔ بلکہ اپنے کمرے میں سیدھا جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کی ماں خیراں اور دونوں ماموں ایک

دوسرے کا الجھن آمیز حیرت سے منہ تکنے لگے...... علی بخش اس وقت ہوٹل گیا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں محرم علی سویا نہیں لیٹا ہوا تھا...... یہی وجہ تھی کہ جب گھنٹے بھر بعد اس کی ماں خیراں گرم گرم دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر آئی تو فوراً اٹھ کھڑا ہوا...... ماں اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گئی......اور محبت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات چہرے پر لیے اسے دودھ پیتا خاموشی سے تکنے لگی۔ محرم علی نے خاموشی کے ساتھ دودھ کا گلاس ختم کیا تو اسی وقت اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی کمرے میں داخل ہوئے۔

''پٹ...... تیرے ساتھ کیا ہوا ہے...... کچھ تو بول...... بتا ہمیں...... تو کہاں چلا گیا تھا...... یوں بغیر بتائے......'' اندر داخل ہوتے ہی محرم علی کے بڑے ماموں دوست محمد نے قدرے تفکیر آمیز لہجے میں محرم علی سے استفسار کیا۔

ماموں کی بات پر محرم علی کے چہرے پر ایسا ارتعاش سا ابھرا جیسے وہ خود بھی سب کچھ بتانے کے لیے پُر جوش ہو۔

''مجھے...... دھاڑیل (ڈاکو) اٹھا کر لے گئے تھے......'' بالآخر اس نے گم صم اور کھوئے کھوئے لہجے میں بتانا شروع کیا تو اس کی ماں خیراں نے ''ہائے گھوڑا......'' کہتے ہوئے اپنا سینہ پیٹ ڈالا اور اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی بھی بری طرح چونک پڑے اور حیرت اور تشویش ناک نگاہوں سے محرم علی کی طرف دیکھتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں بولے۔

''یہ تُو کیا کہہ رہا ہے پٹ محرم......! وہ دھاڑیل کون تھے جو تجھے اٹھا لے گئے تھے......''

''وہ علی بخش کے ساتھی تھے ماموں......!'' محرم نے بتایا۔

''کیا واقعی......؟'' دوست محمد اور محمد علی کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''ہاں...... ماموں...... وہ دھاڑیل مجھے اغوا کرنے کے بعد...... میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے ٹھکانے پر لے گئے تھے اور وہاں انہوں نے نے کھلم کھلا اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ...... انہوں نے مجھے علی بخش کی وجہ سے اغوا کیا ہے جو ان کے سردار کا چہیتا ہے...... لہٰذا علی بخش پر آئندہ جائیداد یا کسی اور معاملے میں دباؤ نہ ڈالیں اور نہ ہی اسے ''اکیلا'' یا کمزور جان کر اس کے ساتھ کسی قسم کا جھگڑا یا مار کٹائی کریں...... ورنہ اس کے نتائج برے بھی نکل سکتے ہیں...... پھر ان لوگوں نے مجھے ایک دن اپنے ہاں قید میں رکھ کر اگلے دن آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھوڑ دیا......'' اتنا کہہ

کر محرم علی چپ ہو گیا۔

خیراں...... بیٹے کی بات پر دہل سی گئی...... جبکہ دوست محمد اور محمد علی کے چہرے بھانجے کی بات پر غصے سے سرخ ہو گئے۔ ''ہوں...... تو اب یہ ذلیل ہمیں دھاڑیلوں سے خوف زدہ کرنا چاہتا ہے......'' دوست محمد دانت پیس کر غراہٹ آمیز انداز میں بڑبڑایا...... اس کا اشارہ علی بخش ہی کی طرف تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ علی بخش اور اس کے دھاڑیل ساتھیوں کو مزہ چکھا دینا چاہئے......'' محمد علی نے بھی کسی غیر مرئی نقطے پر اپنی غصہ ورنگاہیں جماتے ہوئے کہا۔

''نا ادا سائیں! یہ کیا کہہ رہے ہو تم لوگ......'' خیراں خوف زدہ لہجے میں اپنے دونوں بھائیوں سے بولی......''ان مردود دھاڑیلوں سے بھلا ہم کہاں لڑ سکتے ہیں...... میں کہتی ہوں کہ اب اس موئے علی بخش سے بھی دور رہا جائے......اور اسے مزید چھیڑنے کی کوشش نہ کی جائے......''

''یہ تُو کیسی باتیں کر رہی ہے ادی......!'' دوست محمد اپنی بہن خیراں کی بات پر تعجب سے بولا......''اس طرح اگر ہم ڈر گئے تو پھر ہم سب کا ہی اللہ حافظ ہے...... پٹ محرم کو اغوا کر کے وہ ہم پر یہی تو رعب جمانا چاہتے ہیں کہ ہم اس کے چہیتے علی بخش سے دور رہیں......تاکہ وہ ہمارے اس خوف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دن تمہیں اور پٹ محرم علی کو نکال باہر کریں...... ہوں...... ایسی کی تیسی ان دھاڑیلوں کی...... میں نمٹ لوں گا ان سے......'' دوست محمد غصے سے بھر گیا تھا۔

''ادی خیراں! بھا دوست صحیح کہتا ہے۔ اگر ہم یوں ڈر گئے تو علی بخش ہم پر چڑھ دوڑے گا اسے سبق سکھانا لازمی ہے......'' محمد علی نے کہا تو محرم علی کو بھی جوش آ گیا...... لہٰذا بولا۔

''میں تو پہلے ہی تم سب سے کہتا تھا کہ یہ علی بخش ہمارے لئے ایک زخمی سانپ کی مثال بن چکا ہے...... یہ ہم لوگوں کے خلاف پہلے ہی محاذ بنانے میں مصروف تھا......'' وہ چند ثانیے کے لیے تھما...... پھر پُر زور لہجے میں دوبارہ بولا...... ''تم لوگ بھول گئے میری وہ بات جب میں نے تم لوگوں سے کہا تھا کہ اس علی بخش کی اپنے ہوٹل میں ہی خفیہ طور پر کسی دھاڑیل سے واسطے داری قائم ہو چکی ہے اور اس کے ذریعے اس نے ہم پر اپنا رعب قائم کرنے کی خاطر مجھے اغوا...... اور پھر آزاد کروایا......'' محرم علی نے اپنی بات ختم کی تو اس کا

سانس جوش و غصے کے مارے پھول سا گیا تھا۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے......'' دوست محمد اپنے بھانجے کی بات سن کر فیصلہ کن لہجے میں بولا......''پولیس کا چھاپہ کسی دن لگوا کر علی بخش کو اس کے دھاڑیل ساتھی سمیت گرفتار کروا دو......''میں نے پہلے بھی یہی تجویز دی تھی مگر......''

''ٹھیک ہے ماموں......تم درست کہہ رہے ہو......اس بار میں موقع کی تاک میں رہوں گا......جیسے ہی ہوٹل میں ان دونوں کی ملاقات متوقع ہوئی......ہم پولیس کو اطلاع کر دیں گے۔'' محرم علی اپنے ماموں کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولا تو اس کی ماں خیراں......جو کافی دیر سے خاموش تھی بولی۔

''اس طرح تو اس کے ساتھ تم لوگ بھی اندر ہو جاؤ گے......آخر ہوٹل کے تم بھی مالک ہو......''

''ایسا نہیں ہو گا ادی!'' دوست محمد فوراً اپنی بہن کو تسلی دیتے ہوئے بولا......''تھانے کا انچارج انسپکٹر ارشد ایک راشی پولیس افسر ہے......میں اس کی مٹھی گرم کر کے سب سمجھا بجھا دوں گا اور پہلے ہی سے اسے قائل کر لوں گا کہ علی بخش کی کسی بدنام دھاڑیل کے خطرناک گروہ سے واسطے داری ہے......اور اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں......'' اپنی بات ختم کر کے وہ پھر محرم علی سے مخاطب ہوا......''پٹ محرم! تو نے ایک دن بتایا تھا کہ تمہارے ہوٹل میں ایک دن رات گئے وزن پاڑیں (جوا، شراب) کی محفل جمتی ہے اور اسی رات کو کچھ نامی گرامی دھاڑیل بھی آتے ہیں......موج میلہ کرنے......میرا خیال یہ ہے علی بخش بھی اسی دن ہی اپنے کسی دھاڑیل ساتھ سے خفیہ طور پر ملتا ہو گا......اور یہی موقع بہتر رہے گا پولیس کے چھاپے کے لئے......''

اس کی بات سن کر محرم علی اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا......''ہاں ماما سائیں! وہ جمعرات کی رات ہے......میں تاک میں رہوں گا......کیونکہ اس دن علی بخش بھی رات گئے ہوٹل میں موجود رہتا ہے......ویسے میں نے اس کی نگرانی کے لیے اپنا ایک قابلِ اعتماد گرگا خیرو......رکھا ہوا ہے......جو مجھے علی بخش سے متعلق ایک ایک خبر لا کر دیتا ہے۔''

''شاباش......میڈا پٹ!......بس تھوڑا سا سمجھداری اور بہادری سے کام لینا ہو گا......تم دیکھنا پھر یہ موذی خود ہی ہمارے راستے سے ہٹ جائے گا......'' دوست محمد محرم علی کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے تہنیتی لہجے میں بولا......پھر وہ سب لوگ آئندہ کی منصوبہ بندی کے بارے میں غور کرنے لگے۔

☆======☆======☆

علی بخش کو ہوٹل میں کسی نے یہ اطلاع کر دی تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی محرم علی گھر آ گیا ہے......علی بخش کو اس خبر پر پہلے تو یقین نہیں آیا۔ مگر رات گئے جب وہ گھر لوٹا تو اپنی سوتیلی ماں خیراں اور اس کے دونوں بھائیوں کے طمانیت بھرے چہروں کو دیکھ کر خود علی بخش کا چہرہ اتر گیا تھا......وہ اوپری دل کے ساتھ محرم علی سے ملا......اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ سب عجیب نگاہوں سے اسے تک رہے تھے اور کچھ کھنچے کھنچے سے بھی نظر آ رہے تھے......اس نے محرم علی اور اس کے دونوں ماموؤں کی آنکھوں میں اپنے لئے معاندانہ چمک بھی محسوس کی تھی۔ تاہم وہ کھری چارپائی پر لیٹ گیا اور کچھ سوچنے لگا......اس کے وجود میں شدید قسم کی کشمکش جاری تھی......اگرچہ علی بخش نے محرم علی سے رسماً اس کی گمشدگی کے بارے میں پوچھا......لیکن اسے یہی بتایا گیا تھا کہ محرم اچانک کسی ضروری کام سے شہر چلا گیا تھا......علی بخش یہی سوچنے میں محو تھا کہ بات وہ نہیں جو محرم علی بتا رہا تھا بلکہ بات کچھ اور ہی تھی جو اس سے دانستہ طور پر اخفا رکھی جا رہی تھی۔ بہر طور......علی بخش کو کھد بد لگ چکی تھی کہ جلد سے جلد اپنے ساتھی اکو دھاڑیل سے ملے اور اس ضمن میں اس سے کچھ ''استفسار'' کرے کہ آخر یہ سب کیا تھا؟......کیا......محرم علی کی اچانک اور پُراسرار گمشدگی میں اس کا ہاتھ تھا......؟ اب علی بخش کو اس رات کا انتظار تھا جب اکو دھاڑیل نے اس کے ہوٹل کی ہفتہ وار یعنی جمعرات کی رات کو منعقد ہونے والی خصوصی محفل میں شرکت کرنی تھی......مگر علی بخش اس حقیقت سے یکسر غافل تھا کہ اکو دھاڑیل کے خلاف اندر ہی اندر کیا کھچڑی پکائی جا رہی تھی۔ ایک جال تھا جو نہایت خفیہ طور پر ان دونوں کے گرد بنا جا رہا تھا......اور اکو دھاڑیل اور علی بخش......اور دونوں اس سے لاعلم تھے۔

☆======☆======☆

ساون جب دوا لے کر اللہ رکھی کے پاس لوٹا تو اسے خاصا بدحواس پایا......ساون نے اس وقت تو کچھ نہ پوچھا البتہ جب وہ مذکورہ وارڈ میں چاچی عنایتاں کو دوا دے کر اللہ رکھی کے پاس آیا تو اس نے بغور اس کا چہرہ تکتے ہوئے پوچھا......''اللہ رکھی! خیر تو ہے۔ تو کچھ پریشان نظر آ رہی ہے......''

''ساون......وہ......وہ......میں نے ابھی خانو دھچر کو یہاں دیکھا تھا......'' اللہ رکھی نے قدرے متوحش لہجے میں اسے بتایا۔

''خانو دھچر......!'' ساون اس کی بات پر استفہامیہ لہجے میں بڑبڑایا......تب

اللہ رکھی نے ساون کو خانو دھچر کے متعلق تفصیلاً بتا دیا کہ وہ کون تھا...... پھر ساون کو بھی کچھ کچھ یاد آنے لگا...... اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا...... تاہم وہ اللہ رکھی کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''اللہ رکھی! تُو گڑتی نہ کر...... وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... بس حوصلہ رکھ...... یہ خانو دھچر جیسے زرخرید کتے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے......'' لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے کسی خیال کے تحت دوبارہ پوچھا۔ ''کیا اس نے تجھے دیکھا تھا...... میرا مطلب ہے...... تجھے پہچانا تھا وہ......؟''

چند ثانیے اللہ رکھی کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھرے پھر غیر یقینی سے لہجے میں بولی...... ''پتہ نہیں...... ویسے اس نے میری جانب ایک لمحے کو دیکھا تو تھا مگر پھر کہیں آگے بڑھ گیا...... یا شاید مجھے پہچانا نہیں تھا پھر......''

''ہاں...... شاید یہی بات ہو...... ورنہ تیرے پاس ضرور آتا......'' ساون نے کہا...... ویسے یہ بات ساون نے اللہ رکھی کا محض دل رکھنے کے لئے کہی تھی...... ورنہ اسے شبہ تھا کہ خانو دھچر نے اللہ رکھی کو اچھی طرح سے پہچان لیا ہوگا...... اور کوئی بعید نہیں کہ وہ اسے یہاں تلاش کرنے آیا ہو...... جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا...... ہسپتال کے احاطے میں مریضوں کا رش ٹوٹتا جا رہا تھا...... پھر ٹھیک دو بجے احاطے میں فروکش لوگوں کو اپنے اپنے مریضوں کے پاس جانے کی اجازت دی گئی...... ساون اور اللہ رکھی بھی جلدی جلدی اپنا ساز و سامان سمیٹ کر مطلوبہ وارڈ میں بیڈ نمبر بارہ کے قریب آ گئے جہاں چاچی عنایتاں صاحب فراش تھی...... اس کی طبیعت میں بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ دن بہ دن وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی...... ساون اور اللہ رکھی متفکر اور غم زدہ سے اس کو دم دلاسہ دے رہے تھے...... وارڈ میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی...... چہار سو ایک بوجھل سی بیمار فضاء طاری تھی...... پھر تنک چڑھی نرسوں کے زور زور سے بولنے کی ناگوار سی آوازیں بھی گونج رہی تھیں...... بہر طور شام تک وہ وہیں بیٹھے چاچی عنایتاں کا دل بہلاتے رہے۔ اس کے بعد رات ہوتے ہی انہوں نے کوریڈور میں رات گزارنے کے لئے رلی اور دیگر مختصر سا سامان بچھا لیا...... اللہ رکھی اندر وارڈ میں ہی چاچی عنایتاں کے قریب ہی لمبی سی آہنی بینچ پر رلی اور رضائی سنبھال کر بیٹھ گئی تھی وہ وہیں سویا کرتی تھی...... رات کا کھانا چاچی عنایتاں کو ہسپتال کی طرف سے ملتا تھا...... جبکہ ساون اپنے اور اللہ رکھی کے لیے قریبی ہوٹل سے لے آتا تھا۔

اگلے دن صبح پھر وہی بیزار کن انداز میں سورج طلوع ہوا اور لگے بندھے معمول کے

مطابق ساون اور اللہ رکھی اپنا اپنا بوریا بستر سمیٹ کر باہر احاطے میں دھوپ میں آ کر فروکش ہو گئے۔

اسی دوران ساون کو پھر چاچی عنایتاں کے لیے ایک انجکشن خریدنے باہر جانا پڑا اور اللہ رکھی وہیں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی...... بالآخر کافی دیر تک جب ساون نہیں لوٹا تو اللہ رکھی کا دل تنہا بیٹھے بیٹھے گھبرانے لگا...... وہ پریشان سی ہو گئی...... پہلے پہل تو اس نے اپنے دل کو یہی تسلی دے کر بہلانا چاہا کہ ہو سکتا ہے...... ساون کو مطلوبہ انجکشن نہ ملا ہو اور وہ اسے ڈھونڈنے اور آگے نکل گیا ہو...... بہر طور وہ بے چاری ہراساں سی تصویر انتظار بنی بیٹھی رہی...... معاً اس کی نظر ہسپتال کے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے ایک مجہول سے شخص پر پڑی اس نے گول گول عدسوں والی عینک چڑھائی ہوئی تھی اور اس کے ہمراہ دو تین اور بھی افراد تھے...... ان میں ایک کالے بھجنگ شخص کو دیکھ کر اللہ رکھی کے چہرے پر خوف سمٹ آیا وہ خانو دھچر تھا...... اور اس کے ہمراہ وہ مجہول سا شخص منشی میرل تھا وہ اس کی طرف چلے آ رہے تھے۔ اللہ رکھی ان کو بڑے جارحانہ طور پر اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر خوف زدہ سی ہو گئی۔

☆======☆======☆

ٹھٹھرتی ہوئی رات دبے پاؤں سرک رہی تھی...... دودا خان کے ہوٹل میں حسب روایت ہفتہ وار جوا اور شراب کی محفل جمی ہوئی تھی یہ جمعرات کی رات تھی جس کا علی بخش کو خاص انتظار رہتا تھا کیونکہ اسی رات وہ بدنام ڈاکو اکو دھاڑیل سے خفیہ ملاقات کرتا تھا...... لہٰذا وہ آج گھر جانے کی بجائے ادھر ہی رہ گیا تھا...... ادھر محرم علی بھی تاک میں تھا...... اس نے فوراً اپنی خفیہ کارروائی شروع کر دی جس میں اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی بھی پیش پیش تھے۔

سرد رات کچھ اور اپنے انجام کی طرف بڑھی...... ایسے میں ایک تنگ سی کچی کوٹھڑی میں علی بخش اور اکو دھاڑیل بیٹھے باتوں میں مشغول تھے...... اور ساتھ والی کوٹھڑی جو نسبتاً کافی کشادہ تھی...... وہاں بے ہنگم قہقہوں کی آوازیں گونج رہی تھی...... اکو دھاڑیل دھیمے لہجے میں علی بخش کو اس واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا کہ اس کے سوتیلے بھائی محرم علی کو سبق سکھانے کے لئے...... اس نے اسے اغوا کرنے کے بعد دھمکاتے ہوئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ آئندہ اپنے بڑے بھائی علی بخش پر جائیداد وغیرہ کے سلسلے میں کسی قسم کا دباؤ ڈالے اور نہ ہی کوئی جھگڑا فساد کرے۔

علی بخش خوش تھا...... وہ ساری بات سننے کے بعد ممنون لہجے میں اکو دھاڑیل سے بولا...... ''چاچا سائیں تیری بڑی مہربانی تو نے مجھے اکیلے کا ساتھ دیا...... ورنہ......''

مگر اسی لمحے اکو دھاڑیل نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور نرم لہجے میں بولا......

''اس میں مہربانی کی کوئی بات نہیں...... میں نے آپڑیں یار دودے خان کا وعدہ نبھایا ہے جو میرا فرض ہے......''

پھر اس سے پہلے کہ علی بخش مزید کچھ کہتا...... باہر ایک دم بھگدڑ مچ گئی اور ٹھیک اسی وقت کوٹھڑی کا دروازہ ''دھڑ'' سے ٹوٹ کر گرا اور پولیس کے چند مسلح اہلکار اندر گھس آئے۔ اکو دھاڑیل اور ساون کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا...... پولیس نے ان پر اپنی رائفلیں تان لیں۔

پولیس کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اکو دھاڑیل اور علی بخش ایک ثانیے کے لیے اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ چونکنے کی کیفیت ان کے چہروں پر چسپاں سی ہو کر رہ گئی تھی۔

''خبردار......! جو تم دونوں میں سے کسی نے حرکت کی تو......'' ان مسلح سپاہیوں میں سے ایک مضبوط تن و توش کے مالک نے گرجدار آواز میں اپنا سروس ریوالور ان پر تانتے ہوئے کہا۔

علی بخش اس پولیس والے کو پہچان چکا تھا یہ متعلقہ تھانے کا انچارج انسپکٹر ارشد لاشاری تھا۔ علی بخش کی آنکھوں میں اب خوف جھلکنے لگا تھا۔ جبکہ اکو دھاڑیل کے چہرے پر غصہ اور جوش سا اُمڈ آیا تھا...... ایک ایسا طیش آمیز جوش جس میں چیلنج تھا وہ خونخوار نگاہوں سے انسپکٹر ارشد لاشاری کو گھور رہا تھا...... مگر انسپکٹر ارشد لاشاری کے چہرے پر کسی دباؤ میں آنے والے ردعمل کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس کی عقابی نگاہوں میں ایسی چمک لہریں مار رہی تھی جیسے اس نے بڑے عرصے بعد اپنے کسی دیرینہ غنیم کو چھاپ لیا ہو...... وہ دوبارہ کامیابی سے بھرپور لہجے میں اکو دھاڑیل کو مخاطب کر کے بولا۔

''اکو دھاڑیل، تیری تو ہمیں عرصے سے تلاش تھی...... اور سچ پوچھو تو میں اس علاقے میں آیا ہی تجھے گرفتار کرنے کے لیے تھا...... بڑی بھاری رقم لگی ہے تیرے سر کی......''

تب اکو دھاڑیل بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقارت سے بولا۔ ''پتہ نہیں کتنے تیرے جیسے کالی وردیوں والے میرے سر کی رقم لینے کی آس میں دفن ہو گئے...... کیا تو بھی......''

''بکواس بند کر اپنی......'' انسپکٹر ارشد اس کی بات کاٹ کر غصے سے دھاڑا...... ''بڑا گھمنڈ ہے تجھے خود پر...... کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا کیونکہ تیری گرفتاری مردہ بھی قابل قبول ہو گی سرکار کو......'' انسپکٹر کے معنی خیز لہجے نے اکو دھاڑیل کو جیسے بھڑکا کر رکھ دیا۔ وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا مگر اسی وقت انسپکٹر ارشد کے ساتھ رائفلیں تانے پولیس اہلکاروں نے برق برعت کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے اپنی رائفلوں کی نالیں اکو دھاڑیل کی کشادہ پیشانی پر ٹکا دیں...... تب فوراً اکو دھاڑیل اور علی بخش کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں...... کوٹھڑی کی کچی دیوار سے ٹکی ہوئی اکو دھاڑیل کی سیون ایم ایم بھی پولیس نے قبضے میں لے لی تھی۔

☆======☆======☆

منشی میرل اور خانو دھچر وغیرہ کو اپنی جانب چوکنے انداز میں بڑھتا دیکھ کر اللہ رکھی یک دم اپنی جگہ سے خوف زدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''سائیں منشی! یہی ہے وہ چھوکری جسے ساون گوٹھ سے بھگا کر لایا ہے......'' قریب پہنچتے ہی خانو دھچر اللہ رکھی کو گھورتے ہوئے منشی میرل سے مخاطب ہوا تھا۔

''اڑے تو چپ کر میں خود بات کرتا ہوں......'' منشی میرل نے خانو کی بات پر اسے مکاری سے ڈپٹ کر کہا...... پھر اللہ رکھی کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے حلیم طبعی سے بولا......

''دھی......! میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں...... تو ڈر نہ...... میں تیرے گوٹھ کے سائیں وڈیرے لکھ میر کا آدمی ہوں...... تیری چاچی کی طبیعت ہن کیسی ہے......؟'' منشی میرل کے مشفقانہ لہجے نے خوف زدہ اللہ رکھی کو جیسے یک دم ہلکا پھلکا کر دیا...... اور وہ ایک نظر تلخ خانو دھچر پر ڈالتے ہوئے منشی میرل سے بڑے رسان کے ساتھ بولی۔

''چاچا...... تیری مہربانی...... تو نے ہمیں غلط نہیں سمجھا...... وہ بہت سخت بیمار تھی اسے یہاں لانا پڑا تھا...... فوراً...... ویسے علاج چل رہا ہے اس کا......''

''چنگا چنگا...... میڈی دھی...... یہ بتا...... ساون بھی تیرے ساتھ ہے؟'' منشی نے عیاری سے پوچھا...... اس کے دو میٹھے بولوں نے معصوم اور سادہ لوح اللہ رکھی کو بلا تامل تعاون پر مجبور کر ڈالا تھا۔ تاہم وہ ساون کے نام پر پہلے ذرا جھجکی پھر اپنی نگاہیں جھکا کر دھیرے سے بولی۔

''ہاں...... وہ بھی آیا ہے...... لیکن......'' اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

منشی فوراً اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا...... ''ہاں...... ہاں بول...... کوئی تکلیف

پریشانی تو نہیں ہوئی تجھے۔''

''نہیں...... نہیں چاچا...... ایسی کوئی بات نہیں...... وہ ساون بہت اچھا ہے...... چاچی کی دوائیاں لینے گیا ہوا ہے...... پر...... ابھی تک آیا نہیں......'' اللہ رکھی کے لہجے میں تفکر سا سمٹ آیا۔

''اچھا ٹھیک ہے کوئی بات نہیں...... تُو ایسا کر ہمارے نال چل...... سائیں وڈے...... نے ہمیں سختی سے ہدایات دی ہیں کہ تم لوگوں کو شہر دھکے کھانے کی بجائے اچھی جگہ رہائش کے لیے دی جائے...... وڈیرا سائیں بڑا اچھا آدمی ہے...... میڈی دھی......''

منشی میرل اللہ رکھی کے سر پر دوبارہ ہاتھ دھرتے ہوئے اور اس کے چہرے پر تردد کے آثار دیکھ کر پھر گویا ہوا...... ''وڈیرا سائیں اپنے ''رہاکوں'' (مزارعوں) کا بڑا خیال رکھتا ہے...... بلکہ وہ تو غصے بھی ہو رہا تھا کہ تم دونوں کو کم از کم مجھے بتانا چاہئے تھا...... اچھا چھوڑ ان باتوں کو چل تُو ہمارے نال...... یہ بھی کوئی جگہ ہے رہنے کی......'' پھر وہ اپنے دیگر ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا...... ''اوئے چلو بابا...... یہ سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو......''

''ٹھٹھ...... ٹھہرو چاچا...... ساون کو تو آ لینے دو......'' اللہ رکھی پریشان ہوتے ہوئے بولی...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اللہ رکھی کی بات پر پہلی بار منشی میرل کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی...... اس کے انداز سے اب عجلت بھی عیاں ہونے لگی تھی...... جیسے اللہ رکھی کو ساون کے آنے سے پہلے ہی یہاں سے لے جانا چاہتا ہو۔

''دیکھ میڈی دھی ضد نہ کر...... یہ اچھی بات نہیں ہے...... تُو بے فکر رہ...... ہمارے آدمی یہاں موجود رہیں گے...... اور ساون آئے گا تو اسے بھی وہیں لے آئیں گے...... بلکہ تمہاری چاچی کو بھی کسی اچھے سے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیں گے...... سائیں وڈے نے یہی ہمیں کہہ کر بھیجا تھا...... ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا۔''

اللہ رکھی اب شدید قسم کے تذبذب میں مبتلا ہو گئی تھی...... وہ ''ہاں'' اور ''ناں'' کے درمیان اٹک گئی تھی...... اور باری باری سب کے چہرے تک رہی تھی۔ اسے متذبذب دیکھ کر چالاک منشی نے ایک اور پینترا بدلا، پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے دھی...... تیری مرضی پھر ہم تو تیرے گوٹھ کے ہی لوگ ہیں...... سودھل تو میرا اچھا یار بھی رہ چکا ہے...... اور رب سائیں اسے جنت دے...... ہم پھر وڈے سائیں کو بتا دیں گے کہ تُو نے ہم پر بھروسہ نہ کیا...... کیونکہ وڈا سائیں...... اپنے گوٹھ کی تمام عورتوں کی عزت کو اپنی لج سمجھتا ہے...... وہ ناراض ہو جائے گا۔ چلو بھئی چلتے ہیں واپس...... گوٹھ......'' آخر میں وہ چالاکی سے اپنے

گماشتوں کو مخاطب کر کے بولا۔

اور ابھی وہ واپس جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ اللہ رکھی نے اسے روکا۔ ''ٹھہر جا چاچا...... میں چلتی ہوں تیرے نال...... پر ساون......''

''اڑے بابا...... تُو اس کی گڑتی نہ کر...... میں نے کہا نا میرے آدمی یہاں موجود رہیں گے اور جیسے ہی ساون یہاں آیا...... وہ اسے لے کر وہاں پہنچ جائیں گے۔''

''چاچا......! کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ ہم ادھر پہلے ساون کا انتظار کر لیتے۔'' اللہ رکھی نے آخر میں کچھ سوچتے ہوئے کہا تو میرل بولا۔

''پتہ نہیں اب وہ کتنی دیر بعد آئے...... ہم نے واپس گوٹھ بھی جانا ہے...... تجھے وڈیرے سائیں کے شہر والے گھر چھوڑ کر ہم فوراً لوٹ جائیں گے گوٹھ اور وڈے سائیں کو اطلاع دیں گے تاکہ اس کی تسلی ہو جائے...... یہاں گھر میں وڈے سائیں کے بال بچے بھی آئے ہوئے ہیں......''

''اچھا پھر ٹھیک ہے...... میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ......'' سادہ لوح اللہ رکھی نے بالآخر ہار مانتے ہوئے معصومیت سے کہا...... اور منشی سمیت خانو دھچر کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک عود کر آئی تھی۔

☆======☆======☆

منشی میرل وغیرہ کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتے وقت اللہ رکھی کا دل یکبارگی کسی انجانے خدشے سے دھڑکا تھا۔ اس نے ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکلتے اور جیپ میں سوار ہونے سے پہلے ادھر اُدھر متلاشی نگاہوں کے ساتھ دیکھا کہ شاید ساون کہیں نظر آ جائے مگر اس کی یہ آخری امید بھری خواہش پوری نہیں ہوئی اور جب وہ جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی...... تو اپنے بے چین دل کو یہ سوچ کر تسلی دینے کی سعی کرنے لگی کہ منشی نے اپنے جن دو آدمیوں کو وہاں چھوڑا تھا...... وہ ضرور ساون کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں گے...... اللہ رکھی جاتے وقت چاچی عنایتاں کو بھی ایک نظر دیکھ لینا چاہتی تھی مگر اس وقت چونکہ متعلقہ وارڈ میں بڑے ڈاکٹروں کے راؤنڈ کا وقت تھا اس لئے اندر جانے کی ممانعت تھی۔

اللہ رکھی جیپ کی آرام دہ اور نرم سیٹ پر بیٹھ کر عجیب سا گداز محسوس کر رہی تھی...... وہ بے چاری تو بیل گاڑی کے سخت پھٹے پر بیٹھا کرتی تھی...... نرم سیٹ کیا، وہ بے چاری موٹر کار میں ہی پہلی بار بیٹھی تھی۔ بہرطور...... انجانے اندیشوں اور طفل تسلیوں کے درمیان جیپ ایک نسبتاً متمول علاقے میں داخل ہو گئی۔ جہاں خوبصورت بنگلوں کی کافی تعداد

تھی...... لیکن بنگلے قطار در قطار نہیں بنے ہوئے تھے...... سادہ لوح اور معصوم سی اللہ رکھی جیپ کی شیشے والی بند کھڑکی سے پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرت و استعجاب لئے ان بنگلوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ اتنا تو اسے معلوم تھا کہ گوٹھ کے بڑے بڑے زمینداروں اور وڈیروں کے شہر میں بھی بڑے عالی شان گھر ہوتے ہیں مگر آج وہ خود اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی...... بنگلے دو رویہ بھی نہیں...... سامنے کی طرف اندرونی ذیلی سڑک تھی اور اس کے بعد چٹیل میدان دور تک چلا گیا تھا جہاں جا بجا جھاڑیاں اور خودرو پودے اگ آئے تھے...... یہ علاقہ لاڑکانہ شہر کے قدرے مضافات میں تھا۔ منشی خود جیپ چلا رہا تھا اور خانو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا...... باقی دو افراد جیپ کی پچھلی طرف اللہ رکھی کے سامنے والی سیٹ پر براجمان تھے...... جیپ میں خانو دھچر کی موجودگی اللہ رکھی کو انتہائی ناگوار محسوس ہو رہی تھی تاہم وہ یہی سمجھتے ہوئے سب برداشت کر رہی تھی کہ اس منحوس خانو کا ساتھ عارضی ہے بعد میں یہ دفع ہو جائے گا۔

معاً جیپ ایک جھٹکے سے رکی...... وہ سب باہر آ گئے...... اللہ رکھی بھی جھجکتی ہوئی اتر آئی...... اب وہ سب ایک قدرے پرانی وضع قطع کے بنگلے کے سامنے کھڑے تھے...... اللہ رکھی کے دل کو ایک بار جانے کیوں دھڑکا سا لگا...... بنگلے پر عجیب ویرانی سی چھائی ہوئی تھی...... پھر وہ سب اندر ایک بڑے سے کمرے میں آ گئے...... اللہ رکھی کو کہیں کہیں گرد کی تہیں بھی دکھائی دیں...... یہ نشست گاہ قدیم و جدید ساز و سامان سے آراستہ تھی۔

''چاچا...... وڈے سائیں کے بال بچے نظر نہیں آ رہے......؟'' اللہ رکھی نے دبے دبے خوف سے پوچھا تو منشی بولا۔

''ہاں ہاں ابھی آ جاتے ہیں سب تم بیٹھو تو سہی...... بیٹھو دھی۔''

اللہ رکھی ڈری سہمی فرش پر بچھے دبیز قالین پر بیٹھنے لگی تو منشی بڑے تپاک سے بولا۔

''اڑی نہیں دھی! اوپر بیٹھ صوفے پر تیری جگہ ہے...... یہاں تو نیچے بیٹھنے تو نہیں آئی۔''

ایکا ایکی منشی میرل کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا...... پھر منشی نے خانو سمیت دوسرے لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا خفیف سا اشارہ کیا...... ادھر اللہ رکھی...... بھی جب تک جھجکتے ہوئے ایک صوفے کے قدرے کنارے جیسے ''ٹک'' سی گئی...... ہزاروں بھیدوں بھرے خدشات زہریلے ناگوں کی طرح اسے اب کچھ زیادہ ہی ڈسنے لگے تھے...... ڈری سہمی ساعتوں میں جیسے کوئی چکر چلا کر اسے کہہ رہا تھا...... ''بھاگ جاؤ...... اللہ رکھی بھاگ جاؤ......'' پھر وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ اسے یہاں ساون کی مرضی کے بغیر نہیں آنا چاہئے تھا۔

''کیا سوچ رہی ہے دھی اللہ رکھی......؟'' منشی میرل بغور اپنی گول گول عدسوں والی عینک سے اللہ رکھی کو گم صم بیٹھے دیکھ کر گھورتے ہوئے بولا۔

اللہ رکھی ایک دم چونکی تھی۔ ''کک...... کچھ نہیں چچ...... چاچا...... بس وہ ساون......'' وہ کہتے کہتے رک گئی مگر کائیاں منشی اس کی بات سمجھتے ہوئے ازراہِ تشفی بولا۔

''اس کی تو گڑتی (فکر) نہ کر...... میں نے آدمی تو چھوڑے ہوئے ہیں نا...... تیرے سامان سمیت...... وہ ساون کو بھی ادھر ہی لے آئیں گے...... تو آرام سے پیچھے ہو کر بیٹھ جا شاباش......'' میرل نے اسے مربیانہ انداز میں پچکارا۔

ایک ادھیڑ عمر اور تیز رنگت ملازمہ اندر داخل ہوئی...... اس نے اپنے ہاتھوں میں بڑی سی رکابی تھام رکھی تھی جو اس نے صوفے کے درمیان دھری شیشے کی ٹاپ والی میز کے اوپر رکھ دی...... اس میں چائے وغیرہ اور دیگر لوازمات کے مختصر سے برتن سجے ہوئے تھے۔ کسی عورت کو وہاں موجود پا کر اللہ رکھی کو عجیب سی طمانیت محسوس ہوئی...... وہ ملازمہ عجیب نظروں سے ایک ثانیے اللہ رکھی کو دیکھ کر اپنا سپاٹ چہرہ لئے وہاں سے چلی گئی...... جانے کیوں اللہ رکھی کو اس کی آنکھوں میں عجیب سا پیغام محسوس ہوا تھا...... منشی میرل ادھر غور سے اللہ رکھی کی ذہنی اتھل پتھل کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولا۔

''دھیئے......! یہ کمینی ملازمہ کام چور ہے بڑی...... میں ہی تجھے چائے بنا دیتا ہوں......'' وہ آگے بڑھا اور دوبارہ بولا...... ''تجھے یہاں ہر طرح کا آرام ملے گا...... ڈرنے یا خوف کھانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......'' وہ چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے اور ساتھ ہی اللہ رکھی کے متوحش سے چہرے پر اپنی نظریں گاڑے بولتا رہا...... ''تو ادھر آرام سے رہ تجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی......''

چائے وغیرہ پینے کے بعد منشی اٹھ کر چلا گیا اور اب اللہ رکھی تنہا کمرے میں اندیشوں وسوسوں کے بیچ گھری رہ گئی...... کافی دیر تک سکڑے سمٹے بیٹھے رہنے کے بعد جب اس کی بے چینی سوا ہونے لگی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی...... اسی اثناء میں وہی ادھیڑ عمر ملازمہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ غالباً وہ چائے کے برتن سمیٹنے آئی تھی...... اس نے ایک نظر پریشان سی کھڑی اللہ رکھی پر ڈالی اور پھر خاموشی کے ساتھ چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔

''منشی چاچا...... کہاں ہیں......؟'' اللہ رکھی نے بالآخر پوچھا، اس کے لہجے میں واضح طور پر ژولیدگی کا ارتعاش موجود تھا۔

ملازمہ نے ایک سپاٹ سی نگاہ اس پر ڈالی۔ پھر رکے بغیر مختصراً بولی...... ''ابھی

آجاتے ہیں...... تم بیٹھو آرام سے......'' اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

اللہ رکھی ایک بار پھر ہراساں سی کھڑی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور منشی میرل اندر داخل ہوا...... اللہ رکھی اسے دیکھتے ہوئے ہراساں لہجے میں بولی...... ''منشی چاچا...... ساون نہیں آیا ابھی تک؟''

منشی لمحہ بھر چپ رہا...... اسی اثناء میں منشی کے عقب میں دروازے پر خانو دھچر نمودار ہوا...... اس کی آنکھوں میں شکرے جیسی چمک رقصاں تھی۔ اللہ رکھی کا اس بار دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا...... منشی کو جواباً خاموش پا کر وہ دوبارہ بولی...... ''چاچا...... مجھے ہسپتال واپس پہنچا دے...... وہاں ساون آ گیا ہوگا......'' یہ کہتے ہوئے وہ ذرا آگے بڑھی تو منشی جیسے انکشاف کرنے والے انداز میں بولا۔

''اللہ رکھی! تو واقعی سیدھی سادی اور معصوم ہے۔''

اس کی بات پر اللہ رکھی بری طرح چونک کر اسے تکنے لگی...... کائیاں منشی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا...... ''تجھے شاید پتہ نہیں...... مگر یہ سچ ہے کہ ساون تجھے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے کہیں......''

منشی میرل کے اس انکشاف پر اللہ رکھی تڑپ اٹھی...... ''نہیں...... نہیں چاچا...... میرا ساون ایسا نہیں ہے...... تم جھوٹ بولتے ہو......''

اس کے پُرزور لہجے نے منشی کو غصہ چڑھا دیا مگر وہ بہ مشکل ضبط سے کام لیتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا...... ''دھیئے! میں سچ کہہ رہا ہوں...... ہمارے آدمی وہاں اسی کے انتظار میں موجود تھے...... اور ساون تھوڑی دیر بعد وہاں آ بھی گیا تھا...... لیکن جب اسے ہمارے بارے میں پتہ چلا تو وہ وہاں سے فوراً بھاگ اٹھا......''

اللہ رکھی کو منشی کی بات پر رتی بھر بھی یقین نہ آیا...... وہ اس کی اس بات کو یکسر جھٹلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی...... ''نہیں منشی چاچا! یہ جھوٹ ہے...... وہ مجھے چھوڑ کر تنہا کہیں نہیں جا سکتا...... بھلا اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی...... اس نے کسی کا کیا بگاڑا ہے......؟''

''اڑی پگلی...... وہ وڈے سائیں کا مقروض ہے...... پورے دو لاکھ کا جس پر ایک لاکھ روپے کا سود بھی چڑھ چکا ہے...... اس لئے تو وہ گوٹھ سے چھپ چھپاتے تیرے ساتھ شہر بھاگ آیا تھا......'' منشی کا لہجہ اچانک خاصا برہم ہو گیا تھا۔

خانو دھچر اب منشی کے ساتھ اس طرح آن کھڑا ہوا تھا جیسے اسے منشی کے ایک

اشارے کا انتظار ہو۔

اس بار اللہ رکھی کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہو گئے...... تاہم وہ اٹکتے ہوئے لہجے میں بولی...... ''مگر ساون نے تو وہ رقم وڈے سائیں کو لوٹا دی تھی...... اس نے خود مجھے یہ بات بتائی تھی۔''

منشی کی آنکھوں میں مکاری سی تیر گئی اور وہ اللہ رکھی کو ایسے دیکھنے لگا جیسے اسے کسی نے بے وقوف بنا لیا ہو...... وہ اپنے لہجے کو رحم سے لبریز کرتے ہوئے بولا...... ''چچ چچ...... دھی...... تجھ پر مجھے واقعی بڑا ترس آتا ہے...... اڑی...... بے وقوف چھوکری...... اس نے ایک پائی بھی واپس نہیں کی اب تک...... میرے پاس رجسٹر میں اس کے انگوٹھے کا نشان موجود ہے...... وڈیرا سائیں لکھمیر خان تو اسے قرض دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ وہ تو ہاتھ جوڑ کر...... منتیں کر کے اس نے قرضہ لیا تھا وڈے سائیں سے...... کہتا تھا میں نے شادی کرنی ہے...... تیرا نام لے کر فریاد ڈال رہا تھا کہ وہ ایک غریب اور مسکین لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے...... جس کا دنیا میں کوئی نہیں۔ اس پر وڈے سائیں نے یہ سوچ کر اسے قرضہ دے دیا کہ چلو گوٹھ کی کسی گریب ناری کا بھلا ہو جائے...... اس کا گھر بس جائے...... اگر وڈیرے سائیں کو یہ پتہ چلا کہ وہ تجھے چھوڑ کر......''

''نہیں...... نہیں منشی چاچا...... ساون مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں گیا......'' اللہ رکھی درمیان سے اس کی بات کاٹ کر چیخی...... فرط جذبات سے اس کی سرمگیں آنکھیں نمناک سی ہو گئی تھیں۔

منشی کی شاطر نگاہوں نے معصوم اللہ رکھی کے چہرے پر یقین، وغیر یقینی کے آثار بھانپ لئے تھے...... وہ سمجھ رہا تھا کہ ساون کے سلسلے میں اللہ رکھی کو ایک خاص حد تک بدگمان کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے...... جبکہ اللہ رکھی ساون کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ سائیں وڈیرے کو وہ سارے پیسے واپس دے چکا ہے جو اس نے اس کے سنگ کے سلسلے میں لئے تھے...... اسے منشی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا...... تاہم وہ منشی کی اس بات پر بھی غور کر رہی تھی کہ آخر اتنی بڑی رقم کے سلسلے میں وہ جھوٹ بھی تو نہیں بول سکتا...... ادھر منشی اپنی بات کی اثر پذیری اس کے متذبذب چہرے پر بھانپتے ہوئے چالاکی سے دوبارہ بولا۔

''میڈی دھی...... تجھے اور بھی کئی ایسی باتوں کا علم نہیں...... لیکن ان کا جاننا تیرے لئے ضروری ہے...... تو بیٹھ آرام سے، میں تجھے بتاتا ہوں......'' وہ مکاری اور ملائمت

بھرے لہجے میں بولا اور آگے بڑھ کر اللہ رکھی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ایک قریب کے صوفے پر بٹھا دیا۔ پھر خود بھی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

ادھر خانو دھچر بھی اللہ رکھی کو عجیب نظروں سے گھورتا ہوا ایک طرف براجمان ہو گیا...... اللہ رکھی کو ہنوز اس کی موجودگی بری طرح کھل رہی تھی...... اس کے چیچک دار چہرے پر ایک خباثت سی پھیلی ہوئی تھی۔ منشی کے چہرے سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی اہم بات کہنے کے لیے اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہا ہو...... بالآخر وہ اپنی جانب مستفسرانہ نگاہوں سے تکتی اللہ رکھی سے مخاطب ہوا...... ''دیکھ میڈی دھی! تجھے شاید یہ بات معلوم نہ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ تیرا چاچا سوڈھل...... دوسری شادی کرنا چاہتا تھا...... لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی۔''

اس کے اس انکشاف پر اللہ رکھی بری طرح چونکی...... تاہم خاموشی سے ہمہ تن گوش رہی منشی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا...... ''تیرا چاچا سوڈھل دوسری شادی کسی مجبوری کے تحت کر رہا تھا جس سے تُو خود بھی اچھی طرح واقف ہو گی...... اس کی بیوی یعنی تیری چاچی عنایتاں بیمار رہتی تھی...... جبکہ تیرے چاچے سوڈھل کو اپنی خدمت کی ضرورت تھی...... آخر اس کو اس نے تجھے بھی بیاہنا تھا کہیں...... وہ دور اندیش تھا اور اپنی جگہ پر وہ بھی درست تھا...... آخر اس کا بھی حق تھا کہ آخری عمر میں کوئی اس کی دل داری اور خدمت کرے...... لہٰذا اس نے فضلاں سے بیاہ کرنے کا فیصلہ کیا...... جو اس کی بہن ہے......'' منشی نے ایک جانب بیٹھے خانو دھچر کی جانب اشارہ کیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا...... ''اس کا نام خانو ہے...... بالآخر سوڈھل اور خانو کے درمیان یہ طے پایا کہ خانو اپنی بہن فضلاں کا سنگ سوڈھل کو دے گا اور بدلے میں سوڈھل فضلاں کے بھائی یعنی خانو کو تیرا سنگ دے گا۔''

اللہ رکھی یک دم منشی کی اس بات پر دہل گئی...... وہ ہک بک سی منشی کی جانب تکے جا رہی تھی۔ منشی رکا نہیں بولتا رہا۔ ''لیکن...... معاف کرنا دھی...... تیرا چاچا سوڈھل کچھ لالچی انسان بھی تھا...... میری عادت ہے بات میں صاف کرتا ہوں اس لیے کہ وہ سچی ہوتی ہے...... سوڈھل تیرا سنگ بدلے میں خانو کو دینے پر راضی تو تھا...... مگر ساتھ ہی چالیس ہزار بھی مانگ رہا تھا...... جو بالآخر خانو نے اسے دے دیئے تھے''۔ اتنا کہہ کر وہ ذرا رکا...... یہاں اس نے بلا کی دروغ گوئی اور مکاری سے کام لیا تھا۔

اللہ رکھی بے چاری کی حالت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں جیسی ہو رہی تھی۔ اس کے

اندر وحشتوں کے ناگ سے کلبلانے لگے تھے...... اسے یوں لگا جیسے اسے آہستہ نادیدہ اور خاردار زنجیروں سے جکڑا جا رہا ہو۔

''بہر حال ادھر بدقسمتی سے تیرے چاچا سوڈھل کو کسی نے قتل کر دیا...... اور پھر سے یہ بات بھی دفن ہو گئی...... مگر یہ...... خانو کی شرافت تھی کہ سوڈھل کی موت کے بعد اپنے چالیس ہزار کے سلسلے میں چپ رہا...... لیکن آخر کب تک خاموش رہتا...... یہ خود بھی ایک غریب ہاری ہے...... اب پتہ نہیں سوڈھل نے اس کے چالیس ہزار کا کیا کیا...... وہ رب سائیں جانے...... مگر باوجود اس کے اسے اپنی رقم کی پروانہیں...... کیونکہ یہ اب بھی اپنی بات پر قائم ہے اور اپنے روپے واپس لینے کی بجائے...... تجھ سے شادی کرنے پر تیار ہے......'' بالآخر منشی میرل نے اپنی بات ختم کی۔

اللہ رکھی کے نازک وجود میں جیسے برقی رو دوڑ گئی...... وہ زوردار آواز میں ''نہیں'' کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی...... اس کا نرم و نازک حسین چہرہ گہرے دکھ و حزن کی عکاسی کر رہا تھا...... اور منشی میرل کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ کھل رہی تھی۔

☆======☆======☆

''اسے کہتے ہیں کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی''...... دوست محمد چہک کر اپنی بہن خیراں سے بولا۔

''لیکن سانپ تو ابھی زندہ ہے...... مرا تو نہیں وہ......'' خیراں دبی دبی مسرت سے بولی...... اس کا اشارہ علی بخش کی اکو دھاڑیل سمیت گرفتاری کی طرف تھا۔

''ادی! علی بخش ایک بہت بڑے اور بدنام دھاڑیل سمیت گرفتار ہوا ہے...... پولیس اس کو بھی دھاڑیل کا ساتھی ہی سمجھے گی یوں سمجھو ساری عمر کے لیے اندر ہو گیا......'' محمد علی نے بھی لب کشائی کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

علی بخش کی گرفتاری پر وہ چاروں خوش تھے...... انہوں نے اپنی راہ کے کانٹے علی بخش کو بڑی صفائی اور آسانی کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا تھا۔

''اب ہمیں ہوٹل اور گھر فروخت کرنے کے لئے اس مردود کی اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی......'' محرم علی بھی خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔

''میں آج ہی محمد پناہ سے مل کر مکان اور ہوٹل کی بات کرتا ہوں...... وہ دونوں ہی بکوا دے گا...... بلکہ مکان تو کہہ رہا تھا کہ وہ خود خرید لے گا...... اور ہوٹل کسی جاننے والے کے ہاتھ فروخت کروا دے گا......'' منصوبہ ساز دوست محمد پُرمسرت لہجے میں بولا۔

''مجھے جانے کیوں...... علی بخش سے پھر بھی ڈر لگتا ہے...... کل کلاں وہ جیل سے باہر آ گیا تو......'' خیراں انجانے خوف کے تحت بولی...... جانے کیا بات تھی علی بخش سے چھٹکارہ پانے کے باوجود بھی اس کے دل کا چور مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا...... اسے دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ ابھی علی بخش جیل کی سلاخیں توڑ کر نمودار ہوگا اور سب کو ہلاک کر ڈالے گا۔

''امڑ!...... ایک تو تجھے پتہ نہیں کیا خوف کھائے جا رہا ہے اس مردود کا......'' محرم علی اپنی ماں سے بولا...... پھر جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آ گئی اور وہ اپنی ماں سے بڑے لاڈ سے مخاطب ہوا...... ''امڑ! اب تو سورٹھ سے میری شادی کر دے نا......''

''ہاں...... ہاں...... یہاں سے ہم لوگ جائیں گے تو...... تیری دلہن بھی ساتھ ہی لے کر جائیں گے...... تو گڑتی نہ کر...... سارے کام مکمل کر کے جائیں گے یہاں سے۔''

☆======☆======☆

موگو ہاری کا چھوٹا بھائی پریل اپنے بھائی سے تعلقات منقطع کر چکا تھا...... وجہ اپنی بیٹی سورٹھ کا سنگ نہ اٹھانے کی تھی...... بہر طور وہ اب خیراں کے بیٹے محرم علی کا 25 ہزار میں رشتہ منظور کر چکا تھا...... ادھر سورٹھ بظاہر اس رشتے پر خاموش تھی مگر اس کا وجود غم نہاں سے نڈھال تھا وہ اپنے اندر کا دکھ کسی سے کہہ نہیں سکی تھی...... نہ ہی وہ اس رشتے سے خوش تھی...... وہ اب تک اپنے آپ کو ساون کی دلہن کے روپ دیکھتی آئی تھی...... مگر ظالم تقدیر نے اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا...... اور وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ وہ دہرے عذاب سے دو چار تھی...... کہ ایک تو ساون سے شادی نہ ہونے کا کرب...... دوسرے یک طرفہ بحرِ الفت کے گرداب میں ڈوبنے ابھرنے کا عذاب...... جس کی شنوائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی جس کا احتجاج بے معنی تھا...... سچ ہی تو تھا کہ ساون نے تو اس سے کبھی بھی محبت کا دعویٰ نہ کیا تھا...... اسے تو ہمیشہ سورٹھ نے خود سے جان چھڑاتے ہی پایا تھا۔ اس کی چوڑیاں پیس کر کھانے کی دھمکی نے بھی ساون کو مائل بہ التفات نہ کیا تھا۔ اس کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں...... اس کے گرد شوخ و چنچل سہیلیوں کا جھرمٹ تھا جو شادی کا مخصوص گیت...... گنگناتے ہوئے دلہن بنی سورٹھ کو بھی چھیڑے جا رہی تھیں...... اس کی متواتر ''چپ'' کو وہ شرم پر محمول کر رہی تھیں حالانکہ یہ بات نہ تھی وہ زندہ لاش کی طرح خاموشی طاری کیے بیٹھی تھی...... آرزوؤں اور شکستہ خوابوں کی لاش...... بہر طور شادی کا جام جم عروج پر رہا...... پھر رخصتی کا وقت آیا اور یوں وہ اپنی تقدیر کو محرم علی سے نتھی کر کے اس کے ساتھ ہولی۔

☆======☆======☆

یوں تو ساون کو دوائیں ہسپتال کے قریبی میڈیکل اسٹور سے مل چکی تھیں...... لیکن صرف ایک انجکشن اسے وہاں سے نہیں ملا تھا جو عین جوڑوں کے درمیان لگتا تھا اور خاصا مہنگا بھی تھا...... بس اسی انجکشن کو ڈھونڈنے میں اسے دیر ہو گئی جو اسے شہر کی خاک چھاننے کے بعد دوسرے کونے سے ملا تھا۔ ساون کے نیفے سے بندھے ہوئے روپے تیزی سے ختم ہو رہے تھے اور وہ منشی میرل اور وڈیرے لکھ میر کی سازش کے مطابق مکمل طور پر ان کا مقروض ہوتا چلا جا رہا تھا...... اور اللہ رکھی بھی اس اندوہناک حقیقت سے واقف نہ تھی کہ غیر محسوس طریقے سے ساون کے گلے میں قرض کا طوق دن بدن تنگ ہوتا جا رہا ہے اور وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ ساون نے قرض کے روپے وڈیرے کو لوٹا دیئے ہوں گے مگر درحقیقت وہ روپے ساون چاچی عنایتاں کی بیماری پر صرف کر چکا تھا۔ بہر طور...... ساون جب دوائیں تھامے ہسپتال لوٹا تو اللہ رکھی کو غائب پا کر اسے پہلے تو اچنبھا ہوا...... پھر اسے پریشانی لاحق ہونے لگی۔ کیونکہ ساون پہلے یہی سمجھا تھا کہ ہو سکتا ہے اللہ رکھی اندر وارڈ میں چاچی عنایتاں کے پاس ہو...... لہٰذا جب وارڈ کی جانب بڑھا تو ایک عجیب منظر اس کا منتظر تھا...... ڈاکٹرز وغیرہ اپنا راؤنڈ مکمل کر کے جا چکے تھے اور اب مریضوں کے لواحقین کو اپنے اپنے مریضوں کے پاس جا کر بیٹھنے کی اجازت مل چکی تھی...... اور یہی وجہ تھی کہ وارڈ میں ذرا رش بھی تھا...... مگر جو منظر ساون دم بخود کھڑا دیکھ رہا تھا...... سامنے چاچی عنایتاں کے بیڈ نمبر بارہ کے قریب ہسپتال کے سفید وردی میں ملبوس عملے کا ایک فرد چاچی عنایتاں کے پاؤں دونوں انگوٹھوں کو ملا کر کسی کپڑے کی دھجی سے گانٹھ لگا رہا تھا جبکہ دوسرا چاچی عنایتاں کی ناک کے دونوں نتھنوں میں روئی گھسیڑ رہا تھا...... اور منہ اور کانوں میں بھی یہ عمل کیا جا رہا تھا...... چاچی عنایتاں کی آنکھیں بند تھیں اور اس کا چہرہ ابدی نیند کا تاثر دیتا ہوا پُرسکون تھا...... کسی تکلیف کسی آزار کی رمق تک چہرے پر موجود نہیں تھی جو پہلے ہر وقت رقصاں رہتی تھی، پھر انہوں نے چاچی عنایتاں کے سیدھے سپاٹ پُرسکون وجود کو بہ آہستگی اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا...... اور وارڈ کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھنے لگے...... وہاں دیگر مریضوں کے لواحقین بھی افسردہ سے کھڑے تھے...... ساون دل میں ہزار وسوسے لیے آگے بڑھا......

جب وہ ذرا قریب آیا تو ایک موٹی سی سانولی نرس اسے دیکھ کر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی...... ''لو بھئی بیڈ نمبر بارہ کے تو یہ کھڑے ہیں...... ارے بھئی کہاں ہو تم لوگ...... ہم باہر ڈھونڈنے گئے تھے تمہیں...... تمہارا مریض ایکسپائر ہو چکا ہے۔''

ساون ہونقوں کی طرح دواؤں کی تھیلی سنبھالے اس کا چہرہ تکنے لگا چاچی عنایتاں کے اسٹریچر کے قریب کھڑے ایک سفید وردی والے وارڈ اٹینڈنٹ نے نرس کو قدرے طنزیہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے سسٹر اس بیچارے کو ایکسپائر کا کیا پتہ اس سے بولو کہ اس کا مریض فوت ہو چکا ہے۔''

اس کی بے رحمانہ تصحیح ساون کی سمجھ میں آ چکی تھی...... اس کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا...... ''ہاں...... بھئی ہمیں افسوس ہے تمہاری مریضہ کا انتقال ہو چکا ہے...... تم ایسا کرو باہر ذرا انتظار کرو...... لاش کے ساتھ ڈیتھ سرٹیفکیٹ لے جانا......'' نرس نے یوں کہا جسے اس کے لیے روز کا معمول ہو...... پھر وہ ساون کو گم صم چھوڑ کر...... وارڈ بوائے سے مخاطب ہوئی۔

''اس ڈیڈ باڈی کو باہر کوریڈور میں لے جاؤ......'' پھر ساون کے سامنے سے چاچی عنایتاں کی لاش کو اسٹریچر سمیت کھینچتے ہوئے وارڈ سے باہر لے جا کر راہداری کی دیوار سے لگا دیا گیا۔ ساون افسردگی سے چلتا ہوا اسٹریچر کے قریب آ کر چاچی عنایتاں کے سرخ کمبل سے ڈھکے ہوئے پُرسکوت وجود کو دکھ آمیز نظروں سے تکنے لگا...... اسے چاچی عنایتاں کی موت کا ازحد دکھ ہوا تھا...... اس نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں نمناک سی ہونے لگی تھیں۔

ہر چند کہ اس کا چاچی عنایتاں کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہ تھا تاہم وہ بہر حال اللہ رکھی کی چاچی تھی...... ساون دل مسوس کر سوچنے لگا کہ اللہ رکھی کو چاچی کی موت کا کتنا رنج ہوگا...... اللہ رکھی کا خیال آتے ہی وہ ایک بار پھر پریشان سا ہو کر چونکا...... چاچی عنایتاں کے اچانک انتقال کر جانے پر وہ ایک لمحے کو اللہ رکھی کی پُراسرار غیر موجودگی سے غافل ہو چکا تھا...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے...... یہاں موجود رہے یا اللہ رکھی کو تلاش کرے، وہ بے چارہ دہری پریشانی میں گھر چکا تھا، چاچی عنایتاں مر چکی تھی۔ اس کی لاش کو چھوڑ کر بھی ساون کہیں نہیں جانا چاہ رہا تھا، مگر اللہ رکھی کو بھی ڈھونڈنا لازمی تھا...... ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ وہ موٹی سی نرس دوبارہ آن وارد ہوئی اور ایک کاغذ سا اس کی جانب بڑھاتے ہوئے قدرے چبھتی ہوئی آواز میں بولی۔

''یہ مرحومہ کی موت کا تصدیق نامہ ہے...... تم اب فارغ ہو...... اور...... ہاں یہ اسٹریچر کب تک فارغ کرو گے...... میرا مطلب ہے...... لاش لے جاؤ اپنے ساتھ...... ہمیں یہ اسٹریچر چاہئے......'' یہ کہتے ہوئے وہ استفہامیہ نظروں سے ساون کی طرف دیکھنے لگی۔

ساون کو حیرت ہوئی وہ سوچنے لگا کہ کیا اتنے بڑے ہسپتال میں صرف یہی ایک اسٹریچر ہے...... اسے خاموش پا کر وہ دوبارہ سڑیل سے انداز میں بولی...... ''ارے بھئی بول...... گونگے کیوں بن گئے بھئی......''

''آں...... ہاں...... وہ میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے......'' پھر اس نے اسے بتایا کہ درحقیقت لاش کی اصل وارث اللہ رکھی یہاں موجود نہیں...... اور نہ ہی اس کا ابھی تک کہیں پتہ چل سکا ہے کہ وہ کہاں ہے......؟ ساون نے قدرے چونک کر بتایا تو نرس منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''یہ بڑا مسئلہ ہو جائے گا پھر ہمارے لئے...... لاش کو ہم زیادہ دیر یہاں رکھ نہیں سکتے......''

''سسٹر میں خود پریشان ہوں...... اور اللہ رکھی کو ڈھونڈے بغیر میں گوٹھ میں نہیں جا سکتا......'' ساون نے بالآخر عذر پیش کیا...... تو اس کی بات سن کر نرس منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی ایک طرف کو چلی گئی اور ساون نے غنیمت جانا اور ایک آخری نظر اسٹریچر پر رکھی چاچی عنایتاں کی لاش پر ڈالتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔

وہ اب ہسپتال کے گیٹ کے قریب آ چکا تھا وہ ابھی ہسپتال کے بیرونی احاطے میں ہی موجود تھا...... دن ڈھلنے کو تھا اور سردی میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ ادھر ساون اللہ رکھی کی اچانک پُراسرار گمشدگی پر پریشان ہوا جا رہا تھا...... وہ سوچنے لگا کہ آخر اللہ رکھی کو کہاں تلاش کرے......؟ وہ گئی کہاں؟...... اللہ رکھی ایسی لڑکی تو نہ تھی کہ خود سے ہی کہیں چلی جاتی...... کیا پھر اسے کوئی ورغلا کر اپنے ساتھ لے گیا ہے؟ اس سے آگے قیاس آرائی کی اس میں ہمت نہ تھی...... اس نے اللہ رکھی کو تلاش کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ کیا کہ...... وہاں قریب موجود دیگر لوگوں سے اس کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی۔ تب بالآخر اسے کینٹین کے چھوکرے نے یہ بتا کر دہلا دیا کہ...... تھوڑی دیر پہلے اللہ رکھی کے ساتھ کچھ لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے پھر اس کے بعد وہ ان لوگوں کے ساتھ راضی خوشی چل پڑی تھی۔''

ساون کو اب ایک نئی پریشان کن صورت حال نے گھیر لیا...... اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ کون لوگ تھے...... جن کے ساتھ اللہ رکھی خوشی خوشی چل پڑی تھی۔ جہاں تک اسے یاد تھا کہ دور دور تک اللہ رکھی کا کوئی ایسا قریبی جاننے والا نہیں تھا جن کے ساتھ اسے جانے میں تامل نہ ہوتا، کیا گوٹھ کے لوگ تھے...... جو اسے ورغلا کر کسی بہانے اپنے ہمراہ

لے گئے تھے......؟ بالآخر ساون نے ان خطوط پر غور کرنا شروع کیا تب اسے اپنے ایک خدشے پر یقین سا ہونے لگا......لیکن ...... یہ ''خدشہ'' ایک ایسا قعرِ فنا تھا جس کے اندھیروں میں تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بہر طور ساون نے معصوم اللہ رکھی کو اس بھرے پُرے اجنبی شہر میں تلاش کرنے کے لیے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔

☆======☆======☆

''میں اس سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔'' اللہ رکھی منشی میرل کی بات سن کر زور سے چلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے جانے دو یہاں سے......'' اسے اچانک ہی غیر یقینی حالات کی سفاکی کا احساس ہونے لگا تھا...... جو پریشانی اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت بن کر اس کی بڑی بڑی پھیلی ہوئی حسین آنکھوں سے مترشح ہو رہی تھی۔

''بیٹھو! یہاں...... اور پہلے میری بات پر اچھی طرح غور کرو......'' منشی میرل نے اس بار قدرے سخت لہجے میں اللہ رکھی کی جانب گھور کر کہا اور اسے ڈراتے ہوئے بولا......

''دیکھو...... تمہارے چاچا سوڈھل اور خانو کے بیچ جو معاہدہ طے پایا تھا...... اس کی باقاعدہ لکھت پڑھت ہے قانونی...... اور تیرے سنگ کے سلسلے میں اس شخص خانو نے سوڈھل کو جو چالیس ہزار کی رقم دی تھی اس کا ثبوت اور رسید بھی ہے اس کے پاس......'' منشی نے خانو دھچر کی جانب اشارہ کیا تھا جو اب منشی میرل کے ساتھ ہی آن کھڑا ہوا تھا اور اللہ رکھی کو یوں گھورے جا رہا تھا جیسے اسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائے گا...... اللہ رکھی کو اس کا کالا بھجنگ چہرہ انتہائی ناگوار معلوم ہو رہا تھا اور اسے کراہت سی محسوس ہو رہی تھی...... تاہم منشی میرل کی گفتگو...... جو سراسر جھوٹ پر مبنی تھی...... اس سے اللہ رکھی خاصی پریشان سی ہو گئی تھی...... عیار اور چالباز منشی میرل آنکھیں سکیڑے اپنی گہری مکارانہ نظروں سے سادہ لوح اللہ رکھی کے چہرے کو بغور تکے جا رہا تھا۔ پھر وہ خانو سے مخاطب ہو کر بولا...... ''ارے خانو...... اسے شاید میری بات پر یقین نہیں آیا...... تُو ایسا کر اسے وہ کاغذ اور رسید دکھا جس پر تیرے اور اس کے چاچا سوڈھل کے انگوٹھے کے نشانات ہیں......''

خانو نے فوراً منشی میرل کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کچھ کاغذات کا پلندہ اللہ رکھی کی جانب بڑھایا اللہ رکھی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا...... وہ پھٹی پھٹی پریشان کن نظروں سے خانو کے سیاہ رو ہاتھ میں چھوٹے بڑے کاغذات کو دیکھ رہی تھی جس پر کسی کے انگوٹھوں کے نشانات موجود تھے اور ان کے اوپر ٹیڑھے میڑھے رسم الخط میں چاچا سوڈھل اور خانو کے نام بھی تحریر تھے...... اللہ رکھی گو اتنا زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی...... تاہم گوٹھ کے اکلوتے

اسکول میں بنیادی تعلیم ضرور حاصل کی تھی جو چوتھی پانچویں تک ہی محدود تھی...... اور مکار منشی میرل بھولی بھالی معصوم اللہ رکھی کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے جھوٹے کاغذوں میں الجھانے کی کوششیں کر رہا تھا۔ اللہ رکھی انہیں دیکھ کر پریشان سی ہو گئی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی بات پر ڈٹی رہی اور اٹل لہجے میں بولی۔

''مم...... میں یہ روپے اسے لوٹا دوں گی...... لیکن شادی کسی قیمت پر بھی نہیں کروں گی اس سے۔'' اس کا اشارہ خانو دھچر کی طرف تھا۔

خانو اس کی بات پر غصے سے بل کھا کر اٹھ گیا...... اور معصوم اللہ رکھی کو شکوے ایسی نظروں سے گھور کر بولا۔ ''مجھے روپے نہیں تیرا سنگ چاہئے اب...... سیدھی طرح مان جا ورنہ میں پولیس کے ذریعے تجھے......'' اس نے دانستہ اپنا جملہ اثر ڈالنے کی خاطر ادھورا چھوڑ دیا۔

اللہ رکھی بے چاری خوف سے سمٹ سی گئی اور ہراساں ہرنی کی طرح نظر آنے لگی...... جو بھوکے بھیڑیوں کے غول میں پھنس گئی ہو۔

ایسے میں منشی میرل تصنع آمیز لہجے میں خانو کو ذرا ڈپٹتے ہوئے بولا...... ''تُو چپ کر بابا...... میں بات کر رہا ہوں نا......'' پھر وہ سہمی ہوئی کھڑی اللہ رکھی سے مخاطب ہوا......

''دیکھ دھی...... بات تو خانو کی درست ہی ہے...... وہ کاغذوں کی رو سے حق پر ہے کہ وہ کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائے...... اور پولیس کے پاس جائے...... لیکن تُو گڑتی نہ کر میں ایسا کرنے نہیں دوں گا...... ویسے بھی یہ غصے میں ایسا بول رہا ہے...... آخر کو تم دونوں ایک ہی گوٹھ کے رہنے والے ہو...... اچھا ایسا کر تُو آرام سے بیٹھ کر سوچ لے...... ہم پھر آئیں گے...... لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ ہماری بات مان لینے میں ہی تمہارا فائدہ ہے...... سوچ لینا۔'' آخری الفاظ اس نے قدرے سنسناتے لہجے میں کہے تھے۔

اللہ رکھی کو جھرجھری سی آ گئی...... جب منشی میرل اور خانو اسے تنہا چھوڑ کر جانے لگے تو اللہ رکھی یک دم کپکپاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھی اور منشی میرل کے آگے اپنے دونوں نازک ہاتھ جوڑ کر لرزیدہ لہجے میں بولی۔ ''منشی چاچا...... تجھے رب سائیں کا واسطہ...... ابھی یہ بات رہنے دے...... ہسپتال میں میری چاچی بیمار پڑی ہے...... وہ چاک (تندرست) ہو جائے تو......''

منشی میرل فوراً اس کی داد فریاد کو رد کرتے ہوئے سراسراتے لہجے میں بولا، جس میں طنز کی بھی آمیزش شامل تھی۔ ''نا...... دھیئے...... نا...... اب تُو زیادہ چالاک نہ بن...... اس

بے چارے خانو کے پورے چالیس ہزار داؤ پر لگے ہوئے ہیں تیری چاچی کا کچھ پتہ نہیں مرے کہ بچے...... پھر تو بھی اکیلی رہ جائے گی۔''

منشی میرل کے سنگدلانہ تبصرے پر بیچاری اللہ رکھی کا دل کٹ سا گیا۔ وہ بے اختیار بولی۔ ''منشی چاچا...... میری چاچی کو ایسی بددعا تو نہ دے میرا اس کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں......'' یہ کہتے ہوئے بے اختیار اللہ رکھی کا دل بھر آیا...... اور اس کے سینے میں دھواں سا بھرنے لگا...... مارے رقت کے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی...... اور وہ اس وقت کو کوسنے لگی جب وہ...... ان مردودوں کے ساتھ ورغلائے میں آکر بنا سوچے سمجھے یہاں چلی آئی تھی...... خانو کی طرف سے تو اس کے دل میں گویا جیسے نفرت کا ایک بے اندازہ طوفان اٹدنے لگا...... وہ اس سے شادی تو کجا اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ پھر وحشت بھرے لہجے میں گڑگڑاتے ہوئے منشی سے بولی۔ ''منشی...... دیکھ...... میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں تجھے دھڑیں سائیں کا واسطہ...... تجھے آڑیں مرشد سائیں کا واسطہ دیتی ہوں...... میں بہت مصیبت میں ہوں...... مجھے...... ہسپتال چاچی کے پاس جانے دے...... اس وقت......'' انتہائی بے بسی و بے چارگی کے مارے اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہتے ہوئے...... شبنمی لکیریں سی بناتے موتیوں کی طرح نیچے ٹپکنے لگے...... وہ دوبارہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں گڑگڑائی۔ ''مجھے جانے دو...... میں مرجاؤں گی یہاں...... تمہیں اللہ سائیں کا واسطہ...... میں بہت دکھی ہوں......'' اس کی گریہ زاری جاری تھی...... لیکن سنگ دل اور کٹھور منشی میرل اور خانو پہ اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا ہاں...... ان کے چہروں سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ اللہ رکھی کی بے بسی سے حظ اٹھا رہے ہوں اس معصوم کے نالہ وشیون سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

پھر وہ دونوں اللہ رکھی کو اس کے حال پر چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے...... اللہ رکھی سسکتی، بلکتی آگے کو بڑھی...... مگر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا...... اسے قید کر دیا گیا تھا۔ اس نے مقدور بھر دروازہ کھولنے کے لیے زور آزمائی کی مگر بے سود...... وہ روتی آنکھوں کے ساتھ واپس پلٹی پھر ٹوٹے ٹوٹے انداز میں صوفے پر گر سی گئی...... اس کی ٹانگیں حتیٰ کہ پورا وجود...... وحشت انگیز ارتعاش میں مبتلا تھا۔ وہ خود کو ایک بے بس چڑیا کی مانند آہنی پنجرے میں محسوس کر رہی تھی وہ ساون کو یاد کر کے رونے لگی...... وہ اسے نہ پا کر کتنا پریشان ہو رہا ہو گا...... اسے منشی میرل کی اس بات پر ہنوز تردد تھا بلکہ یقین تھا کہ انہوں نے ساون سے متعلق سب کچھ جھوٹ کہا ہے۔ ساون کبھی اسے یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا...... بلکہ وہ

اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہو گا...... اب اللہ رکھی کو دھیرے دھیرے یہ ادراک ہو چلا تھا کہ اس کے ساتھ منشی میرل اور خانو نے دھوکا کیا ہے اور اسے چالاکی سے یہاں لے آئے ہیں اور اب جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ تاہم اسے اس بات پر بھی تشویش ہونے لگی تھی کہ کیا واقعی اس کے سوڈھل چاچا نے دودا خان کے علاوہ اس بدذات خانو دھچر سے بھی روپے لے کر اس کا سودا کر رکھا تھا جس کا ثبوت خانو...... کاغذوں میں سوڈھل کے لگے انگوٹھے دکھا کر پیش کر رہا تھا...... اور بہ طور ثبوت منشی میرل بھی پیش پیش تھا...... لیکن باوصف اس کے اللہ رکھی کو اس ساری کہانی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہر طور اللہ رکھی اب ساری باتوں کو ذہن سے جھٹک کر یہاں سے بھاگ نکلنے کے امور پر غور کرنے لگی اسے اس بات پر یقین واثق تھا کہ ایک بار وہ ساون کے پاس چلی جائے...... پھر اسے کسی سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

کمرے میں گہرا سا سکوت طاری تھا...... اللہ رکھی اپنی جگہ بیٹھی اب گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی...... کمرہ نہ زیادہ بڑا تھا نہ چھوٹا...... تاہم وہ ہر طرح کی آرائش وزیبائش کی اشیاء سے آراستہ تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اس نے محسوس کیا جیسے اس کے اندر یکا یک خود اعتمادی عود کر آئی ہو...... اس نے دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگی کہ وہ کسی طرح اسے اس جہنم سے بہ حفاظت فرار کروا دے...... وہ اب کمرے سے فرار کے امکانات پر غور کر رہی تھی۔ کمرے کا ایک بیرونی دروازہ تو بند تھا...... جبکہ ایک عقبی دروازہ بھی تھا جسے اللہ رکھی نے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ یہ وہ دروازہ تھا جہاں سے ادھیڑ عمر ملازمہ نمودار ہوئی تھی یہ شاید اندرونی طرف بنگلے میں کھلنے والا دروازہ تھا۔ چاروناچار اللہ رکھی نے اسے ہی آزمانے کا فیصلہ کیا۔ وہ یہاں سے نکلنے کے لیے ایک پل بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اسے منشی میرل کی یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ وہ بہت جلد اس کا فیصلہ سننے کے لیے دوبارہ لوٹیں گے۔ لہٰذا ان کے آنے سے پہلے ہی اللہ رکھی اس منحوس بنگلے سے نکل جانا چاہتی تھی...... جب اس نے اپنے مطلوبہ دروازے کو کھولنے کے لیے زور آزمائی کی تو اس کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا...... کیونکہ دروازہ دوسری جانب سے بند نہیں تھا...... لیکن پھر جیسے ہی اللہ رکھی نے دروازہ پورا کھولا تو سامنے نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح ٹھٹکی تھی...... دوسری جانب ادھیڑ عمر ملازمہ کھڑی اللہ رکھی کو عجیب سی نظروں سے تکے جا رہی تھی...... مگر اس طرح کہ اس کا سانولا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''ہاں دھیئے! تجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے ورنہ...... ورنہ...... تو بھی میری

دھی فرزانہ کی طرح ان شیطانوں کی بھینٹ چڑھ جائے گی......'' دروازے کی دوسری جانب کھڑی ادھیڑ عمر ملازمہ اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے اللہ رکھی کو دیکھتے ہوئے بولی تو اللہ رکھی کو اس کے رقت آمیز لہجے نے قدرے حوصلہ بخشا۔

لمحہ بھر توقف کے، وہ ملازمہ جس کا نام مائی رحمت تھا دوبارہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔

''آجا...... میرے ساتھ...... تجھے بنگلے کے پچھواڑے سے باہر نکال دیتی ہوں...... آگے رب سائیں...... تجھ پر رحم کرے۔ آجا...... تکڑا......'' یہ کہتے ہوئے وہ واپس مڑی۔

اللہ رکھی نے بھی اپنے قدم اس کے عقب میں بڑھا دیئے...... وہ مائی رحمت کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی...... ایک اور نسبتاً بڑے ہال کمرے سے ہوتی ہوئی...... ایک تنگ سی راہداری سے گزرتی ایک جگہ رک گئی...... یہ بنگلے کا عقبی حصہ تھا جو خاصا شکستہ سا نظر آ رہا تھا...... یہاں ایک پٹ والا چوکھٹا بھی موجود تھا جس کا سالخوردہ سا دروازہ بند تھا...... مدھم سی روشنی میں پُرسکوت سناٹا چیختا ہوا محسوس ہو رہا تھا...... مائی رحمت مذکورہ دروازے کے قریب پہنچ کر اطراف کی سن گن لیتی رہی۔ بنگلے کے مختلف کمروں کا یہ پچھواڑا تھا...... کمروں کے روشندان واتھے اور کہیں کہیں ان میں مدھم سی روشنی بھی پھوٹ رہی تھی...... اللہ رکھی کا دل کسی اچانک ہونے والی انہونی سے بری طرح دھڑک رہا تھا...... مائی رحمت نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو سالخوردہ دروازے کی ہلکی سی ناگوار چرچراہٹ پُرسکوت سناٹے میں وحشتناک محسوس ہوئی...... دروازہ کھلتے ہی ایک سرد لہر نے اللہ رکھی پر جھرجھری سی طاری کر دی...... سامنے تاریکی سی پھیلی ہوئی تھی...... مائی رحمت نے اللہ رکھی سے سرگوشی میں کہا۔

''دھیئے!...... چند قدم سیدھے جانے کے بعد جب دیوار آ جائے تو اس کے ساتھ ساتھ دائیں جانب چلی جانا...... تب تیرے سامنے ایک اور دیوار آ جائے گی...... وہاں گٹر ہوگا جس پر خاصی اونچی سیمنٹ کی ڈکی (چبوترا) نظر آئے گی۔ وہیں عقب میں جہاں دونوں دیواروں کا تکون بن رہا ہوگا وہاں ایک اتنا بڑا سوراخ ہوگا کہ اگر تو زمین پر لیٹ کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گی تو بآسانی اس جہنم سے نکل سکتی ہے......'' اتنا کہہ وہ چپ ہو رہی۔

اللہ رکھی نے اس کی بات غور سے سن کر ذہن نشین کر لی تھی...... اس نے ایک ثانیے تشکر آمیز نگاہوں سے مائی رحمت کی جانب دیکھا تو وہ دوبارہ اللہ رکھی سے اس بار ذرا عجلت میں بولی۔ ''دھیئے! دیر نہ کر...... ورنہ تیرے ساتھ میں بھی ماری جاؤں گی...... پھر

کون کسی ''فرزانہ'' کو اس جہنم سے نجات دلایا کرے گا۔''

اللہ رکھی اس کی بات کا مطلب فوراً سمجھ گئی اور پھر اس نے باہر نکلنے میں دیر نہیں لگائی تھی...... اس کے باہر نکلتے ہی پیچھے سے مائی رحمت نے دروازہ فوراً بند کر دیا تھا...... اللہ رکھی کے نازک چہرے پر ایک یخ بستہ سیلن سی ٹکرائی اسے جھرجھری سی آئی...... اس نے آگے قدم بڑھائے...... یہاں زمین کیچڑ زدہ سی محسوس ہو رہی تھی...... اللہ رکھی رکی نہیں...... ایک دو جگہ اس کا پاؤں پھسلا...... مگر سنبھلتے ہوئے وہ چلتی رہی...... یہ کائی زدہ سی جگہ تھی جہاں گندے آبی پودوں اور جابجا گھاس کی ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی...... آسمان صاف تھا اور آخری تاریخوں کی مدھم سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی...... چند قدموں کے بعد سامنے دیوار آ گئی مگر اللہ رکھی رکی نہیں اور دیوار کے ساتھ ساتھ دائیں جانب مڑ گئی...... ذرا دیر بعد ہی...... گٹر کے اوپر بنا ہوا سیمنٹ کا چوکور چوکور چبوترا نظر آ گیا...... اور اس کے بالکل عقب میں جہاں دیوار کا مثلث تھا نیچے کی طرف ایک آدم گزار سوراخ نظر آیا...... اللہ رکھی فوراً جیسے تیسے خود کو زمین کے ساتھ لگا کر گھسٹتی ہوئی تنگ سے سوراخ سے باہر نکل آئی...... یہ بنگلوں کا پچھواڑے کا علاقہ تھا جہاں خاصی گندگی سی نظر آ رہی تھی...... یعنی سامنے سے بنگلے خوبصورت تھے پیٹھ پیچھے ان کی گندگی تھی...... کیچڑ آلود زمین سے لگ کر سوراخ پار کرنے کی وجہ سے اللہ رکھی کے کپڑے، چہرہ سب گندے ہو رہے تھے...... اس وجہ سے اسے ٹھنڈ بھی کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی...... لیکن اسے اس کی ذرا پروا نہ تھی...... سامنے مدھم چاندنی میں اسے ایک ذیلی سڑک نظر آ رہی تھی...... تھوڑی دیر بعد اللہ رکھی پُرسکوت رات کے سناٹے میں مذکورہ سڑک کے کنارے آگے بڑھنے لگی۔ اس کا دل جیسے کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا...... سانس بھی خاصی پھولی ہوئی اور بے ربط سی ہو رہی تھی...... پورے وجود میں عجیب سی کپکپی طاری تھی...... اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ...... وہ کہاں جائے...... اس کے لیے تو یہاں کا چپہ چپہ اجنبی تھا جدھر قدم بڑھاتی وہاں ایک نیا وسوسہ اور اندیشہ ناگ کی طرح کنڈلی مارے موجود تھا...... تاہم اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ کسی طرح سے ہسپتال چاچی عنایتاں اور ساون کے پاس پہنچ جائے...... ساون کا خیال آتے ہی اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا...... وہ کہاں ہوگا اس وقت...... ضرور وہ اس کی تلاش میں شہر کا کونا کونا چھان رہا ہوگا...... معاً چلتے چلتے اللہ رکھی کو یوں لگا جیسے کوئی اس کے عقب میں دوڑا چلا آ رہا ہو...... وہ بے چاری ایسی دہشت زدہ ہوئی کہ پیچھے مڑ کر اپنے ''متعاقب'' کو دیکھنے کی بھی سعی نہ کی اور دیوانہ وار دوڑنے لگی۔ چہار سو وحشت ناک رات کے سناٹے اسے خوفناک

بلاؤں کی طرح چیختے چلاتے اور اس کی بے بسی پر جیسے قہقہے لگاتے ہوئے محسوس ہونے لگے...... اللہ رکھی کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا...... نازک وجود بے دم سا ہونے لگا پھر اگلے ہی لمحے اس کا پاؤں رپٹا اور وہ بری طرح لڑکھڑا کر چیخ مارتے ہوئے گری تب اس کا سر...... ایک لیمپ پوسٹ سے ٹکرایا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

ساون کے اطراف وجوانب میں ٹریفک کا ایک اژدھام سا تھا...... دن جیسے جیسے ڈھل رہا تھا ساون کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ اللہ رکھی کی تلاش بسیار میں پاگلوں کی طرح شہر لاڑکانہ کا جیسے کونہ کونہ چھان مار رہا تھا...... اجنبی شہر کی اجنبی راہیں اس کے وحشت ناک اندیشوں میں اضافے کا سبب بن رہی تھیں اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شہر کے ایک ایک گھر...... ایک ایک کمرے کو چھان کو دیکھے کہ اس کی الم نصیب اللہ رکھی شاید کہیں کسی کونے میں بیٹھی اپنے تیرہ وتار مقدر پر آنسو بہا رہی ہو...... شام ڈھلی تو رات نے آلیا ساون کی پریشانی فزوں تر ہونے لگی...... اس کے دل و دماغ میں کوئی جیسے اندیشوں، وسوسوں کے کوڑے برسا رہا تھا۔

''اللہ رکھی! تُو کہاں چلی گئی...... اس بھرے پُرے شہر میں...... میں تجھے کہاں ڈھونڈوں...... تجھے تو گوٹھ کے لوگوں نے نہیں بخشا...... یہ تو شہر ہے...... ایک نقاب ریا چڑھائے ہوئے انسانوں کا شہر......'' ساون جیسے اپنے اندر چیخنے لگا...... اپنی زندگی میں پہلی بار ساون نے محسوس کیا کہ وہ کتنا بے بس اور کمزور ہے...... ورنہ کیسے بھی دگرگوں حالات ہوتے، اس نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور یہی زعم اسے ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت فراہم کرتا تھا...... لیکن آج...... وہ خود کو بالکل ٹوٹا ہوا محسوس کرنے لگا تھا...... اللہ رکھی کی اچانک گمشدگی سے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا کوئی نازک سا آبگینہ کہیں کھو گیا ہے اور جس کے ٹوٹ جانے کے اندیشے سے وہ خود اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہے۔ اللہ رکھی کی مجنونانہ تلاش میں گزرتا ہوا ہر لمحہ اس کی وحشتوں میں اضافہ کر رہا تھا...... دل و دماغ پر بوجھ بڑھنے لگا تو اعصاب بھی مضمحل سے ہونے لگے نتیجتاً...... جسم نے بھی تھکن سے چور کر ڈالا...... پھر پتہ نہ چلا کہ ساون نے وہ عذاب ناک رات کس جگہ بیٹھ کر گزار دی۔ کسی نے درست ہی کہا ہے ایسے موقع پر کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے...... اور ساون نے بھی وہ رات سولی پر چڑھ کر گزار دی تھی۔ آنکھ کھلی تو کوئی اسے جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا...... وہ ''کوئی'' اس کا باپ موگو تھا...... جو گوٹھ سے بیٹے کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں

شہر آ پہنچا تھا اور اب اچانک ساون ایک بند دکان کے ٹھٹھرتے ہوئے تھڑے پر ٹیک لگائے لیٹا ہوا تھا۔

''اٹھ...... میڈا پٹ ساون!...... یہ تجھے کیا ہو گیا ہے...... تُو یہاں کیا کر رہا ہے......؟'' موگو بیٹے کی ہیت کذائی پر کڑھتے ہوئے بولا...... ساون بری طرح چونکا۔ وہ اب پوری طرح جاگ چکا تھا...... پر ایسے کہ اسے جاڑا پالے کی صورت لگ چکا تھا وہ بری طرح ٹھٹھر رہا تھا...... وہ باپ کو اپنے...... پہچان چکا تھا...... مگر بولا کچھ نہیں...... اس کے سینے میں مایوسیوں کا دھواں بھرا ہوا تھا اسے رشتوں کی بھی پہچان نہیں رہی تھی...... بلکہ اللہ رکھی کی گمشدگی کا ذمہ دار بھی وہ اپنے باپ کو ہی سمجھ رہا تھا...... اگر وہ اس کی اللہ رکھی کو اپنی بہو تسلیم کر لیتا تو آج نہ وہ کہیں کھوتی اور نہ ہی خود وہ اس کی تلاش میں دربدر اور خاک بسر ہو رہا ہوتا...... موگو نے بیٹے کی آنکھوں میں بے رخی بھانپ لی تھی وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے بڑے رسان سے مخاطب ہوا...... ''میڈا پٹ......! تُو اپڑیں پیو کو بھی نہیں پہچان رہا...... میں تیرا پیو ہوں...... گوٹھ سے آیا ہوں...... اٹھ چل میڈے نال گوٹھ...... اٹھ شاباش''۔

''نہیں بابا...... میری اللہ رکھی کھو گئی ہے یہاں...... اس شہر میں...... میں اسے تلاش کئے بنا گوٹھ کا رخ تک نہیں کروں گا......'' ساون نے بالآخر خود پر قابو پاتے ہوئے جواباً اٹل لہجے میں کہا...... لحظہ بہ لحظہ اس کے اندر باپ کو دیکھ کر تلخی سی اتر رہی تھی اور وہ یہی چاہتا تھا کہ اس سے کسی قسم کی گستاخی ہونے سے پہلے باپ کو واپس رخصت ہونے پر مجبور کر دے لہٰذا بولا...... ''بابا......! تُو واپس چلا جا گوٹھ''......

''اڑے میڈا پٹ...... ایسے کیسے گوٹھ چلا جاؤں...... حالت تو دیکھ اپڑیں...... جاڑا لگ گیا ہے ڑے تیکوں...... اتھے گوٹھ میں تیری امڑ اور ادی ہدایتاں گڑتی (فکر) کر رہے ہیں تیری اور تُو''۔

''بابا ھن رہن دے ایسی باتوں کو تو......'' ساون نے تلخی سے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور مزید بولا...... ''تیکوں اگر اتنا ہی خیال ہوتا ان باتوں کا تو پھر تو''۔

''ھل بابا ھل...... ماٹھ کر ھن...... چپ کر...... حیاء کر کچھ پیو ہوں میں تیرا......'' جواباً موگو بھی اپنے بیٹے ساون کی بات کاٹتے ہوئے قدرے خفت آمیز لہجے میں بولا......۔ تاہم وہ اللہ رکھی کی اچانک گمشدگی کا سن کر ایک لمحے کو چونکا ضرور تھا۔ باپ کی خفت آمیز گھرکی سن کر ساون محجوب سا ہوا لہٰذا بولا۔

''بابا...... تُو گوٹھ چلا جا واپس...... امڑ اور ادی کو میری دل جا (تسلی) دے جا کر...... میرا وعدہ ہے...... اللہ رکھی جیسے ہی مجھے مل گئی میں آ جاؤں گا اس کے ساتھ گوٹھ واپس......'' موگو، بیٹے کی بات پر قدرے مغموم چہرے سے اسے تکنے لگا آخر کو وہ اس کا باپ تھا، جانتا تھا کہ ہٹ میں سوا ہی ہوگا...... لہٰذا ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

''اچھا...... پھر میری دعا ہے دھڑیں سائیں سے...... دھی اللہ رکھی تجھے لبھ (مل) جائے...... تو سیدھ گوٹھ آ جانا...... میں تم دونوں کی شادی کر دوں گا...... پر وعدہ کر...... تُو واپس مڑ کر آئے گا گوٹھ......'' ساون باپ کی بات پر پہلے تو کھل سا گیا...... مگر پھر وہی اس پر قنوطیت طاری ہونے لگی...... اور وہ دل میں سوچنے لگا کہ کاش اس کا باپ شروع ہی میں مان لیتا...... تو آج اللہ رکھی گم نہ ہوتی...... ''اچھا تو اٹھ یہاں سے چل کر کسی ہوٹل میں مانی ٹکر کھاتے ہیں...... اٹھ......'' موگو پدرانہ شفقت سے بولا...... اور ساون چار و نا چار اٹھ کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

رات جیسے بھاری سل کی طرح سرک رہی تھی...... جابجا اکھڑے ہوئے فرش کی لہو کو برفاب بناتی ٹھنڈک رگوں میں سرایت کر رہی تھی...... بارہ بائی نو کے مختصر سے کمرے میں مدھم پاور کا بلب بوجھل سی روشنی پھیلا رہا تھا۔ تین اطراف کی اکھڑے ہوئے پلستر کی سیلن زدہ دیواروں کی چوتھی طرف سلاخ دار دروازے کے پار...... برآمدے میں تاریکی اتری ہوئی بڑی پُراسرار محسوس ہو رہی تھی...... ایسی ہی چند اور بھی قطار در قطار بیرک نما کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں...... وہاں موجود سب قیدی میلی چیکٹ بوریاں سی اوڑھے فرش پر لیٹے خراٹے لے رہے تھے...... مگر مذکورہ بارہ بائی نو کی بیرک نما کوٹھڑی میں وہ دونوں دیوار کے قریب...... گودڑیاں اوڑھے سکڑے سمٹے بیٹھے ہوئے تھے...... یہ اکو دھاڑیل اور علی بخش تھے...... ان دونوں کے جوش اور غصے سے تمتماتے ہوئے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے ان کے درمیان اس اچانک پلٹتی ہوئی مخدوش صورت حال پر کافی دیر تک تبادلۂ خیال ہوتا رہا ہے...... اور اب ان کے پاس پیچ و تاب کھانے کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔

وہ دونوں اس وقت گوٹھ کے تھانے میں موجود تھے...... حوالات میں آنے سے قبل ہی اکو دھاڑیل کو کسی گہری سازش کی بو محسوس ہو چکی تھی...... جس کی تصدیق علی بخش نے بھی جواباً یہ کہہ کر بھی دی تھی کہ...... یہ کام اس کے سوتیلے بھائی محرم علی اور اس کے دونوں ماموؤں کا ہی انجام کردہ ہے، لیکن اکو دھاڑیل کو خود سے زیادہ علی بخش کی فکر ستا رہی تھی......

کیونکہ وہ بہرحال بے قصور تھا...... ایک بدنام دھاڑیل سمیت گرفتار ہونا اسے بھی عادی مجرموں کی صف میں کھڑا کر رہا تھا اور اسی بات سے اکو دھاڑیل کو علی بخش سے متعلق تشویش ہو رہی تھی...... اس کی کوشش بھی یہ تھی کہ کسی طرح علی بخش پر ''دھاڑیل'' (ڈاکو) کا لیبل نہ لگے ورنہ وہ ساری عمر اندھیروں میں گم ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان سلاخوں کے پیچھے آنے والے کئی بے گناہ لوگ...... آج جنگلوں کے اندھیروں میں ڈوب چکے تھے جن میں وہ خود بھی شامل تھا۔ انہیں لاک اپ ہوئے یہاں آج تیسرا دن تھا...... اور پولیس مزید پندرہ بیس دنوں کا ان کا ریمانڈ لینا چاہتی تھی...... اس دوران حوالات میں اکو دھاڑیل کا ایک ساتھی بھی بمشکل تھانے کے عملے کی مٹھی گرم کر کے اس سے ملاقات کرنے آیا تھا......

''سردار سائیں! حکم کرو، تھانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں...... ہمراہ (ساتھی) سب گرم ہو رہے ہیں...... تیری گرفتاری پر۔'' اس نے سرگوشی میں اکو دھاڑیل سے کہا تھا...... مگر اکو دھاڑیل یہ نہیں چاہتا تھا...... کوئی اور موقع ہوتا تو وہ...... اپنے جاں نثار ساتھیوں کو ''گرین سگنل'' دے دیتا مگر اب وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا...... درحقیقت اس تھانے سے فرار ہونا اس کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی...... لیکن علی بخش کی مجبوری آڑے آ رہی تھی...... اگر وہ علی بخش سمیت یہاں سے فرار ہوتا تو اس پر ساری عمر کے لیے ایک عادی مجرم کی مہر ثبت ہو جاتی۔

لہٰذا اکو دھاڑیل اپنے ساتھی کی بات پر اسے منع کرتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''نہیں...... یارا......! اس کا ابھی وقت نہیں آیا...... پر تُو ایک کام کر......''

''ہاں سردار سائیں! بولو......'' وہ مستعدی سے بولا۔

''دیکھ...... وارہ...... سے آگے ایک گوٹھ ہے گڑھی جاگیر...... وہاں کا وڈیرا رب نواز میرا دوست ہے۔ اسے میرا سلام کہہ دینا اور صرف اتنا بتا دینا کہ ایک چھوکرے علی بخش ولد دودا خان مرحوم کی ضمانت کے سلسلے میں کچھ کرے......'' اس کی بات بغور سننے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی علی بخش نے ذرا حیرت سے پوچھا...... ''اکو چاچا! یہ کیا بات ہوئی...... تُو نے صرف میری ضمانت کے لیے ہی کیوں کہا اسے...... کیا تو اپنی ضمانت نہیں کروائے گا؟''

علی بخش کی بات پر اکو دھاڑیل نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا...... ''دیکھ علی بخش! جیل کی دیواریں ہی دراصل میری آزادی کی ضمانت ہیں جو میرے لئے پلک

جھکنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں...... لیکن میں نہیں چاہتا کہ تجھے بھی اپنے ساتھ...... ''مفرور'' بنا کر لے جاؤں......اور ساری عمر پھر تُو پولیس سے چھپتا پھرے۔'' علی بخش اس کی بات کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔

اکو کے ساتھی نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے اکو دھاڑیل کی ہدایت پر فوری عمل کیا تھا کیونکہ اگلے دن ہی ایک سنجیدہ رو شخص جو سیاہ کوٹ اور پینٹ میں ملبوس تھا، وہ آ کر علی بخش سے ملا......اکو دھاڑیل پر اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی......اس نے چند لمحے علی بخش سے کچھ ضروری باتیں پوچھیں اور کچھ اسے ہدایت دیں پھر وہ کسی وکالت نامے ٹائپ کی چیز پر علی بخش کے دستخط وغیرہ لے کر چلتا بنا......بہر طور بعد میں اکو دھاڑیل نے مسکراتے ہوئے علی بخش کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ یہ شخص اس کے دوست وڈیرے رب نواز کا بھیجا ہوا یعنی بندوبست کیا ہوا وکیل تھا جو اس کی (علی بخش) ضمانت اور مقدمہ لڑنے کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا اس نے علی بخش کو تفصیلاً ''برین واش'' کر ڈالا تھا کہ اسے کون سا مؤقف اختیار کرنا ہے......جس کا مختصر لب لباب یہی تھا کہ اس کا دھاڑیل اکو سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ اسے جانتا ہے......لہٰذا اسے محض ایک سازش کے تحت اس کے سوتیلے بھائی اور ماموؤں نے ہوٹل اور دیگر جائیداد وغیرہ سے ''بے دخل'' کرنے کی کوشش کی ہے......اور اس کا ''گٹھ جوڑ'' ایک بدنام دھاڑیل (اکو) سے جوڑا جا رہا ہے......جو سراسر ناانصافی ہے......وغیرہ وغیرہ۔''

لیکن اس سارے معاملے میں تھانے کا انچارج انسپکٹر ارشد لاشاری ذرا ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہا تھا......اور وہ علی بخش پر تشدد کر کے اس سے یہ بیان لینے پر تلا بیٹھا تھا کہ وہ اپنا دیرینہ تعلق اکو دھاڑیل کے ساتھ تسلیم کر لے......یہی وجہ تھی کہ......وہ اس سلسلے میں علی بخش کا مزید پندرہ بیس دن کا عدالت سے ریمانڈ لینا چاہتا تھا......مگر ادھر اکو دھاڑیل کے وڈیرے دوست رب نواز کا دوست وکیل زیادہ مستعد ثابت ہوا جس نے علی بخش کی فوراً عدالت کے ذریعے ذاتی مچلکے پر ضمانت کروا دی......اس دن جیل سے رہا ہوتے وقت علی بخش بہت خوش تھا......مگر تنہا آزاد ہونے پر مغموم بھی تھا......اکو دھاڑیل اس کی افسردگی کی وجہ جانتا تھا لہٰذا اس کا شانہ تھپتھپا کر سرگوشیانہ لہجے میں اس تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''ڈے جوان!......میری گڑتی نہ کر......میں تو نکل ہی آؤں گا کسی طرح سے...... بس تُو شریفوں کی طرح رہا ہو گیا......یہی بہت ہے......ہل بابا ہل، میرا انتظار کرنا......ڈرنا بالکل نہیں۔''

اور یوں جب علی بخش خوش خوش رہا ہو کر......دانستہ بجائے گھر جانے کے بجائے ہوٹل پہنچا تو......حسب توقع محرم علی اور اس کے دونوں ماموں دوست محمد اور محمد علی خوش گپیوں میں مشغول تھے......علی بخش پر نگاہ پڑتے ہی انہیں جیسے بچھو نے ڈنک لیا......وہ تینوں اسے دیکھتے ہی اچھل پڑے......ان کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے تھے جبکہ ہوٹل کے دیگر ملازمین کی کیفیت ذرا برعکس تھی......وہ علی بخش کو صحیح سلامت اپنے سامنے موجود پا کر خوشی سے ''دھمال'' ڈالنے لگے اور ہوٹل کا ریکارڈ بھی تیز آواز میں بجانا شروع کر دیا اور ''ہو جمالو'' کا گیت باآواز بلند گنگنانے لگے......علی بخش کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ جیسے چسپاں ہو کر رہ گئی تھی۔

☆======☆======☆

یہ پُرتعیش اور بیش قیمت اشیاء سے آراستہ ایک شاندار کمرہ تھا جس کی ہر اک شے سے امارت ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی لیکن ایک سوگواریت کا بھی احساس ہوتا تھا......ایک جہازی سائز بیڈ پر اللہ رکھی آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی اس کے سر پر پٹی بندھی تھی...... بے ہوش لیٹی اللہ رکھی کے بالکل سرہانے ایک نازک سی جوان خوبصورت لڑکی بھی بیٹھی اسے اپنے نرم و نازک ہاتھ سے سہلا رہی تھی۔ اس کے ملیح چہرے پہ تفکر آمیز پرچھائیاں سی پھیلی ہوئی تھیں......جس میں دوستانہ حلاوت کی آمیزش بھی بدرجہ اتم موجود تھی......معاً کمرے کا دروازہ کھلا اور سادہ سی ساڑھی میں ملبوس ایک پُروقار سی خاتون نمودار ہوئی...... وہ گوری رنگت کی ایک ادھیڑ عمر عورت تھی......چہرے پر ایک ذمہ دارانہ گہری متانت چھائی ہوئی تھی......''روزی بیٹی! ہوش آیا......اس لڑکی کو......؟'' اس عورت نے اللہ رکھی کے سرہانے فکرمندی بیٹھی لڑکی سے پوچھا۔

''جی ممی! ابھی اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور پانی بھی مانگا تھا......'' روزی نامی لڑکی نے جواب دیا اس کا پورا نام روزینہ تھا اور وہ عورت اس کی ماں تھی......جو ایک معروف ایم پی اے کی بیوہ تھی......اس کا نام......اختر بانو تھا......وہ اب بیڈ کے قریب آ کر......اللہ رکھی کو بغور تکنے لگی......پھر دوبارہ اپنی بیٹی روزی سے بولی۔

''اس کا مطلب کچھ امپرومنٹ ہوئی ہے......اور خطرے والی بات بھی نہیں......''

روزی جواباً چپ رہی۔ اختر بانو قریب دھری ایک کرسی پر بیٹھ گئی......اسی لمحے اللہ رکھی کے بے سدھ وجود میں جنبش سی ہوئی......پھر اس نے کراہتے ہوئے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں کھولیں......چند ثانیے چھت کو گھورتی رہی۔

''ممی، اسے ہوش آگیا ہے۔'' معا روزی اللہ رکھی کو ہوش میں آتے دیکھ کر قدرے خوشی سے بولی۔

''مم...... میں...... کہاں ہوں......؟'' اللہ رکھی جواب ذرا ہوش میں آچکی تھی لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''بہن! تم ہمارے ہاں ہو...... اور بالکل محفوظ ہو......'' روزی نے ملائمت سے کہا...... اللہ رکھی کو پورے وجود میں ناطاقتی سی محسوس ہوئی...... خصوصاً اسے اپنے سر میں شدید اینٹھن اور درد کا احساس ہوا...... اتنا کہ...... بے اختیار اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی...... اسے اپنے ذہن میں دھند سی چھائی محسوس ہونے لگی۔

''بیٹی!...... اب کیسا محسوس کر رہی ہو تم...... ٹھیک تو ہو نا......'' اختر بانو نے معاً کرسی سے اٹھ کر اللہ رکھی کے قریب آتے ہوئے اس سے نرم لہجے میں پوچھا...... اللہ رکھی اب آہستہ آہستہ روزی کا سہارا لیتے ہوئے بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی...... وہ باری باری متحیر نظروں سے پہلے اپنے آس پاس اور پھر دونوں ماں بیٹیوں کا چہرہ تکنے لگی...... اس کے معصوم سے چہرے پر اَن گنت سوالیہ نشان جیسے ثبت ہو کر گئے تھے...... وہ دل و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر کچھ یاد کرنے کی کوششیں کر رہی تھی۔

''مم...... مجھے کیا ہوا تھا......؟'' اس نے کپکپاتے لہجے میں سوال کیا۔

''بہن! تم ہمیں سڑک پر بے ہوش پڑی ہوئی ملی تھیں...... تمہارے سر پہ چوٹ لگی ہوئی تھی......'' روزی نے جواب دیا...... لیکن اللہ رکھی کو جیسے تسلی نہیں ہوئی...... وہ کچھ یاد کرنے کی سعی کرنے لگی مگر کامیاب نہ ہوئی...... ذہن عجیب سی گتھیوں میں الجھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''بیٹی! تمہارا نام کیا ہے؟...... تم کون ہو؟'' اس بار روزی کی ماں اختر بانو نے ملائمت سے اللہ رکھی کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا...... چند ثانیے تو اللہ رکھی انجانے انتشار کا شکار رہی پھر جیسے زور سے چلاتے ہوئے بولی۔

''مجھے نہیں معلوم...... مجھے کچھ یاد نہیں آرہا...... مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔'' اللہ رکھی نے یہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور دونوں ماں بیٹیاں تشویش آمیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب تکنے لگیں۔

☆======☆======☆

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد...... تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو...... کی

تصویر بنا ساون اللہ رکھی کی تلاش میں پورے شہر میں در بدر ہو رہا تھا۔ اس کا باپ موگو دل مسوس کر اور بیٹے کی دیوانگی و فرزانگی سے مجبور ہو کر واپس گوٹھ اپنے لوٹ گیا تھا...... ساون کو اس شہر کی نوردی کرتے آج دوسرا دن تھا...... اسے نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا...... بس ایک دھن سمائی ہوئی تھی کہ اللہ رکھی کو بہر حال ڈھونڈتے ہی رہنا ہے...... جب تک کہ وہ اسے مل نہیں جاتی...... دن پوری طرح نکل آیا تھا۔ دھوپ بھی خاصی تیز تھی...... اور ساون جس شاہراہ پر کھڑا تھا وہ خاصی مصروف تھی۔ معاً ساون کی نگاہِ متلاشی ایک بڑی سی کار پر پڑی اور وہ بری طرح ٹھٹک گیا...... اسے یوں لگا جیسے پوری کائنات اس مذکورہ کار میں سمٹ گئی ہو...... اس نے دیکھا کار کی پچھلی سیٹ پر اللہ رکھی براجمان تھی...... خوشی اور حیرت کے امتزاج نے پہلے ایک لمحے کے لیے اسے گنگ سا کر کے رکھ دیا...... مگر پھر معاً وہ چونکا ادھر کار جب ایک دوسری طرف کی ٹریفک کا موڑ کاٹتی ہوئی اس کے قریب سے گزرنے لگی تو ساون دیوانہ وار کار کے سامنے آگیا...... کار کے بریک زور سے چرچرائے...... ڈرائیونگ سیٹ پر اختر بانو براجمان تھی جبکہ عقبی سیٹ پر اللہ رکھی کے ساتھ اس کی بیٹی روزینہ بیٹھی تھی...... ان دونوں کو زور سے جھٹکا لگا۔

''اے لڑکے...... اندھے ہو تم......؟'' اختر بانو کار کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے اپنا سر ذرا باہر نکال کر ساون کو غصے سے گھورتے ہوئے بولی...... ساون اس اثناء میں...... ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کے نزدیک آگیا تھا۔

''میم صاحب؟...... گاڑی روکیے...... آپ کو اللہ کا واسطہ......'' وہ جیسے گڑگڑایا......

''یہ...... یہ...... میری اللہ رکھی کو کہاں لے جا رہے ہو تم......؟'' اس کی بات پر اختر بانو چونکی...... اور بغور بدحواس ساون کا چہرہ تکنے لگی۔ اتنے میں پیچھے سے آنے والی موٹر گاڑیوں کے ہارن چلانے لگے...... اختر بانو کچھ سوچتے ہوئے کار سڑک کے کنارے لے آئی...... ساون بھی پاگلوں کی طرح کار کے ساتھ ساتھ یوں چپکا رہا جیسے وہ نکل نہ جائے...... روزینہ کے چہرے پر الجھن سی نمودار ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی اللہ رکھی نے بھی ایک اچٹتی ہوئی بے تاثر نگاہ سے ساون کو دیکھا تھا...... خود ساون کو ذرا حیرت سی ہوئی تھی اس بات پر کہ آخر اللہ رکھی اسے دیکھ کر کار سے اتر کیوں نہیں رہی۔ کیا جو میرے اندر اس کے لیے جتنی تڑپ اور پیاس ہے اس سے وہ مبرا ہو چکی ہے......؟ درحقیقت ساون اسے اس شاندار سی گاڑی میں دیکھ کر متحیر بھی تھا...... اختر بانو آپ کار کا دروازہ کھول کر باہر اتر آئی تھی...... آس پاس کے کچھ لوگ انہیں دلچسپ اور پُرشوق نظروں سے تکے جا رہے تھے۔

''تم اس کے کیا لگتے ہو......؟'' اختر بانو نے کچھ سوچتے ہوئے ساون سے پوچھا......وہ اس وقت لائٹ اسکائی کلر کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔

''جی...... وہ...... یہ...... یہ میری اللہ رکھی ہے...... میرے گوٹھ داد پور کی رہواسی ہے......آ......آپ میم صاحب...... اس سے بے شک پوچھ لو......'' ساون کے لہجے میں دیہاتی معصومیت اور بدحواسی تھی...... پھر وہ کار کی دوسری جانب والی عقبی سیٹ کی کھڑکی کی طرف آیا...... جدھر اللہ رکھی چپ اور بے تاثر چہرہ لئے بیٹھی تھی...... اس طرف کا شیشہ نیچے اترا ہوا تھا۔ ''اللہ رکھی!...... تو بولتی کیوں نہیں...... ان لوگوں کو بتا...... کہ ہم کون ہیں......؟'' ساون اللہ رکھی کے گنگ چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے بولا...... لیکن اس وقت ساون کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اللہ رکھی...... اسے پاگل سمجھتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھی...... روزینہ سے چمٹ گئی...... اور وہ ساون کو اجنبی اجنبی اور ڈری ہوئی نظروں سے تکنے لگی جیسے ساون اسے کھا جائے گا...... ساون اللہ رکھی کو خود سے خائف اور انجان دیکھ کر شدید حیرت اور دکھ سے مجہور سا ہونے لگا...... وہ دوبارہ دیوانوں کی طرح اللہ رکھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا...... ''اللہ رکھی؟ تو مجھے نہیں پہچان رہی؟...... مم...... میں...... ساون ہوں تیرا ساون...... تجھے کیا ہوگیا ہے...... اللہ رکھی تو مجھے پہچانتی کیوں نہیں......؟''

...... یہ کہتے ہوئے ساون پاگلوں کی طرح کار کا دروازہ کھولنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا...... صورت حال خاصی عجیب سی ہو رہی تھی جس میں اختر بانو خود کو خجل سا محسوس کرنے لگی...... لہٰذا وہ جلدی سے کار کی دوسری جانب تیز قدموں سے چلتی ہوئی آئی اور قدرے سخت لہجے میں ساون کو مخاطب کر کے بولی۔

''ٹھہرو؟...... لڑکے...... یہ کیا پاگل پن ہے...... اس لڑکی کو پریشان مت کرو یہ بیمار ہے۔''

''نہیں...... تم لوگ جھوٹ بولتے ہو...... تم نے میری اللہ رکھی کو کچھ کھلا دیا ہے۔'' ساون پر واقعی مجنونانہ جنون طاری تھا۔

''لڑکے ہوش کرو...... یہ لڑکی...... اپنی یادداشت کھو چکی ہے...... تم ہمارے ساتھ چلو...... ہم خود اس کے وارثوں کی تلاش میں تھے...... اچھا ہوا تم ہمیں مل گئے......'' اس بار اختر بانو نے قدرے ملائمت بھرے لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا...... تب کہیں جا کر ساون کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ کچھ سوچتی اور کچھ الجھی ہوئی نظروں سے اختر بانو کی طرف تکنے لگا۔

اختر بانو ایک سمجھدار خاتون تھی اسے ساون کی ذہنی کیفیت کا بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا

لہٰذا وہ ساون سے پھر مخاطب ہوئی...... ''دیکھو لڑکے...... تم ہمارے ساتھ چلو...... ہمارے گھر تمہیں ساری بات کا پتہ چل جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے اختر بانو نے حیران پریشان ساون کو کار کی اگلی سیٹ والا دروازہ کھول کر بٹھایا اور خود گھوم کر دوسری جانب...... ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی...... پھر چند لمحوں بعد کار آگے بڑھ گئی...... سارے راستے عجیب سی خاموشی طاری رہی...... یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ بولنا قبل از وقت ہو...... لہٰذا انہوں نے بنگلے تک کا سفر انتہائی خاموشی کے ساتھ کاٹا...... بنگلے کے اندرونی حصے تک آتے ہوئے ساون کی دلی اور دماغی کیفیت عجیب ہو رہی تھی...... اس عرصے میں وہ اللہ رکھی کے معصوم چہرے کی طرف ہی تکتا رہا تھا کہ شاید وہ ایک شناسا سی چیخ کے ساتھ اس سے لپٹ جائے...... اور اس سے کہہ دے کہ ''ساون! تم کہاں کھو گئے تھے......؟...... میری نگاہیں تو تمہیں دیکھنے کو کب سے ترسی ہوئی تھیں۔'' لیکن ایسا نہ ہوا۔ اللہ رکھی تو بلکہ الٹا ساون سے ڈری سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر شناسائی کی رمق تک نہ آئی تھی...... پھر وہ سب ایک بڑی سی پیراستہ نشست گاہ میں آکر بیٹھ گئے...... ساون اس شہری طرز کے ماحول میں خود کو عجیب سا محسوس کر رہا تھا...... روزینہ اللہ رکھی کو دوسرے کمرے میں چھوڑ کر اب اپنی ماں اختر بیگم کے ساتھ فیملی سائز کے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور خاصی پُرشوق نگاہوں سے ساون کی جانب تکے جارہی تھی...... اس کا شوخ ذہن خود بہ خود ایک معصوم مگر دلچسپ ٹریجڈی کی توقع کئے بیٹھا تھا۔

''ہاں...... بیٹے!...... اب بتاؤ...... کہ یہ لڑکی جسے تم اللہ رکھی کے نام سے پکار رہے تھے کون ہے...... اور تم اسے کیسے جانتے ہو......؟'' بالآخر اختر بیگم نے ساون سے نرم اور دھیمے لہجے میں استفسار کرنے کی ابتداء کی...... اس دوران ایک ملازمہ بیش قیمت صوفوں کے بیچ رکھی شیشے کی ٹاپ والی لمبی اور مستطیل ٹیبل پر خورد و نوش کی کچھ اشیاء سرو کر کے چلی گئی...... ساون نے اختر بیگم کی بات سن کر لمحہ بھر کسی سوچ میں غلطاں رہنے کے بعد...... انہیں محض اس حد تک اللہ رکھی سے متعلق تفصیل بتائی کہ...... وہ چاچی عنایتاں کو بہ غرض علاج شہر کے ہسپتال داخل کرانے کے لیے گوٹھ سے یہاں لائے تھے...... ادھر وہ یعنی ساون کچھ دوائیاں لینے شہر کی طرف نکل گیا اور جب لوٹا تو اللہ رکھی کو وہاں نہ پا کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ مزید یہ کہ اس عرصے میں چاچی عنایتاں کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور اس کی لاش ابھی تک ہسپتال میں موجود تھی...... دونوں ماں بیٹیوں کو ساون کی دکھ بھری کہانی جان کر خاصا رنج ہوا...... بہرطور پھر بعد میں انہوں نے بھی ساون کو یہ بتایا کہ کس

طرح...... ایک سرد اور ٹھٹھرتی ہوئی اندھیری رات میں اللہ رکھی انہیں زمین پر بے ہوش اور زخمی پڑی ہوئی ملی تھی...... جس کی بعد میں یادداشت جاتی رہی تھی...... انہوں نے ساون کو اس بات کی بھی تسلی دی کہ اللہ رکھی کا ایک مشہور ماہر دماغی امراض سے علاج چل رہا ہے۔ جس نے اللہ رکھی کی اچانک یادداشت چلی جانے سے متعلق اچھی توقعات رکھنے کی خوش کن خبر دی ہے...... لہٰذا...... یہ سب باتیں ساون کو بتانے کے بعد اختر بانو جو فطرتاً ایک نیک دل خاتون تھیں...... ساون سے گزارش کے طور پر اس نے یہ بھی کہا کہ...... اگر اس کو اعتراض نہ ہو تو اللہ رکھی کو کچھ عرصے تک اس کے پاس ہی رکھا جائے تا کہ اس کا علاج مکمل اور صحیح طور پر جاری رہ سکے۔

''ساون بیٹا!...... تم بے فکر رہو...... اللہ رکھی میرے پاس بیٹیوں کی طرح رہے گی......'' اختر بانو نے آخر میں نرم لہجے میں ساون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور...... میں نے اسے اپنی بہن اور سہیلی بھی بنا لیا ہے...... میری اور کوئی بہن جو نہیں......'' روزینہ نے بھی اپنے حصے کا لقمہ دینا ضروری سمجھا...... اور ساون ان دونوں ماں بیٹیوں کی بات بہ غور سننے کے بعد سوچنے لگا کہ...... یہ لوگ درست ہی کہہ رہے تھے......

ساون کو اللہ رکھی کی اس اچانک پلٹنے والی ذہنی رو پر بہت زیادہ رنج ہوا تھا...... اسے اس بات پر حیرت اور خاصی پریشانی بھی ہوئی تھی کہ اللہ رکھی ہسپتال سے نکل کر...... آخر اس علاقے میں کس طرح پہنچی تھی یا لائی گئی تھی...... جو بعد میں ان شریف لوگوں کو اندھیری ٹھٹھرتی رات میں زخمی حالت میں ملی تھی...... ویسے اختر بانو نے ساون کو اللہ رکھی سے متعلق ''تسلی بخش'' گفتگو گوش گزار کر دی تھی...... اب ساون یہی سوچ رہا تھا کہ اللہ رکھی کو اگر وہ اپنے ساتھ دوبارہ گوٹھ لے جانا بھی چاہے تو وہ ہرگز اس کے ساتھ جانے پر تیار یا راضی نہ ہو گی...... کیونکہ وہ (ساون) اب اس کے لیے اجنبی تھا...... اللہ رکھی کی یادداشت محو ہوتے ہی...... ساون کی شبیہ بھی اس کے ذہن سے دھندلا چکی تھی اور اب وہ ان لوگوں کو ہی اپنا ہمدرد تصور کرنے لگی تھی...... لہٰذا ساون اللہ رکھی کو وہاں رکھنے پر معترض نہیں ہوا...... ویسے اختر بانو اور ان کی بیٹی روزینہ اسے شریف اور خدا ترس انسان محسوس ہوئے تھے...... ورنہ کون آج کل ایک پرائی لڑکی کے ساتھ اتنی بے لوث و بے غرض ہمدردی کرتا ہے......

بالآخر ساون نے اللہ رکھی کو...... جب تک اس کا علاج چلتا ہے...... انہی کے پاس ہی رہنے دینے کی حامی بھر لی...... وہ دونوں ماں بیٹیاں ساون کے فیصلے پر کھل سی گئیں...... قصہ کوتاہ...... ساون وہاں سے لوٹ آیا...... اب اس کا ارادہ اپنے گوٹھ داد پور کی لاری

پکڑنے کا تھا۔

☆======☆======☆

مائی رحمت کی گردن خانو دھچر نے سختی سے دبوچ رکھی تھی...... اور اس بے چاری کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں سی نکل رہی تھیں...... اور وہ بری طرح خود کو خانو دھچر کے شکنجے سے چھڑانے کی ناکام سعی بھی کیے جا رہی تھی...... اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر کو ابل رہی تھیں۔ ''بتا حرام زادی...... کہاں بھگایا ہے تُو نے اس چھوکری اللہ رکھی کو......'' خانو دھچر خونخوار نظروں سے جاں بلب مائی رحمت کو گھورتے ہوئے غرایا...... وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔ قریب ہی منشی میرل بھی کھڑا تھا...... وہ خاصا متفکر اور پریشان نظر آ رہا تھا...... اللہ رکھی کے فرار نے اسے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا...... تاہم خانو دھچر کی طرح اسے بھی مائی رحمت پر پورا شبہ تھا کہ اللہ رکھی کو فرار کرانے میں اس کا پورا پورا ہاتھ تھا...... مگر جب اس نے دیکھا کہ خانو دھچر...... اس کی جان لینے پر تلا ہوا ہے تو وہ اسے بولا۔

''خانو...... ہٹ ذرا ہولا رکھ...... کہیں یہ کمینی مر ہی نہ جائے......''

''میں اسے مار کر ہی دم لوں گا...... منشی سائیں...... اس کمینی نے ہماری پیٹھ پہ خنجر گھونپا ہے......'' خانو دھچر غیظ آلود لہجے میں بولا...... تخاطب منشی میرل ہی تھا۔

''اڑے بابا...... اتنا کافی ہے...... اس کمینی کے لیے...... اب چھوڑا اسے...... کچھ بتانے تو دے اسے......'' منشی میرل نے خانو دھچر کو متنبہ کیا تو خانو نے ایک جھٹکے سے مائی رحمت کی گردن چھوڑ دی...... وہ بے چاری نڈھال سی ہو کر کئی قدم پیچھے کو لڑکھڑا گئی...... وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کی اینٹھن کو سہلانے لگی...... اس کی آنکھوں میں خوف اور برہمی کی عجیب سی ملی جلی آمیزش تھی۔

''بتا...... اب...... ورنہ اس بار تری گردن دبوچ کر ہی دم لوں گا......'' خانو دھچر دوبارہ اسے دھمکاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور حالت اس کی اس کتے جیسی ہو رہی تھی جو اپنے ہی زخموں پر خارش زدہ ہو رہا ہوتا ہے۔ ''بتاتی کیوں نہیں حرام زادی...... کیا پھر تیری گردن پکڑوں......'' خانو پھر اس کی جانب بڑھا تو مائی رحمت زور سے ہذیانی انداز میں چلاتے ہوئے بولی۔

''مجھے نہیں معلوم...... میں بے قصور ہوں...... میں نے اللہ رکھی کو نہیں بھگایا......''

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ خانو دھچر پھر آپے سے باہر ہونے لگا اور بڑے جاحانہ انداز میں ایک بار پھر اسے دبوچنے کے لیے اس کی طرف بڑھا۔

''ٹھہرو...... خانو...... چھوڑ دو اسے کوئی فائدہ نہیں اس کا......'' منشی میرل، خانو کی خونخوار آنکھوں میں خطرناک عزائم کو بھانپتے ہوئے بہ آواز بلند اسے مخاطب کر کے بولا......

خانو دھچر کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے تھے۔ ''جا...... ڑی...... توں...... اندر دفع ہو۔'' منشی میرل نے جیسے مائی رحمت کی گلوخلاصی کروائی اور ڈری سہمی مائی رحمت کے لیے منشی میرل کی جھڑکی جیسے پروانہ راہداری ثابت ہوئی اور وہ فوراً وہاں سے کھسک گئی۔

''منشی سائیں! یہ کیا کیا تم نے...... اسے یونہی جانے دیا......'' خانو دھچر کے لہجے میں شکایت تھی۔

''اڑے بابا؟...... کیا فائدہ...... اس کا...... اگر بتا بھی دیا تو...... بھلا پھر بھی اسے یہ تو معلوم نہیں ہوگا نا...... کہ اللہ رکھی اس وقت کہاں ہوگی...... ویسے مجھے لگتا ہے...... یہ بے قصور ہی ہے......'' منشی میرل نے گویا خانو دھچر کا غصہ سرد کرنے کی غرض سے کہا...... لیکن خانو دھچر کے غصے میں پھولے ہوئے چیچک زدہ سیاہ رو...... چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ منشی میرل کی بات سے مطمئن نہ تھا۔ شاید منشی میرل بھی یہ تاثر تاڑ گیا تھا لہٰذا بولا۔ ''اڑے خانو...... اب آگے کی سوچ کیا کیا جائے...... میں تو کہتا ہوں کہ اسے خود ہی شہر میں تلاش کرنا چاہیے یہ کوئی اتنا بڑا شہر بھی نہیں...... آخر کو اللہ رکھی جوان اور خوبصورت چھوکری ہے کہیں نہ کہیں سے اس کا سراغ ضرور مل جائے گا......''

''سائیں! آدمی تو میں نے دوڑا ہی دیئے ہیں...... ویسے تمہاری بات بھی درست ہے...... ہمیں خود بھی اپنے طور پر اس چھوکری کی تلاش میں نکلنا چاہیے...... مجھے لگتا ہے وہ ہمیں مل جائے گی......'' خانو دھچر بالآخر منشی میرل کی بات سے متفق ہوتے ہوئے بولا......

''اچھا خاصا پھل جھولی میں آگرا تھا......'' وہ آخر میں بڑبڑایا...... اس کے لہجے میں پچھتاوے کی جھلک تھی۔

☆======☆======☆

یہ حقیقت تھی کہ روزینہ نے اللہ رکھی کو ایک بہن اور سہیلی کی طرح رکھا ہوا تھا...... نرم و نازک اور معصوم گڑیا جیسا حسن رکھنے والی اللہ رکھی...... اسے بالکل گڑیا کی طرح لگتی تھی۔ در حقیقت روزینہ بچپن سے ہی ایک تنہائی سی محسوس کرتی آئی تھی جس میں سرفہرست باپ کا خلا تھا اور بعد میں بہن اور بھائی کا...... ایک ماں اختر بانو ہی تھی جس کے سہارے اس کی شخصیت سنبھلی ہوئی تھی ورنہ تو وہ بالکل شخصی لحاظ سے ٹوٹ کر بکھر چکی ہوتی۔ اس کے والد کو اس کے بچپن میں ہی کسی نامعلوم قاتل نے سیاسی مخاصمت کی بناء پر ہلاک کر ڈالا تھا۔ وہ

طویل عرصے تک ایم پی اے رہے تھے...... محمد ایوب سومرو ان کا نام تھا اور وہ انٹیریئر سندھ کے ایک معروف سیاستدان کہلاتے تھے...... بہر طور...... ایسے ہی حالات دگرگوں نے روزینہ کے چہرے پر بلکہ اس کی پوری شخصیت کے ایک عجیب اور ناقابل بیان سی مہر سکوت ثبت کر کے رکھ دی تھی...... لیکن اب بھولی بھالی بالکل گڑیا سی اللہ رکھی کی صورت میں اسے گویا ایک کھلونا مل گیا تھا...... جس کے معصوم چہرے پر اسے بیک وقت بہن اور سہیلی کا بھی عکس نظر آتا محسوس ہوتا تھا...... اب تک وہ یہی سمجھتی آئی تھی کہ اللہ رکھی دنیا میں اکیلی ہے...... لیکن ساون کے اچانک منظر عام پر آنے سے وہ کچھ اداس سی ہوگئی تھی...... لیکن یہ بات بھی اسے معلوم ہی تھی کہ جب تک اللہ رکھی کی یادداشت لوٹ کر نہیں آتی...... وہ اسی کے پاس رہنے پر مجبور تھی...... مگر اس کے ساتھ ساتھ نازک اندام روزینہ...... ساون کی بتائی ہوئی باتوں کے ایک اہم پہلو کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کے نازک اور خفتہ جذبات میں حسرت انگیز چٹکیاں لے رہا تھا...... وہ نازک پہلو ساون اور اللہ رکھی کے بیچ پنپنے والا ایک جذبہ تعلق خاطر کا تھا...... جس نے روزینہ کے خانۂ دل کے نرم گوشوں کو جھنجھوڑ ڈالا تھا...... وہ اللہ رکھی اور ساون کو اپنے معیار دل کے مطابق خوش قسمت متصور کر رہی تھی کہ وہ دونوں کسی حد تک ایک دوسرے کو چاہتے ہیں...... یقیناً جتنا ساون اللہ رکھی کو چاہتا تھا، اتنا ہی اللہ رکھی بھی اسے چاہتی ہوگی...... جبھی تو ساون دیوانوں کی طرح اللہ رکھی کو اس بھرے پُرے اجنبی شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا تھا تاہم روزینہ کو اس انوکھی ٹریجڈی پر افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اللہ رکھی...... اب اپنے محبوب ساون کو پہچاننے سے قاصر ہو چکی تھی...... اسے ان کی معصوم سی کہانی دلچسپ بھی محسوس ہو رہی تھی...... جو اس کے لیے ایک اعلیٰ نصاب کا درجہ رکھتی تھی...... ایک درس وفا کا درجہ...... پھر پتہ نہیں کیوں روزینہ کو سیدھا سادہ دیہاتی سا نوجوان اچھا محسوس ہونے لگا اور معاً ہی ایک خیال نے جیسے اس کے من میں چٹکی سی بھری اور اس کا صبیح چہرہ یکدم سرخ ہوگیا۔

☆======☆======☆

علی بخش ضمانت پر کیا رہا ہو کر آیا کہ اس کی سوتیلی ماں خیراں اور اس کے دونوں چہیتے بھائی دوست محمد اور محمد علی، بیٹا محرم سمیت سب کو جیسے سانپ سونگھ کر رہ گیا...... وہ علی بخش کو ایسی عجیب عجیب سی نظروں سے تکنے لگے تھے جیسے وہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہو...... جبکہ علی بخش ان کی اس ہیئت کذائی سے محظوظ ہو رہا تھا اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے ایک بار پھر ان سب سانپوں کا زہر نکال دیا ہو...... اور اب وہ محض خالی پھنکاریں

مارنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ علی بخش اب خود کو ان لوگوں کے ساتھ قوی تر اور طاقت ور محسوس کرنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب ہوٹل سے لے کر گھر تک اکڑتا پھر رہا تھا...... تاہم اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ اسے گرفتار کرانے میں انہی لوگوں کا ہاتھ تھا مگر علی بخش...... اکو دھاڑیل کی ہدایت کے مطابق ان پر یہ ابھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ یعنی علی بخش ان کی سازش کا شکار ہو کر حوالات جا پہنچا تھا کیونکہ اکو دھاڑیل نے علی بخش کو اس بات کی تسلی دی تھی کہ...... اس کی ضمانت ہوتے ہی وہ خود بھی زیادہ عرصے حوالات میں نہیں رہ سکتا...... جب وہ باہر آئے گا تو اس بار اس کی سوتیلی ماں خیراں اس کے دونوں بھائیوں اور بیٹے کو ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ ساری زندگی...... یاد رکھیں گے...... پھر بھی اکو دھاڑیل نے اسے چوکنا رہنے کی تاکید کی تھی...... یہی وجہ تھی کہ جب علی بخش رہا ہو کر پہلی بار گھر آیا تو اس کی ماں خیراں نے چہرے پر بظاہر دنیا جہان کی ممتاؤں کا بہروپ بھرتے ہوئے رسماً اس کی بلائیں لینی چاہیں تو علی بخش نے نفرت اور نخوت سے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا تھا...... اور یہی سلوک اس نے اپنے دونوں سوتیلے ماموؤں اور بھائی محرم علی سے بھی کیا تھا جو اسے جیل سے رہا ہوتا دیکھ کر محض رسماً اور خود کو اس کا خیر خواہ ظاہر کرتے ہوئے اسے مبارکباد دے رہے تھے...... علی بخش اب انہیں ایسی تیز نظروں سے گھورتا تھا جیسے موقع ملتے ہی وہ انہیں چیر پھاڑ دے گا...... بہر طور اب علی بخش واقعی اپنا ایک طاقت ور اثر ان کے سازشی دماغوں پر قائم کر چکا تھا۔

علی بخش کو ایک دن اچانک اللہ رکھی کا خیال آیا...... تب اس نے سوچا کہ ابھی تو ایک اور حساب بھی چکتا کرنا ہے...... اور وہ تھا اپنے مرحوم باپ دودا خان کی لج اللہ رکھی کو اس گوٹھ کے کسی شخص سے نہ بیاہے گا...... اور وہ اس سلسلے میں کئی روز پہلے...... بہ زور دھمکی ...... اس کی چاچی عنایتاں کے کانوں میں یہ چتونی ڈال آیا تھا کہ...... وہ اپنی بھتیجی اللہ رکھی کو گوٹھ سے باہر بیاہے...... ورنہ...... اور اس ورنہ کے بعد علی بخش لوٹ آیا تھا...... اب اللہ رکھی کا خیال آتے ہی...... اس کی نظروں کے سامنے ساون کا بھی چہرہ گھوم گیا...... اور تب اس کا دل و دماغ جاہلانہ غیظ و غضب کی آگ میں سلگنے لگا...... ''ساون...... میرے جیتے جی تُو اللہ رکھی سے شادی نہیں کر سکتا...... اس لیے کہ وہ میرے باپ کی لج...... اور میرے لیے ہونے والی ماں کا درجہ رکھتی تھی......'' وہ غصے سے دانت اپنے بھینچ کر بڑبڑایا...... اسی دوران جب اس کے کانوں میں افواہ بھی پڑی کہ...... ساون اللہ رکھی، چاچی عنایتاں سمیت کافی روز سے ایک ساتھ ہی پُراسرار طور پر غائب ہیں تو وہ آگ بگولا سا ہو گیا......

اس نے اسی وقت شہر جا کر...... اللہ رکھی اور ساون کو تلاش کرنے کی ٹھانی...... مگر پھر اچانک یوں ہوا کہ جس طرح ساون کے اچانک گوٹھ سے اللہ رکھی سمیت غائب ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی...... اسی طرح اب اس کی اچانک پُراسرار واپسی کی خبر بھی پھیلتی چلی گئی...... مگر اس بار ساون کی واپسی سے متعلق ایک سنسنی خیز، پہلو یہ وابستہ تھا کہ اس کے ہمراہ اللہ رکھی نہ تھی...... حالانکہ اس کے اور اللہ رکھی کے درمیان معاشقے کا قصہ گوٹھ کے ہر شخص کی زبان پر عام ہو چکا تھا...... علی بخش نے جو یہ سنا تو اس نے اسی وقت اپنے جسم پر اجرک اوڑھی کلہاڑی کاندھے پر ٹکائی...... اور ساون کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

علی بخش کو ساون راستے ہی میں مل گیا تھا۔ اس وقت مطلع صاف تھا مگر ہلکی ہلکی سرد فضا سے پتہ لگ رہا تھا کہ آج غضب کا جاڑا اترے گا...... ساون نے موٹی سی چادر اوڑھ رکھی تھی اور سر پر شیشوں کے کام والی سرخ ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ ان کے بائیں پہلو پر تل اور منگ کے کھیت پھیلے ہوئے تھے جبکہ دائیں جانب کچے مکانوں کی بے ترتیب قطاریں تھیں...... اطراف کا ماحول خاصا ویران تھا۔

وہ دونوں اچانک ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹک سے گئے تھے دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ علی بخش کی آنکھوں میں معاندانہ چمک لہریں مار رہی تھی جبکہ ساون عجیب اور الجھی ہوئی نظروں سے اس کی جانب تکنے لگا...... وہ شاید علی بخش کی آنکھوں سے کچھ بھانپنے کی سعی کر رہا تھا۔

''ساون! اللہ رکھی کہاں ہے؟'' ...... بالآخر علی بخش نے اپنی برماتی ہوئی نظریں ساون کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ساون ایک لمحے کو اس کی بات پر چونکا لیکن پھر اسے تعجب ہوا کہ آخر علی بخش اللہ رکھی کے بارے میں کیوں استفسار کر رہا ہے۔ اسے کیا دلچسپی ہے۔ ساون چونکہ اس بات سے بے خبر تھا کہ علی بخش اپنے باپ دودا خان کے مرنے کے بعد اللہ رکھی کے گھر آیا تھا اور چاچی عنایتاں کو متنبہ کیا تھا کہ وہ اللہ رکھی کی شادی اب گوٹھ سے باہر کرے...... کیونکہ وہ اس کا باپ کی منگ تھی۔ اللہ رکھی نے ساون کو اس بات سے بے خبر رکھنا ہی مناسب سمجھا تھا تا کہ ساون اور علی بخش کے درمیان کسی قسم کا فساد نہ بپا ہو، بہر حال اس بات کو ظاہر تو ہونا ہی تھا سو آج یہ ظاہر ہو گئی۔ جب علی بخش نے جارحانہ انداز میں اس کا راستہ روکتے ہوئے اللہ رکھی کے بارے میں اس سے استفسار کیا تو ساون کا متعجب ہونا ایک فطری امر تھا۔

''میں...... سمجھا نہیں علی بخش کہ تُو اللہ رکھی کے بارے میں مجھ سے اس طرح کا سوال کیوں کر رہا ہے۔'' بالآخر ساون نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرسراتے لہجے

میں کہا تو علی بخش کی تیوری پر پڑے ہوئے بل مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔

''ساون! یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں پوچھتا ہوں اللہ رکھی کہاں؟'' علی بخش نے دوبارہ درشت اور بلند لہجے میں کہا تو ساون کو بھی غصہ آ گیا وہ چند قدم اور آگے بڑھتے ہوئے جواباً غیظ آلود لہجے میں بولا۔

''تو پھر میرے بھی یہ سوال کا جواب نہیں کہ تُو اللہ رکھی کے بارے میں مجھ سے ایسا سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔''

علی بخش کی آنکھوں میں درشتگی اور گہری ہوگئی ...... ساون نے بھی بدستور اپنی تیز نگاہیں علی بخش کے چہرے پر گاڑے رکھی تھیں۔ علی بخش کا ہاتھ اپنی کلہاڑی کی جانب رینگنے لگا تو ساون کی آنکھوں میں یکا یک تعجب در آیا اسی لمحے علی بخش نے گویا آخری بار ساون سے کھرکھراتے لہجے میں کہا۔ ''تُو جانتا ہے اچھی طرح سے کہ اللہ رکھی میرے باپ دودا خان کی منگ تھی ...... لہٰذا اب وہ کسی بھی صورت میں گوٹھ پر کسی دوسرے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی، نہ ہی شادی کر سکتی ہے۔ یہ ہمارے رواج کی بات ہے ...... بابا ...... اس لیے میں تجھے خبردار کرتا ہوں کہ اب اللہ رکھی سے شادی کا خیال بھی تُو اپنے دل میں نہ لانا۔'' علی بخش کی صراحت بھری گفتگو نے ایکا ایکی ساون کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

لمحہ بھر توقف کے بعد وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ ''علی بخش! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جو کہانی تم نے مجھے اپنے باپ کے متعلق سنائی ہے اس میں کتنی صداقت ہے۔ تمہارے باپ کا تعلق محض یک طرفہ پسند کی حد تک تھا ...... کوئی باقاعدہ منگنی وغیرہ کی رسم نہیں ہوئی تھی۔''

''میرے باپ نے اللہ رکھی کے سنگ کے سلسلے میں اس کے چاچا سوڈھل کو ایک خاص رقم ادا کی تھی، اس سے بڑھ کر اور کون سی رسم ہو سکتی ہے۔'' علی بخش اسے گھورتے ہوئے بولا۔

ساون بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''چاچا سوڈھل کو تو اللہ جنت نصیب کرے ...... اس نے مجھ سے بھی پچاس ہزار لئے تھے ...... اسی سلسلے میں لیکن سوڈھل کے قتل کے بعد اس کی بیوی عنایتاں نے وہ روپے تمہاری ماں کو فوراً لوٹا دیئے تھے۔''

''بکواس کرتا ہے تُو ......'' علی بخش غصے سے دھاڑا ...... تو ساون بھی ہتھے سے اکھڑ گیا اور اسی لہجے میں بولا۔

''میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں علی بخش ...... زبان سنبھال کر بات کر میرے

ساتھ ...... تجھے میری بات کا یقین نہیں تو جا اپنے ماڑیلے (سوتیلے) بھائی محرم علی کی ماں سے پوچھ جو چاچی عنایتاں سے روپے لے کر کھا گئی ہے ...... اور تجھے بتایا تک نہیں ......''

ساون کی اس بات نے علی بخش کو متردد اور قدرے خفیف سا کر دیا ...... یہ حقیقت تھی کہ اسے خیراں نے رقم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو اللہ رکھی کی چاچی عنایتاں، دودا خان کے مرنے کے بعد اسے لوٹا گئی تھی۔

کئی لمحے تو علی بخش کے چڑھے ہوئے تیوروں پر بل پڑے رہے پھر دھیرے دھیرے وہاں طیش کی جگہ سوچ کی لکیریں نمودار ہوتی چلی گئیں۔ اس وقت اس کی درشت نظروں کے سامنے ساون کی بجائے اپنی لالچی سوتیلی ماں خیراں کا چہرہ محوِ گردش ہو گیا ...... اس نے اپنے دانت بھینچ لئے۔

ساون ذرا دیر اسے گومگو میں مبتلا دیکھتا رہا پھر اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے قدم آگے بڑھائے تو اس کی سماعت سے دوبارہ علی بخش کی گونجدار آواز ٹکرائی ...... ''ٹھہرو ساون! میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔''

ساون کے بڑھتے قدم رک گئے ...... مگر ساتھ ہی اسے اپنا دماغ گرم ہوتا محسوس ہوا ...... اس نے پُرتپش نظریں علی بخش کے چہرے پر گاڑ دیں ...... جس میں دعوتِ جنگ کے تاثرات نمایاں تھے جبکہ علی بخش اس کے اس انداز سے مرعوب ہوئے بغیر سخت لہجے میں مخاطب ہوا ...... ''کچھ بھی ہو ...... میں نے تجھ سے جو کہنا تھا سو کہہ دیا ہے ...... آئندہ محتاط رہنا ...... ورنہ ......'' علی بخش دانستہ اپنا فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگا اور جب وہ مثلِ آتش فشاں سلگتے ہوئے ساون کے قریب سے گزرنے لگا ...... تو اچانک ساون نے اس کا راستہ روک لیا اور قہر بار نظروں سے علی بخش کو گھورتے ہوئے بولا۔

''علی بخش! ...... بالکل اسی طرح تیرا باپ دودا خان ...... بھی مجھے اللہ رکھی کے راستے سے ہٹ جانے کا کہتا تھا ...... مگر وہ یہ حسرت لئے اس دنیا سے سدھار گیا ...... اب تم بھی وہی غلطی کر رہے ہو۔'' یہ کہہ کر ساون آگے بڑھ گیا ...... تو اسے اپنے عقب سے علی بخش کی چنگھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ساون! میں کل تک تجھے موقع دے رہا ہوں اگر کل تک اللہ رکھی گوٹھ نہ پہنچی تو میں تجھے اس کے ساتھ ''کارو'' کر کے مار ڈالوں گا ......'' ساون اس کی دھمکی کو سنی اَن سنی کر کے آگے بڑھتا رہا۔

☆======☆======☆

ساون کی گوٹھ واپسی سے متعلق دبی ہوئی چہ میگوئیاں پھر سے بیدار ہوگئی تھیں، اگرچہ ساون نے گوٹھ کے لوگوں کو ساری حقیقت بلاکم وکاست بتادی تھی کہ چاچی عنایتاں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی......اور اسے راتوں رات شہر کے ہسپتال لے جانا پڑا تھا مگر پھر بھی وہ جان بر نہ ہوسکی تھی......علاوہ ازیں اللہ رکھی ایک حادثے میں اپنی یادداشت کھو چکی ہے اور اس کا شہر میں علاج چل رہا ہے وغیرہ......کہنے کو تو یہ چند الفاظ تھے......لیکن گند میں بیٹھنے والی مکھیوں کو ان سیدھے سادے لفظوں میں بھی گند ہی نظر آیا لیکن ساون کو اس کی ذرہ برابر بھی پروانہ تھی......کہ لوگ اس کی باتوں کا اعتبار بھی کر رہے ہیں یا نہیں......وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھا......مگر اب علی بخش جیسی ٹیڑھی شخصیت نے اسے کسی حد تک الجھا ضرور دیا تھا تاہم وہ اللہ رکھی کے حصول کے سلسلے میں ہر طرح کی رکاوٹوں کو عبور کرنے کا عزم صمیم کر چکا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کے حوصلوں کے بادبان......اب تک تند و تیز طوفانی ہواؤں کے سامنے سینہ سپر تھے......اور سفینۂ وفا یونہی بحر الفت میں اپنی منزل محبت کی جانب رواں دواں تھا۔

ابھی ساون، علی بخش کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اسے اوطاق سے وڈیرے لکھ میر کا بلاوا آگیا......اس وقت گھر میں اس کا باپ موگو موجود نہ تھا......البتہ ساون کی ماں اور بہن ہدایتاں بے چاری پریشان سی ہوگئیں۔

''امڑ! تو پریشان نہ ہو......میں ابھی آجاؤں گا......'' اس نے اپنی ماں کو تسلی دی اور اوطاق جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''پٹ! اپڑیں پیو کو ذرا آجانے دیتا......میرا مطلب ہے تم دونوں ساتھ چلے جاتے اوطاق تو اچھا تھا......'' اس کی ماں تفکر بھرے لہجے میں بولی تو ساون بہ ظاہر بے فکری سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''نہیں امڑ!......میں خود اکیلا ہی وڈیرے سائیں سے مل آتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ مجھے کیوں بلا رہا ہے۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا اور پھر وہ اپنی ماں کو حیران پریشان چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

''ہاں......بابا......ساون! یہ میں کیا سن رہا ہوں......؟'' اوطاق پہنچتے ہی وڈیرے نے جارحانہ قسم کا سوال داغا......اس کی آنکھوں میں خاصی درشتگی نظر آرہی تھی۔

ساون وڈیرے کے سوال پر ایک لمحہ کو گڑبڑا سا گیا۔ لہٰذا مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''میں سمجھا نہیں سائیں......؟''

''ہونہہ......تو نہیں سمجھا......'' وڈیرے کے لہجے میں استہزائیہ غراہٹ تھی......اور آنکھوں میں انتہا درجے کی برہمی۔ ساون نے وڈیرے کے درشت چہرے سے اپنی نگاہیں نہیں ہٹائی تھیں۔

''دو دن شہر کی ہوا لگ گئی ہے تو بہت چالاکی آگئی ہے تیرے کو چھوکرا......میں اللہ رکھی کی بات کر رہا ہوں......جسے تو شہر بیچ آیا ہے......'' وڈیرا گرج دار لہجے میں بولا۔

ساون کے وجود میں ان لفظوں نے جیسے آگ سی بھر دی......کسی اور نے اگر یہ توہین آمیز الفاظ نکالے ہوتے تو ساون اب تک اس کا منہ توڑ چکا ہوتا......تاہم وہ اپنی آنکھوں میں ابھرنے والی برہمی اور لہجے میں در آنے والی کاٹ کو چھپا نہ سکا......''وڈیرا سائیں!......آپ نے بغیر تصدیق کے......مجھ پر ایسا شرمناک الزام لگا دیا......کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے آپ کے دماغ میں اتنی گندی بات ڈالی ہے۔''

''اڑے چپ کر......پورا گوٹھ یہ بات کہہ رہا ہے......خود میرے آدمی شہر جا کر یہ خبر لائے ہیں۔'' وڈیرا اس کی بات سن کر گرج کر بولا۔

''تو پھر سائیں......آپ کو غلط اطلاع دی گئی ہے......سچ یہی ہے کہ......'' پھر ساون نے چاچی عنایتاں کی بیماری اور وفات سے لے کر اللہ رکھی کی محو یادداشت کے بارے میں ساری کتھا دہرادی اور یہ بھی گوش گزار کر دیا کہ اللہ رکھی کا ایک دماغ کے ڈاکٹر سے علاج چل رہا ہے اور وہ مخیّر اور شریف لوگوں کے درمیان بالکل خوش وخرم رہ رہی ہے۔

وڈیرا لکھ میر خان غور سے اس کی ساری رام کہانی سنتا رہا......پھر کئی رنگ اس کے سرخ وسپید مگر جھری دار چہرے پر آکر گزرتے رہے۔ اس کے بعد وہ ایک لمبی ''ہوں'' خارج کر کے ساون کو برماتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''ساون! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اس کا ثبوت دو......اس گھر کا مکمل پتہ مجھے بتاؤ......میں اپنے طور پر بھی تسلی کرنا چاہتا ہوں......''

وڈیرے کی بات پر ساون ایک لمحے کو چپ سا ہوگیا......وڈیرا بغور اسے گھورنے لگا......پھر اسے خاموش پا کر بولا......اس بار اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ ''دیکھ ساون! اس میں تیرا اپنا بھی بھلا ہے......جب میری تسلی ہو جائے گی کہ تیری بات درست ہے تو پھر گوٹھ کے لوگوں کی بھی تسلی ہو جائے گی اور ان کے منہ بھی بند ہو جائیں گے......ورنہ لوگ تیرے کان کھا جائیں گے طعن وتشنیع کر کے......اس طرح گوٹھ میں فساد پھیلنے کا بھی خدشہ ہے......''

وڈیرے نے چند ثانیے خاموشی اختیار کی پھر دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''میں گوٹھ کا وڈیرا ہی

نہیں...... بلکہ مکھ بھی ہوں...... اسی طرح گوٹھ کی بے سہارا عورت یا لڑکی کو تحفظ کی چھت فراہم کرنا میری ذمہ داری ہے......''

سادہ لوح ساون بہ ظاہر چپ تھا مگر دماغ میں اس کے وڈیرے کا ایک ایک لفظ گردش کررہا تھا اسے وڈیرے کی باتوں میں منفی اور مثبت دونوں ہی پہلو نظر آرہے تھے اور خود وہ الجھ کررہ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آیا وہ وڈیرے کو اختر بانو کے بنگلے کا پتہ بتا دے یا نہیں۔ درحقیقت وہ اس گھناؤنی اور مکروہ سازش سے ہنوز قطعی طور پر ناواقف تھا کہ عیار وڈیرے لکھ میر خان نے اپنے ایک دیرینہ مذموم مقصد کے حصول کی خاطر اپنے ''ڈشکروں'' کو کب سے معصوم اللہ رکھی کے پیچھے بھوکے کتوں کی طرح چھوڑ رکھا ہے اور نہ ہی ساون یہ جانتا تھا کہ وڈیرے کا ایک اہم گماشتہ منشی میرل اپنے وڈے سائیں کی دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کی خاطر معصوم اللہ رکھی کے پیچھے لاڑکانہ شہر جا پہنچا تھا اور اللہ رکھی کو بہلا پھسلا کر لکھ میر خان کے پرانے بنگلے میں بھی لے جا چکا تھا اور جہاں سے بعد میں اللہ رکھی خوش قسمتی سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی تھی...... اور اب بھی یقیناً منشی میرل اپنے گماشتوں کے ساتھ اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا...... اگر ساون کو ان سب باتوں کا علم ہوتا تو وہ کبھی بھی وڈیرے کو اللہ رکھی کا پتہ نہ بتاتا...... مگر وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وڈیرا سچ کہہ رہا ہے اور وہ اس کی اب خاطر خواہ مدد بھی کرسکتا ہے...... لہٰذا پھر کچھ سوچ کر بالآخر ساون نے وڈیرے کو اختر بانو کے عالیشان بنگلے کا مفصل پتہ سمجھا دیا...... مفصل پتہ معلوم ہونے کے بعد وڈیرے کی آنکھوں میں اچانک شکرے ایسی چمک عود کر آئی تھی اور صحرائی بچھو کے ڈنک کی طرح اٹھی ہوئی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی...... ساون اوطاق سے کب کا جا چکا تھا۔

☆======☆======☆

منشی میرل اور خانو دھچر دونوں نادم اور مجرموں کی طرح وڈیرے لکھ میر خان کے آگے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے...... ''لعنت ہو تم دونوں پر......'' معاً وڈیرا گرجا...... وہ دونوں پھر بھی خاموش رہے...... وڈیرا پھر غصیلے لہجے میں بولا...... ''تم لوگ اتنے عرصے سے شہر میں جھک مارتے پھر رہے ہو...... جبکہ میں نے اپنی اوطاق میں بیٹھے بیٹھے اس چھوکری اللہ رکھی کا پتہ لگالیا'' وڈیرے کی بات پر دونوں نے اپنے اپنے سر ایک دم اٹھا کر چونکتی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا...... اور پھر وڈیرا انہیں اختر بانو...... کے بنگلے کا پتہ سمجھانے لگا...... اس کے بعد منشی میرل اور خانو دھچر اپنے چند آدمیوں کے ساتھ اسی وقت

جیپ میں سوار ہو کر آندھی طوفان کی طرح شہر لاڑکانہ ہولئے۔

☆======☆======☆

وڈیرے کی اوطاق سے نکلنے کے بعد ساون کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے ڈوڈیرے لکھ میر خان کی اوطاق میں اپنی محبوب ہستی اللہ رکھی کی قبر کھود آیا ہے۔ وہ اپنے تئیں اپنے سر سے ایک بوجھ سا ہٹا کر اپنے گھر کی راہ ہولیا تھا۔ جی میں تو اس کے یہ بھی آئی تھی کہ وہ علی بخش کی بھی شکایت وڈیرے سے کر ہی دیتا...... مگر علی بخش اس کو بزدل اور کم ہمت نہ سمجھے اس لئے ساون نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ ویسے بھی وہ علی بخش سے خود ہی اکیلے نمٹنے کی خواہش رکھتا تھا دل میں...... وڈیرے سے ملاقات کرنے کے بعد ساون کو جانے کیوں اب ایک خوش فہمی سی محسوس ہورہی تھی...... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب اسے اللہ رکھی کے سلسلے میں وڈیرے کی حمایت حاصل ہوگئی ہے، غربت کی چکی میں پسنے اور گارے مٹی کی شکستہ چھت تلے رہنے والوں کو جب پختہ حویلی کے در و بام سے ذرا بھی نرم ہوا کے جھونکے، خواہ مصنوعی کیوں نہ ہوں، میسر آجائیں تو ایسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا فطری امر ہوتا ہے۔ ساون جب گھر پہنچا تو بیٹے کو صحیح سلامت دیکھ کر اس کی ماں اور بہن نے سکھ کا سانس لیا...... ساون کا اب ارادہ فوری شہر جا کر اللہ رکھی کی خیر خبر لینے کا تھا...... لہٰذا وہ لاڑکانہ جانے کی تیاری باندھنے لگا۔

چہار سو سازشوں بھری سیاہ رات طاری تھی...... خیراں اپنے دونوں بھائیوں اور بیٹے سمیت ایک کمرے میں موجود تھی۔ درمیان میں سلگتے کوئلوں سے بھری انگیٹھی رکھی تھی جس کی حدت سے کوٹھڑی نما کمرے کی محدود فضا قدرے گرم ہورہی تھی۔ یہ سردیوں کی طویل ترین رات تھی حالانکہ ابھی رات کے نو ہی بجے کا عمل رہا ہوگا...... علی بخش اس وقت ہوٹل میں موجود تھا...... محرم علی اب کم ہی ہوٹل بیٹھنے لگا تھا۔ اس میں ابھی علی بخش کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اب کوئی اس پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔ دراصل علی بخش جب سے ضمانت پر رہا ہو کر آیا تھا یہ چاروں شتونگڑے ڈر سے گئے تھے...... مگر اپنی سازشی خو پھر بھی نہیں چھوڑی تھی یہی وجہ تھی کہ اب یہ چاروں شیطان سانپ کی طرح کنڈلی مارے ایک ساتھ اکٹھے بیٹھے علی بخش کے خلاف ایک نئی سازش میں مصروف تھے...... سلگتی ہوئی انگیٹھی پر سلور کی ایک بڑی چائے والی کیتلی بھی دھری تھی...... وہ چاروں آپس میں سرگوشیوں کے انداز میں باتیں کررہے تھے اور پیالوں میں چائے بھی انڈیلتے ہوئے پیتے جارہے تھے...... قریب ہی فرش پر برتنوں کا چھینکا بھی رکھا ہوا تھا۔

''اب تو اس سانپ کا پھن کچلنا ہی پڑے گا......'' منصوبہ ساز خیراں کے بھائی دوست محمد نے چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے پیالہ فرش پر رکھ کر اپنی بہن سے کہا۔

''میں تو کہتی ہوں...... اس سارے چکر کو ہی دفع کر دو...... بس ادا، ہم نہیں بیچتے اپنا گھر اور ہوٹل......'' خیراں قدرے دزدیدہ نظروں سے اپنے بھائی دوست محمد کی جانب دیکھتے ہوئے بولی تو دوست محمد کا منہ حیرت سے کھل سا گیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے ادی! ہم تیری اور پٹ محرم علی کی بھلائی کی خاطر اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر یہاں تمہارے ساتھ مل کر اس سانپ علی بخش کا مقابلہ کر رہے ہیں تاکہ تجھے تیرا حق پورا ملے اور تُو ہمارے آبائی گوٹھ مدد پور ہم لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہ سکے اور اب تُو......'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا...... انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے بہن کی بات پر دلی صدمہ پہنچا ہو۔

خیراں، بھائی کی بات پر ذرا خفیف سی ہونے لگی...... ادھر اس کے دوسرے چھوٹے چہیتے بھائی محمد علی نے بھی بہن کی...... ''ٹکور'' کرنا مناسب سمجھا اور بولا...... ''ادی......! تُو نے آج واقعی ہمارا دل دکھا دیا...... کیا ہم اتنے بزدل ہیں کہ اس علی بخش کا سر بھی نہیں کچل سکتے...... بھا دوست محمد صحیح تو کہہ رہا ہے کہ ہم نے اپنے گھر بار چھوڑ رکھے ہیں تاکہ علی بخش سے نمٹ کر ہی دم لیں۔''

محرم علی کے چہرے سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے دونوں ماموؤں کی بات سے پوری طرح متفق ہو۔ درحقیقت دوست محمد اور محمد علی دونوں ہی نکھٹو تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کا پیسے والا بہنوئی راہی عدم ہو گیا ہے تو فوراً مکھی کی طرح اپنی بہن خیراں سے چمٹ گئے تھے جھوٹے ہمدرد بن کر...... اس سے پہلے انہوں نے مڑ کر بہن کی کبھی خبر تک نہ لی تھی۔ بہانہ نہ آنے کا یہی کرتے تھے کہ بھائی دودا خان کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگتا۔ اب ان دونوں کا ارادہ یہی تھا کہ کسی طرح سے بہن کو بہلا پھسلا کر یہاں سے اپنے گوٹھ مدد پور لے جائیں...... اور وہ وہاں دونوں بہن اور بھانجے کو ایک کوٹھڑی میں جگہ دیکر خود ان کی دولت پر عیش کریں...... اور انہی پیسوں سے بڑا ہوٹل کھول کر آرام سے زندگی بسر کریں۔ وہ مزدوری سے سخت عاجز آ گئے ہوئے تھے اور ایک عرصے تک وڈیروں زمینداروں کی ''رہاکی'' کر کر کے تنگ تھے، لیکن اب جو انہوں نے اپنی سونے کی چڑیا ایسی بہن خیراں کو ہاتھ سے نکلتے محسوس کیا تو فوراً ہی دونوں ناراضگی دکھاتے ہوئے اس پر اپنا احسان جتانے لگے...... خیراں کو اگرچہ اپنے دونوں بھائیوں کی یہ احسان جتانے والی بات بری لگی تھی......

لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی۔

کافی دیر کی خاموشی کے بعد خیراں نے مہر سکوت توڑی...... اور بڑے رسان کے ساتھ دونوں بھائیوں کو مخاطب کرنے کے انداز میں تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ ''تم دونوں میری بات کا غلط مطلب نہیں لو...... یہ تمہاری مجھ پر بڑی مہربانی ہے کہ تم نے...... اپنی پوری کوشش کرتے ہوئے ایک بیوہ بہن کا ساتھ دیا...... لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اللہ سائیں کی مہربانی کی وجہ سے ابھی ایسا برا وقت بھی نہیں آیا ہے مجھ پر...... کہ ہم اتنا پریشان ہو جائیں......'' وہ لمحہ بھر رکی پھر بولی۔ ''میں شروع ہی سے اس بات کی مخالفت کرتی رہی ہوں کہ علی بخش کو جان سے مارنے والی کسی سازش میں تمہارا ساتھ نہ دوں گی اور نہ ہی یہ ہونے دوں گی......'' خیراں نے اپنی بات مکمل کی تو اس کے چہرے پر ایک نئے عزم کی پختگی کھنڈ آئی تھی۔

اس کے دونوں بھائی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے...... تاہم دوست محمد نے اس بار نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا...... ''لیکن ادی!...... تجھے تیرا حق تو ملنا چاہئے......''

''میرا حق کوئی مجھ سے نہیں چھین رہا۔'' خیراں نے متانت سے جواباً کہا۔

''لیکن ادی! علی بخش...... تو تیرے حق پر سانپ بنا ہوا ہے...... آخر کو اسے گھر اور ہوٹل بیچنے پر کیوں اعتراض ہو رہا ہے......'' اس کے دوسرے بھائی محمد علی نے لقمہ دیا اور مزید خبردار کرتے ہوئے اضافہ کیا...... ''وہ چاہتا ہی یہی ہے کہ...... تُو ہمارے ساتھ نہ رہے...... تاکہ وہ یہاں رہ کر تم دونوں کو تمہارے حق سے ایک دن بے دخل کر دے۔''

''اور وہ کرے گا بھی اسی طرح......'' دوست محمد بھی اپنے بھائی کی تائید میں فوراً بولا...... محرم علی نے ابھی تک گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا وہ خاموشی سے باتیں سننے میں مصروف تھا۔

خیراں بولی۔ ''جتنا میرا اور میرے بیٹے...... محرم علی کا میرے شوہر دودا خان کی جائیداد پر حق ہے اتنا علی بخش کا بھی ہے...... مجھے آج اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ اگر ہم نے علی بخش کے ساتھ ایسی زیادتی کی تو روز حشر مجھے اللہ سائیں اور اپنے شوہر دودا خان کے آگے جواب دہ ہونا پڑے گا...... آخر کو...... علی بخش اس کا بیٹا ہے...... بے شک میں اس کی سوتیلی ماں سہی۔''

''واہ ادی! کیا بات کہی تُو نے...... یعنی بلی نو سو چوہے کھا کر حج کو جا رہی ہے...... تو پھر اب تک تم نے ہمارے ساتھ مل کر یہ سارا ڈرامہ کیوں رچایا...... ہمارا بھی وقت برباد کیا۔'' دوست محمد کے لہجے میں اپنی بہن خیراں کے لیے طنز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مگر

خیراں نے پھر بھی برا نہیں منایا۔

ادھر محمد علی...... اپنے بھانجے سے طنزاً مخاطب ہوا...... ''سن رہے ہو نا محرم...... اپڑیں امڑ (ماں) کی باتیں کیا کہہ رہی ہے...... سانپ کو ساری عمر اپنی آستین میں پالے گی یہ...... جو ایک نہ ایک دن تم دونوں کو ڈس کر ہی رہے گا۔''

جواباً محرم عجیب سی خاموشی کے ساتھ اپنی ماں خیراں کا چہرہ تکنے لگا...... ادھر دوست محمد نے ایک اور پینترا بدلا...... اور آخری کوشش کے طور پر بہن کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھو ادی! تمہیں آخر یہ بات کیوں نہیں سمجھ میں آ رہی ہے کہ...... علی بخش تجھے اپنا اور اپنی مرحوم ماں حضوراں بی بی کا قاتل سمجھتا ہے کیونکہ تُو اس کی ماں پر سوکن بن کر آئی تھی اور اسی غم میں گھل گھل کر اس کا انتقال ہو گیا۔ اگر بھائی دودا سائیں زندہ ہوتا تو اور بات تھی لیکن اب اس کے مرنے کے بعد تم دونوں اکیلے رہ گئے ہو...... لہٰذا علی بخش کو اب آسانی سے گل کھلانے کا موقع ملے گا وہ تم دونوں سے انتقام ضرور لے کر رہے گا۔'' دوست محمد اتنا کہہ کر چپ ہو گیا اور اپنی عیارانہ گفتگو کی اثر پذیری خیراں کے چہرے پر بھانپنے کی سعی کرنے لگا لیکن خیراں...... جس کے دل میں اچانک ہی اپنے سوتیلے بیٹے علی بخش کے لیے خوف خدا سما گیا تھا...... بھائی کی اس بات سے متاثر ہوئے بغیر بولی۔

''اگر ایسی بات ہوئی تو...... میرے اس جوان پٹ محرم علی میں اتنی طاقت ہے کہ وہ ہر سازش کا مقابلہ کر سکے......'' آخری الفاظ اس نے تفاخر آمیز لہجے میں اپنے بیٹے محرم علی کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کئے تھے......

دوست محمد اور محمد علی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے...... پھر وہ اپنی بہن خیراں کے اس اچانک بدلے ہوئے رویے پر اتنے بددل ہوئے کہ ذرا دیر بھی وہاں نہ رکے اور اسی وقت اٹھ کر باہر چلے گئے۔

محرم علی حیران پریشان اپنی ماں کا چہرہ تکنے لگا۔ اسے خود اپنی ماں کے اچانک بدلنے والے رویے پر حیرت ہو رہی تھی...... لہٰذا وہ ماں سے پوچھے بنا نہیں رہ سکا...... ''امڑ!...... یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے تُو نے ماما دوست محمد اور محمد علی کو کیوں ناراض کر دیا......؟''

خیراں نے ایک نظر بیٹے کی جانب دیکھا اور پھر جب بولی تو اس کا لہجہ واضح طور پر مرتعش تھا۔ ''پٹ محرم!...... شاید تجھے میری بات پر یقین نہ آئے لیکن یہ سچ ہے کہ ایک رات کو میں نے خواب میں تیرے پیو دودا خان کو دیکھا تھا...... اور...... اس کے ساتھ علی بخش کی ماں حضوراں بی بی بھی کھڑی تھی...... وہ بالکل حور پری نظر آ رہی تھی...... اس نے زرق برق

لباس پہن رکھا تھا اس کے گرد نور ہی نور پھیلا ہوا تھا......'' خیراں پر بتاتے ہوئے عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ''اور...... اور تیرا باپ دودا خان اس کے آگے بچھا جا تھا...... جبکہ میری حالت انتہائی خستہ ہو رہی تھی میں پھٹے پرانے بوسیدہ لباس میں ملبوس تھی اور میرے اردگرد ایسی کھائیاں منہ پھاڑے موجود تھیں جن کے اندر عجیب و غریب بلائیں اور سانپ، بچھو کلبلا رہے تھے...... پھر پتہ ہے کیا ہوا...... حضوراں بی بی نے مجھے دیکھتے ہی دودا خان سے باآواز بلند میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا...... دودا خان!...... اس عورت نے میرا حق مارا لیکن میں نے بخش دیا...... لیکن اس نے میرے لخت جگر علی بخش کو بھی نہیں چھوڑا...... یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتی...... اسے ان خونی کھائیوں میں دھکیل دے دودا خان...... اسے ان خونی کھائیوں میں دھکیل دے......''

خیراں پر اچانک ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور محرم علی یک دم اپنی ماں کو سنبھالنے کے لیے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہو...... اس کی ماں کو غش آ رہے تھے...... کہتے ہیں اگر دنیا میں انہونیاں نہ ہوں تو دنیا ہی نہ ہو...... معجزات اور انہونی کے بغیر انسانی زندگی کچھ نہیں۔ یہاں بھی ایک انہونی وقوع پذیر ہو چکی تھی۔ اس حقیقت کا اب تک کسی کو پتہ نہ چل سکا تھا کہ جانے کب سے کوٹھڑی نما کمرے کے دروازے کے عقب سے علی بخش چپکا کھڑا آج کی اسی انہونی کا حصہ بنا سب کچھ سن رہا تھا۔ کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا تھا کہ وہ اچانک کب ہوٹل سے خاموشی کے ساتھ لوٹ آیا تھا...... اسے یوں لگا جیسے ایکا ایکی خود اس کے اندر سے بھی اپنی سوتیلی ماں خیراں اور بھائی محرم کے لیے نفرت کا جذبہ ماند پڑنے لگا ہے...... وہ من ہی من میں ایک دھلنے کی سی کیفیت سے گزر رہا تھا...... پھر وہ اچانک اندر داخل ہو گیا...... اس وقت محرم اپنی ماں کو سنبھالنے میں لگا ہوا تھا...... کہ اچانک علی بخش نے بڑھ کر اپنی سوتیلی ماں خیراں کو سنبھال لیا۔

''امڑ!...... ہوش میں آ...... تجھے کچھ نہیں ہو گا...... میں ہوں نا...... تیرا پٹ علی...... علی بخش...... تجھے کچھ نہیں ہونے دوں گا...... امڑ...... حوصلہ کر......'' علی بخش کی آواز میں نمناک رقت سی اتر آئی تھی...... دونوں ماں بیٹوں کے درمیان صدیوں کے فاصلے یوں چٹکی میں سمٹ رہے تھے اور انہونی اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ محرم علی کی آنکھیں بھی اشکِ ندامت سے نمناک ہو رہی تھیں۔

☆======☆======☆

وہ دن روزینہ کی سالگرہ کا دن تھا...... سالگرہ اگرچہ دونوں ماں بیٹی سادگی سے مناتی

تھیں لیکن روزینہ اپنی چیدہ چیدہ سہیلیوں کو ضرور مدعو کرتی تھی اور ظاہر ہے دھما چوکڑی بھی خوب مچتی تھی...... کیونکہ وہ سب اس کی ''کلوز فرینڈ'' تھیں اور جی بھر کر ہلا گلا کرتی تھیں...... پورے بنگلے میں صرف روزینہ کا ہی ایک کمرہ اس وقت خوشیوں، قہقہوں اور خوش گپیوں کا مرکز بنا رہتا تھا......اس بار بھی گنتی کی پوری پانچ سہیلیاں اس کے بڑے سے کمرے میں موجود تھیں......لیکن اس بار انہیں ایک نیا ایڈونچر میسر تھا...... پہلے پہل تو روزینہ کی ممی اختر بانو کی موجودگی کی وجہ سے وہ سب اپنی صورتوں پر بلا کی سنجیدگی سجائے بیٹھی رہیں مگر پھر ان کے کمرے سے نکلتے ہی انہوں نے روزینہ سمیت اللہ رکھی کو گھیر لیا......

اللہ رکھی نے اس وقت ثقافتی نمونے کا حامل لباس پہن رکھا تھا جس کا گلا شیشوں والی کڑھائی کر کے اس نے خود ہی بنایا تھا...... پھر اس عرصے میں اللہ رکھی نے اپنی دست کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے روزینہ کے لیے ایسے ایسے نادر نمونے تخلیق کیے تھے جسے دیکھ کر روزینہ دنگ رہ گئی تھی......ان نادر نمونوں میں......خوبصورت رنگین رلیاں، کڑھائی کیے ہوئے قمیضوں کے گلے...... پراندے...... رومال اور دستر خوان شامل تھے۔

''واو...... واٹ اے گریس......!'' روزینہ کی ایک چنچل سہیلی کے ہونٹوں سے کلمۂ تحسین بلند ہوا۔

''ایسے نایاب نمونے تو ہم نے اونچے اونچے شوکیسوں میں بھی نہیں دیکھے......'' ایک دوسری نے لقمہ دیا۔

''میں تو یہ سب مال غنیمت کے طور پر سمیٹوں گی'' ...... تیسری نے گویا اپنے خطرناک ارادوں کو ظاہر کرتے ہوئے کہا اور روزینہ تھی کہ اپنی سہیلی اور بہن اللہ رکھی کی تعریفوں کے ذکر پر فخر سے پھولے نہیں سما رہی تھی...... ایک چوتھی منچلی لڑکی نے اللہ رکھی کو بھی ایک ملکوتی حسن کا حامل نادر نمونہ قرار دے دیا، اللہ رکھی اپنی ہمدرد سہیلی روزینہ کی دوستوں کے اپنے بارے میں خوش کن تبصروں پر مسرور ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ گاہے بہ گاہے ان کے تیکھے شریر سوالوں کا جواب ملی جلی سندھی اردو میں دینے کی سعی کر رہی تھی۔ بہر طور رات گئے یہ ہنگامہ اختتام پذیر ہوا...... سردی زوروں پر تھی مگر کمرے میں روم ہیٹر کی وجہ سے فضا قدرے گرم ہو رہی تھی...... روزینہ کی ماں اختر بانو اپنے کمرے میں محو استراحت تھیں...... جبکہ روزینہ اور اللہ رکھی جہازی سائز بیڈ پر گرم لحافوں میں دبکی ہوئی تھیں...... دیوار گیر کلاک میں اس وقت بارہ کا عمل تھا......لیکن جانے کیا بات تھی کہ روزینہ کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ تب وہ کن انکھیوں سے اللہ رکھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اللہ رکھی!''

''جی'' اللہ رکھی نے جواباً کہا۔

''کیا تم واقعی اپنے ساون کو بھول گئی ہو......؟'' روزینہ نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

اللہ رکھی اس کی بات پر قدرے چونکی اور گردن گھما کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی ''نہیں، سہیلی مجھے واقعی یاد نہیں آ رہا کہ...... ساون کون ہے؟......''

روزینہ اس کی بات سن کر ذرا دیر کو کسی سوچ میں غلطاں سی ہو گئی...... درحقیقت اسے اللہ رکھی کے دماغی معالج ڈاکٹر احسان احمد کی ہدایت یاد آ رہی تھی...... جس کے پاس اللہ رکھی کو ایک دن چھوڑ کر مشورے کے لیے جایا جاتا تھا جہاں ڈاکٹر احسان احمد...... اپنے خاص چیمبر میں اللہ رکھی کو ''سجیشن'' کے ذریعے اس سے محو کلام ہوتا...... نیز انہوں نے اختر بانو اور روزینہ کو اللہ رکھی کی یادداشت لوٹانے کی خاطر یہ بھی ہدایات دی تھی کہ وہ دونوں اللہ رکھی کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے رہیں اور اس کے ''قریبی'' لوگوں کا بار بار اس کے سامنے ذکر کرتے ہوئے اس سے کچھ نہ کچھ پوچھتے رہیں...... لیکن یہ بدقسمتی ہی تھی کہ ابھی تک روزینہ اور اس کی ماں کو بے چاری اللہ رکھی کا کوئی بھی قریبی عزیز نہیں مل سکا تھا سوائے ساون کے...... جس کی شخصیت ذرا مشکوک تھی......لیکن اس کی زبانی انہیں معلوم ہو سکا تھا کہ اللہ رکھی کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ ایک چاچی عنایتاں تھی اس کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ جس کی اختر بانو اور روزینہ نے تسلی کی خاطر مقامی سرکاری ہسپتال سے تصدیق بھی کرائی تھی۔

اب ڈاکٹر احسان احمد کے اس مشورے پر عمل کرنا دونوں ماں بیٹی کو مشکل نظر آ رہا تھا...... کیونکہ ساون کو وہ اللہ رکھی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں کیونکہ وہ بہرحال اس کے لیے ایک نامحرم شخص تھا...... لیکن روزینہ سمجھتی تھی کہ اللہ رکھی کی کھوئی ہوئی یادداشت کو لوٹانے میں ساون کی شخصیت سو فیصد معاون ثابت ہو سکتی تھی...... کیونکہ ساون اختر بانو اور روزینہ سے اشاروں کنایوں میں اللہ رکھی سے اپنا تعلق ظاہر کر چکا تھا...... مگر اختر بانو کو اب بھی اعتراض تھا لیکن روزینہ کو پورا یقین تھا کہ ساون ہی کے باعث اللہ رکھی کی کھوئی یادداشت لوٹ سکتی ہے...... کیونکہ وہ دونوں بالآخر ایک دوسرے کے لیے بھی یک جان دو قالب رہ چکے تھے۔ لہٰذا اسی اہم نکتے کو مدِ نگاہ رکھتے ہوئے روزینہ اکثر اللہ رکھی کے سامنے ساون کا ذکر کرتی رہتی تھی لیکن آج ساون کا ذکر کرتے ہوئے روزینہ کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی...... اور یوں لگ رہا تھا جیسے آج وہ ساون کو اللہ رکھی کی لوح ذہن پر اجاگر کرنے کی کوشش کی بجائے اپنے ذہن بلکہ اپنے دل پر اجاگر کرنا چاہ رہی ہو...... لیکن کیوں......؟

اس نے سوچا...... میں اس لڑکے ساون کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں...... وہ میرا کیا لگتا ہے......؟ اس کے دل میں کلیاں سی چٹکنے لگیں...... آپوں آپ نہ چاہتے ہوئے بھی اس دیہاتی سے لڑکے ساون کی شبیہ من ہی من میں ابھر رہی تھی...... تاہم تھوڑی دیر بعد روزینہ جیسے اس کی یادداشت کو مہمیز کرنے کی غرض سے دوبارہ بولی۔

''اللہ رکھی! کیا تمہیں...... کسی کی...... محبت...... یاد نہیں آرہی...... میرا مطلب ہے کوئی ایسا شخص جو تمہیں بہت چاہتا ہو...... اور...... تم اسے چاہتی ہو......'' روزینہ کی بات پر اللہ رکھی کے چہرے پر حیرت اور شرم کے ملے جلے تاثرات نمودار ہو گئے...... مگر اس کے گلنار چہرے سے یہ بھی مترشح تھا جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش میں اپنے ذہن پر زور دے رہی ہو...... چوری...... چوری۔

''ہاں...... ہاں...... اللہ رکھی یاد کر...... اچھی طرح سے سوچ...... کوئی ایسا شخص، ایسا وجود...... ایسی ہستی...... جو تم سے بہت پیار کرتا ہو...... تمہارے لئے فکر مند ہو اور...... اور تم اس کے لیے پریشان...... بتاؤ...... سوچو......'' روزینہ اسے تحریک دیتے ہوئے خوابناک کیفیت میں بولی لیکن اللہ رکھی کے چہرے پر سپاٹ سی خاموشی طاری رہی۔

☆======☆======☆

ساون اس دن شہر لاڑکانہ جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا...... وہ اس دن صبح کوکا دوجکھرانی کے ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا...... اس کے قریب ہی دو آمنے سامنے رکھی بینچوں پر گوٹھوں کے چند افراد بیٹھے چائے کی چسکیوں کے دوران معنی خیز انداز میں اس کی جانب تکے جا رہے تھے...... تب ان میں سے ایک کی رگِ شیطنت پھڑکی اور وہ ساون کو سنانے کی خاطر اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے قدرے بلند آواز میں مخاطب ہوا۔ ''اڑے یار...... ! سنگت خالق سائیں اور سنا ہے تُو نے...... آج کل کے مجنوں اپنی محبوباؤں کو بہلا پھسلا کر شہر کے خواب دکھا کر انہیں فروخت کر کے آجاتے ہیں۔''

ساون کو ایک جھٹکا سا لگا اس نے شعلہ بار نگاہوں سے اس طعنہ زن شخص کی طرف دیکھا جو کن انکھیوں سے اس کی جانب تک رہا تھا...... پھر ایک دم اس نے اپنی نگاہیں گھما دیں تب جواباً اس کے دوسرے ساتھی نے بھی ایک نشتر ساون کی جانب اچھالنا فرض سمجھا۔

''ہاؤ سنگت یار محمد...... ! تُو بالکل صحیح کہہ رہا ہے......'' پھر اس نے بھی ایک ناقابل اشاعت تبصرہ کیا تب ساون کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی اور وہ غصے سے چائے کی پیالی

ان کی جانب اچھالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا...... اور طیش میں بولا۔

''اڑے بزدلوں کی طرح کیا آپس میں چونچیں لڑا رہے ہو...... ادھر آ کے بات کرو نا......'' ساون کی پھینکی ہوئی چائے کی ادھ بھری پیالی عین سامنے رکھی لکڑی کی میز پر گر کر ٹوٹی تھی اور چائے کے چھینٹے ان کے کپڑوں پر آن گرے تھے...... وہ تعداد میں چار تھے یک دم غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے...... اور ایک ساتھ ہی ساون کے قریب آ گئے۔

''اڑے تو پھر اتنا غیرت مند ہے تو بتاتا کیوں نہیں...... بے چاری سوڈھل چاچا کی بھتیجی اللہ رکھی کہاں بیچ آیا ہے......'' ان میں سے ایک نے ساون کی طرف گھورتے ہوئے زہر اگلا۔ ساون کا دماغ اس کی یاوہ گوئی سے ایک بار پھر الٹنے لگا...... دل تو اس کا یہی کر رہا تھا کہ اس کمینے کی زبان گدی سے کھینچ لے لیکن وہ ضبط سے کام لیتے ہوئے پہلے جوابی کارروائی کا ارادہ رکھتا تھا لہٰذا غراتے ہوئے بولا۔

''اڑے...... اتنے غیرت مند بنتے ہو تو اس وقت کہاں تھے جب سوڈھل چاچا کی گھر والی بیماری کے مارے ایڑیاں رگڑ رہی تھی......''

''یہ ہمارے سوالوں کا جواب نہیں ہے ساون......'' ان میں سے ایک بھرائے دار لہجے میں بولا، جواباً ساون بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

''تمہیں پھر کس قسم کا جواب چاہیے......''

اس اثنا میں ہوٹل میں موجود دیگر افراد بھی ان کی تکرار میں دلچسپی لیتے ہوئے جمع ہو گئے تھے...... ہوٹل کے ''دَخل'' پر بیٹھا بذات خود ہوٹل کا مالک کا دوجکھرانی بھی مجمع پر پریشان نگاہیں ڈالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''اتنے بھولے نہ بنو ساون...... ! ہم اللہ رکھی کا پوچھ رہے ہیں...... جو تیرے ساتھ شہر گئی تھی''...... ساون نے لمحہ بھر توقف کے بعد ایک نظر قرب و جوار میں دیدے پھاڑے کھڑے لوگوں کی طرف دیکھا...... اسے یوں لگا جیسے بھرے مجمع نے اس سے یہ سوال پوچھا ہو...... اور ادھر وہ چاروں شرپسند...... اپنے چہروں پہ مکروہ مسکراہٹ لئے ساون کو یوں گھور رہے تھے کہ جیسے بھرے مجمع میں اسے ذلیل کر دینا چاہتے ہوں۔

ساون نے سوچا یہی وقت ہے کہ وہ ان شیطانوں کی بات کا مدلل جواب دے ورنہ اس کا گوٹھ میں رہنا دوبھر ہو جائے گا...... کیونکہ اللہ رکھی کے حوالے سے یہ ایک نازک اور حساس مسئلہ تھا...... پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا...... اس نے بلاکم و کاست...... چاچی عنایتاں کی بیماری، اور اسے شہر لے جانے پھر اس کے انتقال اور تدفین

سے لے کر اللہ رکھی کی اچانک گمشدگی اور پھر ایسے حالات میں اس کا اچانک ملنا کہ وہ اپنی یادداشت گنوا بیٹھی تھی، بتایا۔

''اگر تم لوگوں کو میری باتوں میں ذرا بھی شک ہے تو...... تم میں سے کوئی میرے ساتھ چلے...... جس ہسپتال میں چاچی کا علاج اور پھر انتقال ہوا اس کے پرچے میرے پاس اب تک محفوظ ہیں...... اور میں ان شریف لوگوں کا بھی پتہ دے دیتا ہوں جو لوگ اللہ رکھی کا ایک دماغی ڈاکٹر کے پاس علاج کروا رہے ہیں...... میرا خدا جانتا ہے کہ میں نے یہ سب گوٹھ کے ایک ہمدرد انسان ہونے کے ناتے کیا...... اگر یہ سب باتیں جھوٹ نکلیں تو مجھے تم سب لوگ اس ہوٹل میں الٹا کر کے بجلی کے تار سے باندھ دینا...... ہے کوئی...... جو آگے آئے اور یہ ساری جستجو کرے......؟'' ساون اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ فرط جوش و جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آس پاس کھڑے کتھا گوش لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا...... پھر وہ سب باری باری خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی جگہوں کی طرف چلے گئے۔ جبکہ وہ چاروں شیطان بھی دیگر لوگوں کی طرح چپ چاپ وہاں سے کھسک لئے...... اور ہوٹل کا مالک کادو جکھرانی بھی بات کو ٹلتی دیکھ کر سکون کا سانس لے کر رہ گیا تھا پھر ساون خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

☆======☆======☆

آسمان دور تک بالکل صاف تھا اسی لیے دھوپ خوشگوار چمک لئے ہوئے تھی...... کادو جکھرانی کے چھپر ہوٹل کے قریب سے گزرتی ہوئی شہر جانے والی سڑک ویران تھی...... سڑک کی دوسری جانب چاولوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے جہاں محنت کش ہاری...... مرد، عورتیں کٹائی میں مشغول تھے...... ساون سڑک کے کنارے کھڑا شہر جانے والی لاری کا منتظر تھا...... وہ اللہ رکھی کی خیر خیریت معلوم کرنے کی غرض سے شہر اختر بانو کے ہاں جا رہا تھا۔ جب سے اس کی اللہ رکھی کی یادداشت محو ہوئی تھی ساون تب سے اپنے اندر ایک ناقابل بیان بے چینی محسوس کرنے لگا تھا...... اس کا دل اس وقت بڑا کڑھتا تھا جب وہ اپنی محبوبہ دلربا اللہ رکھی کے سامنے جاتا تو وہ اسے اجنبیوں کی طرح خالی خالی نظروں سے گھورتی رہتی، وہ دل مسوس کے سوچتا کہ اللہ رکھی کی سرمگیں اور بڑی بڑی آنکھوں میں ہر سمے اس کے لیے ایک اشتیاق سا جھلکتا رہتا تھا۔ مگر اب وہ ساری کیفیات اک نامعلوم سی تیرگی شب کی نذر ہو چکی تھیں...... اس کی خوبصورت اور دلکش آنکھوں کی چھتنار پلکوں پر اب اجنبیت کے گدھ آ بیٹھے تھے...... وہ نگاہیں اب شناسا نہ رہی تھیں...... لیکن اس کے ساتھ

ساتھ ساون یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب...... ایک حادثہ کی وجہ سے غیر ارادی عمل ہے اس میں اللہ رکھی کا کوئی قصور نہیں، وہ ایک دماغی ماہر کے زیر علاج تھی اور اس نے خاطر خواہ امید دلائی تھی کہ ایک نہ ایک دن اللہ رکھی کی یادداشت ضرور لوٹ آئے گی۔ ساون بھی انہی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک وہ ایک تیز آواز پر چونکا کسی نے بڑے درشت لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا...... ''اڑے او...... چھوکرا...... کہاں بھاگنے کی تیاری کر رہا ہے......''

ساون نے آواز کی سمت ٹھٹک کر دیکھا تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ سامنے انسپکٹر ارشد لاشاری ہتھکڑی لیے چند مسلح سپاہیوں کے ساتھ کھڑا اسے مسکراتی نظروں سے گھور رہا تھا۔

مگر ساون اگلے ہی لمحے خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ لہٰذا جواباً سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا...... انسپکٹر صاحب میں بھلا کہاں بھاگ رہا ہوں......''

انسپکٹر ارشد بدستور اسے گھورتی ہوئی نظروں، اور ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ لئے چند ثانیے دیکھتا رہا...... پھر اس کے بعد یک دم اپنے لہجے میں سرد مہری پیدا کرتے ہوئے بولا...... ''ساون! تجھے مرحوم چاچا سوڈھل...... کی یتیم اور معصوم بھتیجی اللہ رکھی کو ورغلانے اور اغوا کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر ارشد نے آگے بڑھ کر اسے ہتھکڑیاں پہنا دیں اور ساون ہکا بکا ہو کر اس کی جانب تکنے لگا۔

انسپکٹر ارشد لاشاری نے ساون کو آناً فاناً حوالات میں بند کر دیا تھا...... اور بے چارہ ساون ورطۂ حیرت میں مبتلا سلاخوں کے پیچھے تصویر غم بنا تقدیر کے اس کٹھور پن پر انگشت بدنداں ہو کر سوچنے لگا کہ آخر اسے یہ کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟...... کچھ گھنٹے بیتے طبیعت میں ذرا ٹھہراؤ سا آیا تو اس فضول تکرار کو چھوڑ کر ساون ان عوامل پر غور کرنے لگا جس کے تحت وہ بے گناہ گرفتار کیا گیا تھا۔ سنجیدگی سے غور کرنے پر اسے کسی سازش کی بو محسوس ہونے لگی...... جیسے کسی نے اسے دانستہ پھنسوایا ہو...... پہلا شک اسے علی بخش پر ہوا۔ جو اپنے کاندھے پر خود ساختہ غیرت کی صلیب اٹھائے جہالت کی تصویر بنا اس کا بیری ہو رہا تھا، پھر دوسرا شک اسے گوٹھ کے ان چند شر پسند افراد پر بھی ہوا جن لوگوں کو اس نے کادو جکھرانی کے ہوٹل میں منہ توڑ جواب سے نوازا تھا...... اگرچہ ساون نے انسپکٹر ارشد لاشاری سے پوچھا بھی تھا کہ اس کے خلاف کس نے رپورٹ درج کرائی ہے۔ اس کے جواب میں انسپکٹر ارشد لاشاری نے مکاری سے اپنی ایک آنکھ میچ کر لٹھ مار لہجے میں کہا۔

''اڑے بابا چھوکرا!...... پورے گوٹھ نے تیرے خلاف تھانے میں رپورٹ درج

کروائی ہے...... کہ تُو نے مرحوم چاچا سوڈھل کی جوان، کنواری بھتیجی کو شہر لے جا کر فروخت کر دیا ہے......''

''بکواس کرتے ہیں یہ سب لوگ......'' ساون انسپکٹر ارشد لاشاری کی بات پر زور سے بولا...... تو اسے بھی غصہ آ گیا اور وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لکڑی کے سیاہ رول کو سلاخوں پر زور سے مارتے ہوئے دوسری جانب کھڑے ساون کو گھور کر بولا۔

''ڑے چھوکرا! آواز اپنی آہستہ رکھ سمجھا...... یہ تھانہ ہے تھانہ...... گوٹھ...... کا گلیارا نہیں ہے...... یہاں اونچا بولنے والے کی میں زبان کھینچ لیا کرتا ہوں۔''

ساون اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تنا کھڑا رہا...... وہ انسپکٹر ارشد لاشاری کے لہجے سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا تھا بلکہ اسے وہ بھی اس سازش کا ایک مہرہ نظر آ رہا تھا...... بہر طور...... ناچار اس نے چپ اختیار کر لی۔

☆======☆======☆

''سائیں وڈا!...... چھوکرے کو میں نے اندر کر دیا ہے...... اور کوئی حکم......؟''

بالآخر انسپکٹر ارشد لاشاری نے رخصت ہوتے ہوئے آخر میں مؤدبانہ لہجے میں...... اپنے سامنے چارپائی پر نیم دراز وڈیرے لکھ میر خان سے کہا تو...... وڈیرے کے چہرے پر ایک لمحے کو عجیب سی مسکراہٹ رقصاں ہو کر رہ گئی پھر وہ اپنی مونچھوں کو مروڑیاں دیتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش کے دوران بولا۔

''ہا...... بابا...... انسپکٹر سائیں!...... مہربانی...... پر خیال رہے کہ...... مجھ پر شک کا بھی خیال اس چھوکرے کے ذہن میں نہ آئے۔''

''ہرگز نہیں آئے گا سائیں بھوتار!...... اور حکم......'' انسپکٹر ارشد نے مستعدی سے کہا اور جب وہ وہاں سے لوٹنے لگا تو وڈیرے نے دوبارہ اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اڑے بابا...... انسپکٹر صاحب...... آج رات اوطاق آنا بڑا جشن پارٹیں...... کا بندوبست کیا ہے میں نے تیرے واسطے......'' وڈیرے کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

انسپکٹر ارشد کی یہ بات سن کر باچھیں پھیل گئیں...... ''لاڑکانہ سے بڑی مشہور گانے والیاں بلوائی ہیں میں نے اور ولایتی شراب کا تو پورا کریٹ آئے گا......'' وڈیرے کی صراحت پر انسپکٹر ارشد کے منہ میں پانی بھر آیا...... وہ ساون کو گرفتار کرنے کے بعد اپنے کارنامے کی رپورٹ دینے...... سر کے بل وڈیرے لکھ میر خان...... کی اوطاق آ دھمکا تھا۔

درحقیقت...... وڈیرے ہی کی ایماء پر انسپکٹر ارشد نے ساون کو گرفتار کر کے سلاخوں

کے پیچھے دھکیلا تھا...... ساون کی فوری گرفتاری کے پیچھے...... وڈیرے لکھ میر خان کی ایک بڑی گہری اور گھناؤنی سازش کارفرما تھی...... کیونکہ جب ساون نے اپنی سادہ لوحی میں آ کر...... وڈیرے کو اللہ رکھی کے متعلق ساری کتھا سنائی تو مکار وڈیرے کے شیطانی ذہن نے فوراً ایک تدبیر لڑاتے ہوئے پہلے ساون کو گرفتار کروایا...... اور اب اس کا ارادہ ساون کے بتائے ہوئے اختر بانو کے بنگلے کے پتے پر اپنے آدمیوں کے ذریعے اللہ رکھی کو کسی طرح حاصل کرنے کے بعد...... ساون پر اللہ رکھی کو اغواء اور فروخت کا مقدمہ چلا کر...... ہمیشہ کے لیے...... اسے پابند سلاسل کروانا تھا۔ لہٰذا اب وہ بڑی شدت سے منشی میرل وغیرہ کا منتظر تھا۔

☆======☆======☆

علی بخش کی تو اب دنیا ہی بدل گئی تھی۔ خیراں اب اسے اپنی سگی اولاد کی طرح چاہنے لگی تھی اور محرم علی بھی علی بخش کو اپنا حقیقی معنوں میں بڑا بھائی سمجھنے لگا تھا...... ماں کی ذہنی کایا کلپ کیا ہوئی تھی کہ محرم کا رویہ بھی اب خوش کن حد تک بدل گیا تھا، اور دونوں مل جل کر ہوٹل میں بیٹھنے لگے تھے...... ادھر دونوں ماں بیٹوں کو عقل آتے ہی ابن الوقت دونوں ماموں...... دوست محمد اور محمد علی نے بھی ادھر کا رخ پھر کبھی نہیں کیا تھا...... علی بخش کو اب بس ایک ہی فکر سوار تھی کہ کسی طرح سے اپنے مرحوم باپ دودا خان کی وصیت کو جلد سے پورا کرنے کی کوشش کرے...... یعنی کسی طور بھی اللہ رکھی کا بیاہ...... گوٹھ کے کسی شخص سے نہ ہونے پائے...... یہی وجہ تھی کہ علی بخش مسلسل اب ساون کے تعاقب میں تھا...... یعنی وہ کسی طرح اللہ رکھی کا سراغ لگانا چاہتا تھا لیکن پھر جیسے ہی اسے پتہ لگا کہ...... ساون کو تو جیل ہو گئی ہے...... تو وہ ذرا مطمئن ہو کر چپکا بیٹھ رہا...... تاہم پھر بھی اسے اللہ رکھی کے بارے میں کھد بد ضرور لگی ہوئی تھی...... ادھر خیراں اپنے بیٹے محرم علی کی شادی سے فراغت کے بعد علی بخش کے بیاہ کی فکر میں رہنے لگی تھی...... مگر علی بخش اپنے باپ سے کئے گئے وعدے کے ایفاء تک شادی وغیرہ کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ادھر سورٹھ جو ساون کے ساتھ شادی کی خواہش کا جنازہ اٹھائے محرم علی کی دلہن بن چکی تھی اور لشتم پشتم زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہی تھی۔ ساون سے شادی نہ ہونے کے غم نے اسے ایک زندہ لاش بنا دیا تھا...... جبکہ اس کی اداسی اور غمناک چہرے کو دیکھتے ہوئے محرم یہی سمجھتا تھا کہ شاید نئی دلہنوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ چونکہ عرصے تک وہ ماں باپ کے پاس رہتی ہیں...... پھر جب بیاہ کر پیا کے دیس سدھارتی ہیں تو ماحول اور لوگ اجنبی ہوتے ہیں ایک نئی نویلی دلہن کے لئے...... لہٰذا...... ان کی اداسی ایک فطری عمل ہے...... لیکن محرم علی کو ایک بات پر اچنبھا

ضرور تھا کہ...... دلہن بے شک جتنی بھی نئی ہو...... مگر دھیرے دھیرے بہر حال وہ خود کو سسرال اور شوہر کے ماحول میں ڈھال ہی لیتی ہے...... جبکہ سورٹھ تو تھی بھی اسی گوٹھ کی...... دوگلیارے چھوڑ کر اس کے بابل کی چوکھٹ تھی پھر اس کی مستقل اداسی کی کیا وجہ تھی...... جو دن بہ دن سوا ہی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن بالآخر محرم علی نے سورٹھ سے پوچھ ہی ڈالا۔ ''سورٹھ!...... کیا بات ہے آخر...... تو اتنی چپ چپ اور اداس کیوں رہتی ہے؟''

وہ اس وقت اپنے شوہر محرم علی کے آگے کھانا چن رہی تھی۔ قدرے چونک کر بولی۔

''نن...... نہیں...... تو......'' اس کی گہری اداس آنکھوں سے چور جھلکنے لگا۔

محرم دوبارہ اس کی جانب بہ غور دیکھتے ہوئے پُر زور لہجے میں بولا...... ''نہیں سورٹھ! کوئی تو بات ہے...... جسے تُو چھپا رہی ہے......'' سورٹھ کو ایک جھٹکا لگا...... وہ محرم علی کی طرف چونکتی نظروں سے دیکھ کر گویا بات بناتے ہوئے بولی۔

''نہیں سئیں! ایسی تو کوئی بات نہیں...... وہ بس امڑ اور بیو یاد آتے ہیں......'' وہ چپ ہوئی مگر محرم تب بھی مطمئن نہ ہوا...... بولا۔

''تو کون سا...... سوکوس کے گوٹھ سے بیاہ کر آئی ہے...... اسی گوٹھ کی تو ہے تُو...... اور دوگلیارے ترے ماں پیو رہتے ہیں......''

سورٹھ یکدم لاجواب ہو کر خاموش سی ہو گئی۔ محرم علی...... نے بھی زیادہ جرح نہ کی...... درحقیقت وہ اپنی بیوی سورٹھ سے بہت محبت کرتا تھا...... اور یہ اس سے بے اندازہ محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ سورٹھ کی ہر سے اداسی اسے گھائل اور متفکر کرتی تھی...... وہ تو اسے حکیم بڈھل کے پاس بھی لے گیا تھا...... یہی نہیں...... گوٹھ کے جنوب میں واقع ایک چھوٹے سے دیہات میں بھی لے جا کر اس نے ایک ''سید بی بی'' کے حجرۂ خاص کا چکر سورٹھ کو لگوایا تھا...... مگر اس کی پُر اسرار اداسی تھی کہ سوا ہی ہوتی چلی جا رہی تھی۔

اسی وقت علی بخش اندر داخل ہوا...... سورٹھ نے فوراً سر پہ اجرک رکھ لی اور سر جھکا دیا...... محرم...... صحن میں رلی بچھی چارپائی پر اس وقت دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔

''سلام ادا......!'' سورٹھ نے ادب سے اپنا سر جھکاتے ہوئے اپنے جیٹھ علی بخش کو سلام کیا، علی بخش نے خاموشی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر چارپائی پر بیٹھ گیا...... اب دونوں بھائی آمنے سامنے شیر و شکر بیٹھے تھے...... محرم نے فوراً اپنی بیوی کو کہا۔ ''سورٹھ بھا علی بخش کے لیے بھی مانی (کھانا) لے آ......''

سورٹھ رسوئی کی طرف بڑھ گئی...... محرم چاولوں کی روٹی کا نوالہ توڑ کر علی بخش کو دعوت دیتے ہوئے بولا۔ ''بھا علی بخش!...... جب تک تیری روٹی آتی ہے...... میرے ساتھ شروع ہو جا...... تجھے بھک لگی ہو گی۔'' جب سے دونوں ماں بیٹوں کو اللہ کی طرف سے معجزاتی ہدایت نصیب ہوئی تھی...... محرم کا رویہ علی بخش سے یکسر بدل گیا تھا وہ اب اسے اپنا حقیقی بڑا بھائی سمجھنے لگا تھا...... یہی وجہ تھی کہ وہ اسے ''بھا'' کہہ کر ہی مخاطب کرتا تھا۔ علی بخش نے بھی برادرانہ بے تکلفی سے نوالہ توڑا اور ساگ کے ساتھ لگا کر کھانا شروع کر دیا...... تاہم اس کی عجیب سی خاموشی کو بھانپتے ہوئے محرم نے پوچھا۔ ''بھا...... خیر تہ آ...... کچھ پریشان سا نظر آ رہا ہے، کوئی مسئلہ ہے تو بول......''

علی بخش اس کی بات پر ذرا چونکا...... پھر اس نے اپنی گردن کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے گویا ثابت نوالہ نگلا پھر قدرے دھیمے لہجے میں بولا...... ''وہ...... ساون کو شاید پولیس پکڑ کر لے گئی ہے......''

محرم...... ساون سے اچھی طرح واقف تھا، قدرے چونک کر بولا۔ ''اچھا...... کس الزام میں......؟'' ادھر سورٹھ بھی تب تک علی بخش کے لیے کھانا لے کر چارپائی کے قریب آ چکی تھی، ساون سے متعلق بات اس کی سماعت تک پہنچ چکی تھی...... لہٰذا وہ اپنے چہرے پر ابھرنے والے اچانک تاثرات پر قابو پاتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو کر علی بخش کے آگے روٹی کی ٹوکری رکھنے لگی۔ علی بخش پھر جواباً بتانے لگا۔

''وہ...... چاچا سوڈھل...... نہیں تھا...... جس کے قتل میں پولیس نے بابا کو دھر لیا تھا...... اس کی بھتیجی تھی ایک اللہ رکھی...... اسے ورغلانے اور اغوا کے الزام میں...... پولیس نے ساون کو گرفتار کر لیا ہے۔''

''او...... اچھا۔'' محرم ازراہ حیرت بولا اور اضافہ کیا...... ''یہ اللہ رکھی، وہی تو نہیں جس سے بابا سائیں......''

''ہا...... وہی ہے یہ لڑکی......'' علی بخش اس کی بات کاٹ کر بولا اور روٹی کا نوالہ توڑنے لگا...... ادھر سورٹھ کے دل میں ساون کی گرفتاری کا سن کر...... دھکڑ پکڑ سی شروع ہو چکی تھی...... اور وہ دونوں بھائیوں کی مزید گفتگو سننے کے لیے دانستہ قریب ہی کھڑی رہی۔

''میرا تو خیال ہے پولیس نے بے چارے ساون کو بلاوجہ ہی گرفتار کیا ہے۔'' محرم نے نوالہ نگل کر دوسرا بناتے ہوئے غیر جانبدارانہ تبصرہ کیا۔ مگر علی بخش اس کی بات سے قطعاً متفق نہیں ہوا اور فوراً بولا۔

''پورے گوٹھ کا متفقہ خیال یہی ہے کہ پولیس نے ساون کو درست گرفتار کیا ہے۔''

''چلو...... پھر ہمیں اس سے کیا مطلب بھلا......؟'' محرم بولا اور علی بخش کا منہ اس کی بات سن کر نوالہ چباتے ہوئے رک گیا اور پُرسوچ نظروں سے محرم کے چہرے کے جانب تکتے ہوئے گویا بڑبڑانے والے انداز میں بولا...... ''ہمیں اس سے بڑا مطلب ہے...... محرم......''

محرم اس کے پُراسرار لہجے پر چونک کر علی بخش کی طرف تکنے لگا...... پاس کھڑی سورٹھ بھی...... ذرا چونکی...... خیراں اس وقت وہاں موجود نہ تھی۔

''میں سمجھا نہیں......'' محرم نہ سمجھنے والے انداز میں فوراً بولا تو علی بخش نے سورٹھ کی جانب دیکھا...... محرم نے اس کا اشارہ بھانپتے ہوئے سورٹھ کو وہاں سے چلے جانے کا کہا۔

''محرم!...... تُو شاید بھول رہا ہے کہ...... بابا سائیں...... اللہ رکھی سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔'' سورٹھ کے وہاں سے چلے جانے کے بعد علی بخش محرم کو مخاطب کر کے بولا...... تو وہ بہ دستور استفسار طلب نظروں سے علی بخش کی جانب تکنے لگا...... علی بخش پھر صراحت بھرے لہجے میں بتانے لگا۔ ''ساون اللہ رکھی سے شادی کرنا چاہتا ہے...... مگر اللہ رکھی بابا سائیں کی منگ تھی اور یہ بات سوڈھل چاچا کے ساتھ طے ہو چکی تھی...... اگرچہ اب دونوں اس دنیا میں نہیں رہے...... مگر اس لحاظ سے اب اللہ رکھی گوٹھ کے کسی بھی شخص سے بیاہ نہیں کر سکتی......''

''ہوں...... بات تو درست ہے تیری...... مگر اب ساون سے کیسا جھگڑا...... وہ تو اندر ہی ہو گیا ہے......'' محرم نے آخر اظہار خیال کیا...... اور علی بخش کچھ سوچتے ہوئے چپ ہو رہا...... اندر رسوئی میں بیٹھی سورٹھ کے کانوں تک علی بخش کے کھرکھراتے لہجے کی گونج پہنچ چکی تھی اور وہ یک دم متوحش سی نظر آنے لگی۔

☆======☆======☆

ثقافتی کونسل کی نائب منتظم، رشیدہ پیرانی کے روزینہ کی والدہ اختر بانو سے کافی گہرے اور پرانے مراسم تھے...... نٹ کھٹ روزینہ کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے ایک دن معصوم اللہ رکھی...... کے بنائے ہوئے فن دست کاری کے ثقافتی نمونوں کی نمائش کا پروگرام بنا ڈالا...... اور نہ صرف یہ...... بلکہ اسے انجام تک بھی پہنچایا...... ان نادر نمونوں میں...... اجرک...... لکڑی کی چھوٹی بیل گاڑیاں...... کڑھائی کیے ہوئے گلے کی قمیصیں، جھلملاتے پراندے اور خوبصورت رلیاں شامل تھیں اور جن معصوم ہاتھوں نے ان بیش بہا

ثقافتی نمونوں کو اتنی محنت شاقہ اور خون پسینے سے سینچا تھا اس کے اعتراف میں بہ طور خراج تحسین...... ایک مقامی اور غیر سرکاری سوشل تنظیم نے مبلغ ایک لاکھ روپے بھی دیئے تھے...... جبکہ بعد میں ان مذکورہ دست صناعی کے شاہکاروں کی ہاتھوں ہاتھ فروخت سے جو آمدنی ہوئی تھی وہ رقم اس سے بھی سوا تھی...... روزینہ تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی...... وہ بڑے فخر و انبساط اور ہر ایک سے اللہ رکھی کا تعارف اپنی سگی بہن ہی کے طور پر کروا رہی تھی...... جاننے والے روزینہ کی اللہ رکھی سے بے انتہا محبت بھی پر محمول کرتے ہوئے زیر لب مسکرا دیتے تھے...... روزینہ اللہ رکھی سے اپنے ''تعلق'' پر بڑا فخر محسوس کر رہی تھی، بہر طور جب روزینہ نے ایک دن اللہ رکھی کے آگے ڈھیروں روپے رکھتے ہوئے اسے مطلع کیا۔ ''اگرچہ یہ اس کے فن...... کی قیمت نہیں ہے کیونکہ فن انمول ہوتا ہے۔ وہ محض اچھے اور ستھرے احساسات و جذبات کا اظہار چاہتا ہے...... اور وہ اس کی قیمت بھی ہوتی ہے...... لیکن یہ روپے محض ایک رسم دنیا کے طور پر ہیں......''

اللہ رکھی بے چاری پھٹی پھٹی آنکھوں سے اتنے ڈھیر سارے نوٹوں کو...... تکے جا رہی تھی پھر تحیر آمیز لہجے میں روزینہ کو مخاطب کر کے بولی۔ ''یہ اتنے سارے روپے میرے ہیں؟''

روزینہ...... اللہ رکھی کے بھولپن پر زیر لب مسکرا دی اور بولی۔ ''ہاں...... میری پیاری بہن!...... یہ تمہارے ہیں سب۔''

''لیکن کیوں...... میں نے تو کسی سے بھی یہ روپے نہیں مانگے......''

''تم نے نہیں مانگے لیکن یہ تمہاری اس معصوم محنت کے صلے میں ایک معمولی سا نذرانہ ہے...... جو چیزیں تم نے تیار کی تھیں اور جس کی آرٹ گیلری میں نمائش کی گئی تھی...... وہ سب بڑے بڑے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ خرید لی ہیں...... یہ رقم انہی چیزوں کی ہے......'' روزینہ نے پُرزور لہجے میں اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا...... تو اللہ رکھی کی خوبصورت و دلکش حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں کا تحیر سوا ہو گیا اور وہ اسی لہجے میں بولی۔

''میری بنائی ہوئی چیزوں کی اتنی ساری قیمت...... وہ اتنی قیمتی تو نہ تھیں...... ایسی چیزیں تو ہمارے گوٹھ کی ہر چھوکری بنا لیتی ہے......''

''تمہارا گوٹھ جو خوبصورت ہے اس لئے......'' روزینہ نے پیار سے اللہ رکھی کے ملیح چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''لیکن میں اتنے روپوں کا کیا کروں گی!...... ایسا کرو یہ سب تم رکھ لو......''

''ہاں انہیں میں ہی رکھ لیتی ہوں ...... لیکن یہ تمہاری امانت ہوگی میرے پاس ......'' روزینہ نے نرم لہجے میں کہا۔

معاً کال بیل کی گنگناہٹ سی گونجی ...... اور دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ لمحہ بھر کے لیے منقطع ہوگیا اس وقت سرد شام اپنے سرمئی گیسو دراز کر رہی تھی ...... کمرے میں دو ہزار واٹ کا برقی ہیٹر آن تھا یہ اللہ رکھی اور روزینہ کا مشترکہ کمرہ تھا۔

''پتہ نہیں کون ہے باہر ...... ویسے دینو گیا ہوگیا دروازہ کھولنے ......'' روزینہ بڑبڑائی ...... اور پھر اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئی ...... یہاں بھی کمرے کی فضاء کو برقی ہیٹر سے گرم رکھا گیا تھا ...... ایک سکون آمیز خاموشی پھیل ہوئی تھی ...... ایک صوفے پر اختر بانو حسب معمول سادہ سی ساڑھی میں بیٹھی سوئیٹر بننے میں مصروف تھیں ...... اتنے میں دینو نے آکر اختر بانو کو بتایا۔ ''بی بی جی! باہر کچھ لوگ آئے ہیں ...... آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟''

اختر بانو ذرا چونکی پھر بولی۔ ''کون لوگ ہیں وہ ...... کس لئے ملنا چاہتے ہیں؟''

''بی بی جی ......! پہلے کبھی تو انہیں نہیں دیکھا میں نے ...... کہہ رہے تھے ...... وہ کسی داد پور نامی گاؤں سے آئے ہیں ...... چھوٹی بی بی اللہ رکھی ...... کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں ......''

اس کی بات سن کر روزینہ کو ایک جھٹکا سا لگا ...... تاہم بیگم اختر بانو نے ملازم کو انہیں اندر بلانے کی ہدایت کی اور اوڑھی ہوئی سیاہ شال کو درست کرنے لگی ...... روزینہ گومگو کے عالم میں اپنے کمرے میں آگئی ...... وہ کچھ متفکر سی نظر آنے لگی تھی۔ ادھر دینو کے ساتھ منشی میرل کاٹن کے کلف لگے شلوار قمیض اور واسکٹ پر اجرک پھیلائے ...... دو آدمیوں سمیت بڑے کروفر کے ساتھ چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ خانو دھچر نہیں تھا وہ باہر جیپ میں موجود تھا ...... اختر بانو کو دیکھ کر منشی میرل نے اپنے مخصوص لہجے میں سلام کیا جس کا اختر بانو نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا اور ساتھ ہی سنجیدہ نظروں سے منشی میرل کی جانب تکتے ہوئے اسے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شفاف عدسوں اور سنہری فریم والی عینک کے عقب سے ان کی پُر متانت نگاہیں منشی میرل اور اس کے عقب میں تنے کھڑے دونوں خدمت گاروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''میرا نام منشی میرل ہے ...... اور میں گوٹھ داد پور سے آیا ہوں ......'' منشی میرل نے کہنا شروع کیا۔ اختر بانو ہمہ تن گوش تھیں انہیں جانے کیوں یہ سب لوگ ایک خاص عجلت کا شکار نظر آرہے تھے ...... منشی میرل کو اگرچہ اپنا لہجہ بدل کر بولنے میں دقت ہو رہی تھی مگر اس

نے اپنی سی کوشش جاری رکھی ...... ''میں اللہ رکھی کے سلسلے میں آیا ہوں ...... اور ساتھ ہی آپ کا شکر گزار بھی ہوں کہ آپ نے ہماری گوٹھ کی چھوکری کو اپنے گھر پناہ دی ...... اور اس کا علاج بھی کروایا ......'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے عقب میں کھڑے ایک خدمت گار کو اشارہ کیا جس نے فوراً اپنی کھلی ڈلی قمیض کی جیب سے ایک چیک بک نکال کر نہایت مؤدبانہ انداز میں منشی میرل کی جانب بڑھا دی ...... پھر منشی چیک بک اس سے لے کر اپنی گود میں کھولتے ہوئے پین سنبھال کر اختر بانو کی جانب تکتے ہوئے بولا ...... ''آپ کے اس ہمدردانہ رویے سے ہمارے وڈے سائیں لکھ میر خان بہت خوش ہوئے ہیں ...... اور انہوں نے خاص طور پر ہمیں آپ کے پاس پہنچنے کی ہدایت کی ہے اور اللہ رکھی کے سلسلے میں جو خرچہ آپ نے اب تک کیا وہ ہم آپ کو دینے کے لیے تیار ہیں ...... سائیں وڈے نے ایک خالی چیک پر اپنے دستخط کر دیئے ہیں ...... اب آپ بولیں کتنی رقم دوں ......'' منشی میرل نے اپنی بات ختم کی اور اختر بانو کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا ...... جبکہ اختر بانو کے چہرے پر یک دم ناگوار تاثرات ابھر آئے تھے ...... لہٰذا جب پہلی بار منشی میرل کو مخاطب کر کے بولی تو اس کے لہجے کی تلخی چھپی نہ رہ سکی۔

''منشی صاحب! آپ کے سائیں وڈے کا دل تو واقعی بڑا ہے لیکن دماغ چھوٹا لگتا ہے ...... تبھی انہوں نے ہمارے بارے میں اتنی چھوٹی بات سوچی اور آپ کو ''خالی چیک'' پر دستخط کر کے بھیج دیا ...... رہی بات اللہ رکھی کی تو اس پر ہم نے کوئی احسان نہیں کیا ہے ...... اور جو ہم تھوڑا بہت اس معصوم لڑکی کے ساتھ کر سکے ہیں ...... وہ ہمارا ایک انسان ہونے کے ناتے فرض تھا ......'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئیں مگر چہرے پر ان کے تلخی ہنوز مترشح تھی۔

منشی میرل اختر بانو کی بات پر قدرے جز بز تو ہوا مگر پھر ڈھٹائی سے کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا ...... ''نہیں نہیں جی یہ بات نہیں ...... آپ نے ہمیں غلط سمجھا ...... دراصل ......''

''میرا خیال ہے آپ کام کی بات کر لیں تو بہتر ہوگا۔'' اختر بانو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے کہا ...... درحقیقت منشی کی بات پر ان کا موڈ ہی خراب ہو چکا تھا اور وہ ...... اس کے ''وڈے سائیں'' سمیت اس کی ''اعلیٰ ذہنیت'' کا بہ خوبی اندازہ لگا چکی تھی۔

اس بار منشی کے چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ دوڑ گئی ...... لہٰذا وہ عیاری سے بات بناتے ہوئے بولا۔ ''آپ ٹھیک کہتی ہیں ہمیں واقعی افسوس ہے ...... بہر حال ...... اگر آپ اسے اب ہمارے ساتھ روانہ کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی ...... کیونکہ گوٹھ میں اس کے عزیز رشتے دار پریشان ہو رہے ہیں۔'' اس کی بات پر اختر بانو نے قدرے چونکتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ جہاں تک ہمیں اللہ رکھی کے بارے میں علم ہوا ہے کہ اس کا گوٹھ میں اب کوئی نہیں رہا...... وہ ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی ہے...... جبکہ ایک چاچی کا حال ہی میں یہاں کے ہسپتال میں انتقال ہوا ہے......'' اختر بانو نے دانستہ ساون کا نام نہیں لیا تھا...... مگر کائیاں منشی سیانے کوے کی طرح بھانپ گیا تھا کہ اس خاتون کو اللہ رکھی سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا فریضہ ضرور ساون ہی نے سرانجام دیا ہوگا...... لہٰذا ایک دم محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو شاید یہ بات اس ساون نامی چھوکرے نے بتائی ہوگی جو اللہ رکھی کو گوٹھ سے شہر لایا تھا لیکن شاید پھر اللہ رکھی اس کے شیطانی چنگل سے کسی طرح نکل کر آپ کے پاس پہنچ گئی...... اللہ رکھی بے شک ایک یتیم لڑکی ہے...... لیکن یہ غلط ہے کہ اس کا دنیا میں اب کوئی نہیں رہا...... پورے گوٹھ میں اس کے رشتے دار موجود ہیں......'' وہ خاموش ہوا۔

اختر بانو گہری نظروں سے میرل کی طرف دیکھ رہی تھیں...... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے تاہم مختصراً بولی۔ ''بہر حال اب آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''بس یہی کہ آپ اللہ رکھی کو ہمارے ساتھ کر دیں...... ہمارا خیال ہے وہ اپنے گوٹھ میں...... اپنے لوگوں کے ساتھ زیادہ خوش رہے گی۔'' منشی میرل نے مکاری سے اختر بانو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا...... اس نے لفظ اپنے لوگوں پر زیادہ زور دیا تھا۔

اختر بانو اس کی بات پر سوچ میں غلطاں ہو گئی...... پھر چند ثانیے بعد بولی...... ''منشی صاحب!...... اللہ رکھی کو آپ لوگوں کے حوالے کرنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں...... لیکن...... بات یہ ہے کہ اس کی ایک حادثے میں یادداشت چلی گئی ہے وہ کسی کو پہچاننے سے قاصر ہے...... اور دوسری اہم بات یہ کہ وہ ہم سے کافی مانوس ہو چکی ہے اس کا علاج بھی جاری ہے...... اس حالت میں اس کا آپ لوگوں کے ساتھ جانا اللہ رکھی کے لیے نامناسب ہوگا......''

ان کی بات کے اختتام پر منشی میرل کے چہرے پر یکدم گہری سنجیدگی سی کھنڈ آئی اور وہ بولا...... ''میرا تو خیال ہے اللہ رکھی اگر اپنے لوگوں اور اپنے گوٹھ...... میں رہے گی تو اس کی گمشدہ یادداشت پر زیادہ خوشگوار اثر پڑے گا جو اس کی یادداشت لوٹانے میں معاون ثابت بھی ہوگا۔'' منشی میرل کی اس دلیل نے اختر بانو کو لاجواب سا کر دیا۔

مگر وہ بہر طور اتنی جلدی اور بغیر کسی شناخت کے اللہ رکھی کو ان کے حوالے کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی مگر ویسے اسے منشی میرل کی بات دل کو لگی تھی کہ اللہ رکھی کی گمشدہ

یادداشت کو لوٹانے کے لیے اس کے اپنے سابقہ ماحول اور لوگوں کے بیچ میں رہنا زیادہ بہتر تھا...... اور یہی مشورہ اس کے معالج نے بھی انہیں کئی بار دیا تھا...... ادھر منشی میرل کی مکار آنکھیں اپنی فنکارانہ گفتگو کی اثر پذیری اختر بانو کے چہرے پر بھانپنے میں کوشاں تھیں بالآخر اختر بانو نے سیدھے سبھاؤ اپنے خیال کا اظہار کر ڈالا اور بولی...... ''دیکھئے بات آپ کی درست سہی...... لیکن ہم ایک جوان جہاں لڑکی کو کس طرح ایسے لوگوں کے حوالے کر دیں جنہیں ہم بھی نہ جانتے ہوں...... اور وہ بھی اس صورت میں...... جبکہ وہ ہم میں گھل مل بھی گئی ہو......''

''بی بی...... ہماری جہاں تک پہچان کی بات ہے تو...... ہم اللہ رکھی کے لیے پرائے نہیں ہیں...... یا اجنبی نہیں ہیں......'' منشی میرل پھر کوئی دلیل تلاش کرنے میں محو ہو گیا...... بہر حال اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ویسے آپ کا شک بھی اپنی جگہ بجا ہے...... اب جیسے آپ کہیں...... ویسا ثبوت ہم دینے کی آپ کو کوشش کریں گے......'' منشی میرل نے بات ختم کی تو اختر بانو کے شفاف چہرے پر ایک بار پھر سوچ کی لکیریں نمودار ہو گئیں...... وہ سوچنے لگی کہ آخر ایسا کون سا ثبوت ان سے مانگے...... جس سے وہ خود مطمئن ہو کر اللہ رکھی کو ان کے حوالے کر دے۔ تب اچانک ان کے دماغ میں اس سیدھے سادے دیہاتی سے لڑکے ساون کا چہرہ گھوم گیا...... وہ انہیں کافی حد تک سچا محسوس ہوا تھا...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اللہ رکھی کے زیادہ ''قریب'' اور اس کے گاؤں کا بھی تھا...... بالآخر وہ بولیں۔

''ساون کو تو یقیناً آپ جانتے ہی ہوں گے...... میرا خیال ہے اگر وہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہوتا تو شاید کچھ سوچا جا سکتا تھا......''

ان کی بات پر منشی میرل ذرا چونکا۔ اسے اس بات کا تو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اختر بانو...... اتنی آسانی سے اللہ رکھی کو ان کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوں گی...... اور نہ ہی منشی میرل زبردستی کرنا چاہتا تھا کیونکہ...... وہ اختر بانو کے اثر و رسوخ سے واقف تھا...... پہلے تو اس کا یہی ارادہ تھا کہ اگر کوئی ایسے ویسے لوگ ہوئے تو ان کے ساتھ دھونس دھمکی سے بھی کام چلایا جا سکتا تھا مگر یہاں آتے ہی اس کا ارادہ بدل گیا تھا...... تب اس نے اختر بانو کی بات پر غور کیا کہ اگر وہ ساون کے ساتھ اللہ رکھی کو ان کے حوالے کرنے پر مصر ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں...... ساون کو پلک جھپکتے یہاں لایا جا سکتا تھا لہٰذا پھر وہ اختر بانو سے یہ وعدہ لے کر رخصت ہو گیا کہ وہ اگلی بار ساون کو لے کر آئے گا...... اور تب اللہ رکھی کو ان کے ساتھ جانے پر کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔

☆======☆======☆

''معاف کرنا سائیں وڈا...... ! آپ نے ساون کو اندر کروا کر صحیح نہیں کیا......'' منشی میرل دبے دبے لہجے میں بولا۔

اس نے گوٹھ پہنچتے ہی...... وڈیرے لکھ میر خان سے اختر بانو سے متعلق ساری گفتگو گوش گزار کر دی تھی...... مگر جب اسے یہ پتہ چلا کہ ساون حوالۂ پولیس ہو چکا ہے اور مزید یہ کہ یہ سب وڈیرے کے ایما پر ہوا ہے تو اس نے بلا تامل اپنے خیال کا اظہار وڈیرے سے کر ڈالا تھا۔ وڈیرا اس کی بات پر کھر کھراتے لہجے میں بولا۔

''منشی! ...... ساون کو اندر کروانے کا مقصد میرا یہ تھا کہ اللہ رکھی کو اغوا یا فروخت کروانے والی بات زیادہ سے زیادہ پھیلے...... پھر جب تم اللہ رکھی کو کسی طرح یہاں لے آتے تو......'' وڈیرا دانستہ اپنی آنکھ مکاری سے میچتا ہوا چپ ہو رہا اس کی نگاہیں منشی کے چہرے کی طرف تھیں۔

منشی نے وڈیرے کی بات سن کر اپنے ناریل جیسے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی پھر بولا۔ ''مگر سائیں وڈا اب کیا کیا جائے ساون کو تو اب اپنے ساتھ شہر لے جانا پڑے گا اس ''جج صاحبہ'' کے سامنے......'' منشی کا اشارہ بلاشبہ اختر بانو کی طرف ہی تھا۔

''ہالا بابا...... تو پھر ٹھیک ہے...... ساون کو ضمانت پر رہا کروا دیتے ہیں...... میں خود اس کی ضمانت کرواؤں گا...... ابھی وہ ادھر ہی کے تھانے میں ہے...... اپڑیں انسپکٹر ارشد کے پاس......'' وڈیرا اپنے مخصوص لہجے میں بولا...... اور منشی عیاری سے ہنستے ہوئے بولا۔

''ہا سائیں وڈا...... ! یہ تو اور بھی اچھا ہو جاوے گا، اس چھوکرے ساون پر ہمارا احسان بھی ہو جائے گا...... اور...... اور پھر ہم اسے سکھا...... بہلا کر...... اختر بانو کے بنگلے میں لے جائیں گے، مگر پھر......'' وہ رک گیا اور الجھن آمیز نظروں سے وڈیرے کی طرف تکنے لگا۔

''میں تیری بات سمجھ رہا ہوں منشی۔'' وڈیرا جلدی سے بولا...... ''اللہ رکھی کو ایک بار بنگلے سے نکال تو لے...... ساون کو بھی دیکھ لیں گے......'' پھر وہ منشی میرل کو سرگوشی میں کچھ سمجھانے لگا۔

☆======☆======☆

''چل چھوکرے تیری ضمانت ہو گئی...... باہر نکل آ......'' ایک سپاہی نے حوالات کی

سلاخوں پر ڈنڈا بجاتے ہوئے بوسیدہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ساون کو کڑک دار لہجے میں مخاطب کیا اور ساون چونک کر اٹھ بیٹھا...... اس کے پژمردہ چہرے پر یکایک حیرت عود آئی تھی...... شاید اسے اتنی جلدی اپنی رہائی کی امید نہ تھی...... بہرطور وہ باہر نکلا اور سپاہی اسے لے کر ارشد کے کمرے میں لے آیا وہاں منشی میرل بھی موجود تھا۔

''سائیں وڈے کا اپنے شکریہ ادا کر ڑے چھوکرا، جو تیری ضمانت بھیجی اس نے۔''

سامنے ایک بھاری بھرکم میز کے عقب میں بیٹھے پولیس انسپکٹر ارشد نے ساون کو گھورتے ہوئے کہا اس کا اشارہ وڈیرے لکھ میر خان کی طرف تھی...... جواباً ساون خاموش رہا...... منشی غالباً عجلت میں تھا لہٰذا ساون کے کمرے میں آتے ہی انسپکٹر ارشد سے بولا۔

''وڈی مہربانی سائیں...... ! اب ہم کو اجازت دو۔'' یہ کہتے ہوئے منشی میرل کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

باہر سرد شام کی کاٹ دار ہوا چل رہی تھی اس وقت اوطاق میں تین افراد کے باوجود سکوت چھایا ہوا تھا...... ان کے سپاٹ چہروں سے عیاں تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے کسی اہم سنجیدہ گفتگو میں مصروف رہے تھے...... تین افراد...... میں سے ایک وڈیرا میر لکھ میر خان، منشی میرل اور ساون تھے...... کچھ دیر پہلے ہونے والی اس اہم گفتگو میں وڈیرا لکھ میر خان ہی بولتا رہا تھا...... وہ اپنی گفتگو میں ساون کو یہ باور کروانا چاہتا تھا کہ...... معصوم اللہ رکھی جس کا دنیا میں اب کوئی نہیں رہا...... وہ اصول طور پر اب حویلی کی ''پناہ'' میں رہنے کی حق دار تھی جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو جائے...... یہ گوٹھ کا ایک عام اور پرانا رواج تھا۔ دوسرا وڈیرے نے ساون کو اپنے ساتھ ملا کر اور اختر بانو کے بنگلے سے اللہ رکھی کو اس کی ''پناہ'' سے نکال کر اپنی حویلی لانے کی خاطر اسے راضی کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ان دونوں یعنی اللہ رکھی اور ساون کی آپس میں شادی کا بھی بندوبست کرے گا...... پھر بھلے وہ دونوں آرام وسکون سے اپنی زندگی بسر کریں...... مزید یہ کہ اس طرح اللہ رکھی کی گمشدہ یادداشت کے لوٹ آنے کے بھی قوی امکان تھے۔

یہ تھیں چالاک وڈیرے کی چکنی چپڑی باتیں جس نے ساون کو بالآخر کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا...... اور وہ اب خاموش مونڈھے پر بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے...... ساون نے ان کے ہمراہ شہر جانے کی فوری ہامی بھر لی...... وہ ایک سادہ لوح انسان تھا...... وڈیرے کی گھناؤنی سازش سے بالکل بے خبر...... بہرطور صبح تڑکے ساون کا

منشی میرل کے ساتھ شہر جانے کا پروگرام طے ہوا...... ادھر منشی میرل نے خانو کو دانستہ منظر عام سے ہٹا دیا تھا...... کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ خانو دھچر کو ساون سخت ناپسند کرتا ہے۔

اگلے دن علی الصباح منشی میرل، ساون اور چند خدمت گاروں کے ساتھ جیپ میں سوار ہو کر شہر لاڑکانہ چل دیئے...... سارے راستے ساون کی عجیب ذہنی کیفیت رہی...... وہ سوچ رہا تھا کیا اللہ رکھی ان کے ساتھ جانے پر راضی ہو جائے گی جبکہ وہ تو اب ساون کو بھی پہچاننے کی روادار نہ رہی تھی...... بہر طور...... یہ لوگ سب اختر بانو کے بنگلے پر پہنچ گئے......

ادھر روزینہ کو جب اس بات کا علم ہوا کہ اللہ رکھی کو لینے اس کے گوٹھ سے ساون سمیت کچھ لوگ آ رہے ہیں تو وہ یکدم پریشان اور غم زدہ سی ہو گئی...... کیونکہ وہ اتنے عرصے میں معصوم اللہ رکھی سے بہت مانوس ہو چکی تھی...... بلکہ وہ کیا...... دونوں ہی ایک دوسرے کے خاصی قریب آ چکی تھیں۔

روزینہ نے دبے دبے لہجے میں اپنی ماں اختر بانو سے احتجاج بھی کیا کہ...... کم از کم اللہ رکھی کو اس کی یادداشت لوٹنے تک یہیں رہنا چاہئے تھا...... مگر اس کی ماں کا بدستور یہی مؤقف تھا کہ اللہ رکھی کا اپنے لوگوں میں لوٹنا ہی بہر حال بہتر تھا تاکہ اس کی کھوئی ہوئی یادداشت کے دوبارہ لوٹنے کے روشن امکانات پیدا ہو سکیں۔

''نہیں میں ان لوگوں کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی...... میں تم سے دور نہیں ہو سکتی......'' اللہ رکھی تڑپ کر بولی۔

روزینہ جو اپنی ماں کی ہدایت کے مطابق چار و ناچار اللہ رکھی کو ذہنی طور پر ساون وغیرہ کے ساتھ واپسی لوٹنے کے لیے تیار کر رہی تھی...... اس کی بات پر وہ اور بھی رنجور سی ہونے لگی اور بے اختیار بھیگی ہوئی نظروں سے اس کے معصوم چہرے کی جانب تکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور جب بولی تو اس کی آواز میں گہری رقت تھی۔ ''میری پیاری بہن!...... تجھے خود سے جدا کرنے کو تو میرا بھی جی نہیں چاہ رہا...... مگر مجبوری ہے اور اس میں تیرا بھی بھلا ہے......'' روزینہ ذرا چپ ہوئی۔ پھر ذرا مختلف انداز میں سمجھاتے ہوئے قدرے رسان سے بولی۔ ''دیکھ اللہ رکھی...... وہ جو لڑکا ہے نا ساون...... وہ تجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ مجھے تو اس بے چارے پر بھی ترس آتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں تُو اس کے ساتھ گوٹھ جاتے ہی بیاہ کر لینا......'' اس کی بات سن کر اللہ رکھی نے ذرا چونک کر روزینہ کی طرف دیکھا اس کے معصوم چہرے پر سرخی سی تیر گئی تھی...... پھر فوراً اس نے اپنی نگاہیں جھکا دی تھیں۔

''اور پھر تو کون سا ہمیشہ کے لیے خدانخواستہ ہم سے جدا ہو رہی ہے...... ساون سے شادی کے بعد...... بھی ہم تجھ سے ملتے رہیں گے...... یوں سمجھ ہم تیرے میکے کے ہوں گے......'' روزینہ کی بات سن کر بے اختیار اللہ رکھی کے دلکش لبوں پر ایک معصوم مسکراہٹ مچل گئی...... اور روزینہ پھر اسے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے تسلی دے کر بولی۔ ''پتہ ہے...... ممی کا بھی یہی خیال ہے کہ تجھے ساون سے فوری شادی کر لینی چاہئے...... ساون امی کو بھی پسند ہے...... اور ممی کی بات کبھی غلط نہیں ہوتی۔''

بالآخر اللہ رکھی نے آخری بار اپنی بھیگی ہوئی پلکوں کو اٹھا کر روزینہ کی طرف افسردہ نگاہوں سے دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''مت رو...... میری بہن...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے...... تُو اگر ساون سے شادی کر لے گی تو دیکھنا ایک نہ ایک دن تجھے سب کچھ یاد آ جائے گا...... اور تب تُو...... اپنے ''کھوئے'' ہوئے ساون کو پا کر بہت خوش ہو گی...... لیکن...... لیکن...... پھر شاید ہمیں تو بھول جائے...... اللہ رکھی......'' روزینہ نے اچانک افسردہ ہوتے ہوئے کہا...... اور اس کی سوجی ہوئی غم آگیں نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جم سی گئیں۔

☆======☆======☆

اختر بانو ایک جرأت مند اور نڈر خاتون تھیں...... وہ اللہ رکھی کی...... سپردگی کو مکمل طور پر قانونی بنانے کی غرض سے...... منشی میرل وغیرہ کے ساتھ گوٹھ داد پور وڈیرے کی حویلی تک جانے کے لیے خود تیار ہو گئیں...... اور نہ صرف یہ...... بلکہ انہوں نے اپنے ہمراہ ایک قریبی جاننے والے ایڈووکیٹ...... افتخار احمد کو بھی ساتھ لے لیا تھا...... روزینہ بھی ہمراہ تھی...... یہ لوگ سب اپنی کار میں سوار تھے...... اللہ رکھی کار میں ہی موجود تھی جبکہ ساون اور منشی میرل وغیرہ...... ایک الگ جیپ میں براجمان تھے...... یہ مختصر سا قافلہ گوٹھ داد پور کی طرف روانہ ہوا۔

اللہ رکھی اور روزینہ کے چہروں پر افسردہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی...... جبکہ اختر بانو جو ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھیں...... ان کے جہاندیدہ چہرے سے تفکر نمایاں تھا ادھر ان کے آگے موجود جیپ میں ساون کی دلی کیفیت بھی عجیب ہو رہی تھی۔ اسے خوشی کا بھی احساس ہو رہا تھا اور ذہن کے کسی عمیق گوشے میں ایک ''کھٹک'' کا بھی احساس بے چین کئے دے رہا تھا...... بہر طور...... لگ بھگ گھنٹہ بھر پختہ سڑک پر محو سفر رہنے کے بعد یہ گاڑیاں داہنی جانب کچے میں اتر گئیں...... یہاں سے قریباً آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں بالآخر

خاصے وسیع رقبے تک پھیلی ہوئی پختہ پتھروں سے بنی حویلی کے سامنے آن رکیں۔

سب سے پہلے جیپ میں سے خاصی عجلت میں منشی میرل اترا...... اس کے چہرے پر خاصا تردد پایا جاتا تھا...... پھر آناً فاناً حویلی کا مہمان خانہ کھلوا دیا گیا...... اور یہ سب لوگ وہاں آ گئے...... اس ہال کمرے کی چھت خاصی اونچی تھی...... وہاں صوفے اور سرکنڈوں کے مونڈھے بھی موجود تھے خدمت گار اور چاکر حرکت میں آ چکے تھے...... ان لوگوں کو وہاں چھوڑ کر میرل...... خاموشی کے ساتھ کھسک گیا اور سیدھا کمرۂ خاص میں جا دھمکا وہاں...... وڈیرا امیر لکھ میر خان مہمانوں سے ملاقات کی تیاری میں مشغول تھا...... اس کے چہرے پر بھی خاصی پریشانی پائی جاتی تھی۔ منشی کو دیکھتے ہی وہ درشتگی سے بولا۔

''اڑے میرل!...... میں نے تجھے صرف اس چھوکری اللہ رکھی کو لانے کے لیے بھیجا تھا یہ تُو اپنے ساتھ پورے شہر کو اٹھا لایا...... میں نے سنا ہے کوئی وکیل بھی ساتھ آیا ہے تیرے......''

منشی میرل کے چہرے پر خجالت کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے پہلے ہی سے وڈیرے کی ناراضگی کا اندازہ تھا تاہم وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''سائیں بھوتار...... میرا کوئی قصور نہیں اس میں...... وہ زنانی (عورت) ہے نا اختر بانو...... بڑی چالاک ہے...... یہ سارا کیا دھرا اسی کا ہے...... میں لینے تو صرف اللہ رکھی کو ہی گیا تھا......''

''اچھا...... اچھا...... اب بس کر...... ملنا تو پڑے گا ہی ان سب سے......'' وڈیرا بیزاری سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بڑبڑایا...... اور منشی میرل خاموش رہا۔

☆======☆======☆

اندیشوں بھری شام...... دور غربی افق میں غروب آفتاب سے تاریکی مستعار لینے کے لیے پر تولے کھڑی تھی...... وڈیرا لکھ میر خان اپنے کمرۂ خاص میں موجود تھا...... اس کے سامنے میز لوازم آوارہ سے بھری ہوئی تھی۔ منشی میرل بھی سامنے مونڈھے پر بیٹھا کمینے پن سے وڈیرے کے بے خود ہوتے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''اڑے منشی......!'' معاً وڈیرے نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں سامنے بیٹھے منشی کو پکارا۔

''حاضر سائیں وڈا......!'' وہ مستعدی سے بولا۔

''یہ شہر والی عورت خود...... کو بڑا چالاک سمجھتی تھی...... ہیں......'' وڈیرے کے

لڑکھڑاتے لہجے میں گہرا نخوت آمیز طنز تھا۔ اس کا اشارہ اختر بانو کی طرف تھا۔

''سائیں...... ہو گی چالاک مگر اپنے لیے، وہ خوشی خوشی اللہ رکھی کو آپ کے حوالے کر گئی۔'' منشی میرل نے خوشامدی لہجے میں کہا اور وڈیرے کی مخمور آنکھوں میں بوالہوسی کی آمیزش مزید گہری ہو گئی...... پھر لمحہ بھر توقف کے بعد وڈیرا لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

''اللہ رکھی کے ساتھ کون ہے اس وقت؟''

منشی میرل وڈیرے کا اشارہ سمجھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ''سائیں وڈا!...... وہی آپ کی پرانی خادمہ فضلاں...... اڑیں خانو دھچر کی بہن...... وہی ہے اس کے ساتھ......''

''اڑے بابا! جا پھر دفعان ہو جلدی...... بول اس گدھی کو تکڑا...... اللہ رکھی کو ادھر لے کر آئے۔''

منشی فوراً باہر نکل گیا...... کمرے میں دانستہ روشنی کا اہتمام کم رکھا گیا تھا...... وڈیرے لکھ میر خان کو اپنا دل تیز تیز دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی مخمور نظریں کمرے کے واحد بند دروازے کی طرف تھیں...... اس کی آنکھوں میں ایک بڑی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی...... پھر دروازہ کھلا...... اور بھاری بھرکم فضلاں، معصوم اللہ رکھی کو لئے کمرے میں داخل ہوئی...... اللہ رکھی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح گھبرائی گھبرائی اندر داخل ہوئی۔

''ڑی...... سلام کر اڑیں سائیں کو......'' اس کے عقب میں کھڑی فضلاں نے معصوم اللہ رکھی کو ٹہوکا دیا۔

''بس تُو جا...... فضلاں...... اس کی بڑی بڑی آنکھیں تو خود مجھے سلام کر رہی ہیں۔'' وڈیرا مخمور نگاہوں سے اللہ رکھی کی دلکش مگر سراسیمہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا...... اور جب فضلاں وڈیرے کا اشارہ سمجھتے ہوئے ہٹنے لگی تو...... وڈیرے نے پھر بلند آواز میں فضلاں کو جاتے جاتے ہدایت دی...... ''ڑی...... باہر...... سناٹا کر دو...... کسی کی آواز مجھے سنائی نہ دے...... سمجھی......''

''جی سائیں!'' فضلاں کے لہجے میں واضح طور پر کپکپی عود کر آئی تھی اور پھر وہ چلی گئی۔

اب کمرے میں سکوت چھا گیا تھا جبکہ معصوم اللہ رکھی ہراساں ہرنی کی مانند وڈیرے کو دھیرے دھیرے اپنی جانب بڑھتے ہوئے خوف زدہ نظروں سے تکے جا رہی تھی...... وڈیرا اس کے بالکل قریب پہنچ کر بولا۔ ''اللہ رکھی!...... مجھ سے کاہے کو ڈرتی

ہے...... میں ...... میں تو تمہارا وڈا بھوتار ہوں...... آجا......'' یہ کہتے ہی وڈیرا اس پر جھپٹا...... اللہ رکھی کے حلق سے ایک تیز چیخ برآمد ہوئی اور وہ خود کو بچاتے ہوئے چند قدم پیچھے کو ہٹی تو اس کا پاؤں رپٹ گیا وہ فرش پر آ رہی...... اس کی اجرک نما چادر وڈیرے کے پنجے میں آ گئی تھی جسے اس نے عجلت میں پرے پھینک دیا اور زمین بوس کانپتی سسکتی اللہ رکھی پر آ رہا...... اللہ رکھی کو اپنی عزت کے خاک میں ملنے کے جاں سوز لمحات کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ وہ خود کو چھڑا کر دروازے کی جانب دوڑی تو وڈیرے کا ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے حرکت میں آیا اور اللہ رکھی منہ کے بل پختہ فرش پر گری اور اس کی پیشانی پر سخت چوٹ آئی...... بے اختیار وہ زور سے چیخی...... ایک لمحے تو اس کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے...... اور دل و دماغ کی بھی لمحہ بھر یہی کیفیت رہی مگر پھر جیسے اس کے ذہن اور دل سے تاریکی کا پردہ ظلمت چاک ہوا تو اچانک اسے یوں لگا جیسے وہ ایک دم خواب سے جاگی ہو...... اور وہ بھی ایسے خواب سے جو جاگنے کے فوراً بعد ہی ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اب خوف اور ڈر کی جگہ حیرت نے لے لی تھی۔ اس کے ذہن نے ایکا ایکی ایسا پلٹا کھایا تھا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس پر ابھی کیا قیامت گزرنے والی تھی...... پھر سب سے پہلے اس کے دماغ میں جس کی شبیہہ ابھری تھی اور جس کا نام کپکپاتی زبان آیا وہ ساون کا تھا۔

ادھر وڈیرا پھر اس پر جھپٹا اسے اپنی مخدوش صورت حال کا احساس ہوا اور اس بار وہ ''ساون'' کا نام لے کر زور سے چیخی...... پھر جانے کس طرح اللہ رکھی نے اپنی کہنی وڈیرے کی ناک پر رسید کی اور اس کے ایک جانب الٹتے ہی اللہ رکھی...... دروازے کی جانب بڑھی۔ اللہ رکھی کی یادداشت واپس آتے ہی گویا اس کے نازک شریر میں ہمت و حوصلے کی ایک نئی قوت عود کر آئی تھی وہ جلدی سے دروازے کے پٹ کھول کر...... ایک چوڑے اور پختہ گلیارے میں آ گئی یہ حویلی کے وسطی دروازے کا راستہ تھا...... جو ذرا آگے دوڑنے کے بعد اللہ رکھی کو نظر آ گیا...... اللہ رکھی نے جلدی سے اس پر چڑھے ہوئے پرانی طرز کے کنڈے کو ہٹایا اور پھر ذرا دیر بعد ہی وہ حویلی سے باہر ایک طرف کو بے تحاشا دوڑی چلی جا رہی تھی۔ جیسے اس کے عقب میں ان گنت بلائیں متعاقب ہوں...... پھر معاً وہ کسی مضبوط جسم سے ٹکرائی اور اس کی چیخ نکل گئی...... نیم تاریکی میں اللہ رکھی نے اس غیر مانوس مگر قدرے کرخت نظریں لئے نوجوان کو دیکھا...... اور ہانپتے ہوئے اسے اپنے اوپر گزرنے والی قیامت کے بارے میں بتانے لگی...... اس کے یہ بتانے کی دیر تھی کہ اس

نوجوان کی آنکھوں سے غیرت وحمیت کے شعلے نکلنے لگے...... اور کانوں میں اپنے مرحوم باپ دودا خان کے الفاظ گونجنے لگے۔

''علی بخش...... اللہ رکھی...... میری منگ ہے...... اور تیری ہونے والی ماں...... بے شک سوتیلی سہی...... مگر باپ کی لج...... بیٹے کی بھی عزت ہوتی ہے......'' یہ نوجوان علی بخش تھا اس نے اللہ رکھی کے خستہ وجود پر اپنی اجرک ڈال دی اور کلہاڑی ہاتھوں میں تولتا غیظ و غضب کا طوفان بنا حویلی کی جانب دوڑ پڑا۔ ادھر اللہ رکھی حیران و پریشان اسے پہچان بھی نہ پائی وہ آگے بڑھ گئی...... تاریکی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی...... پھر وہ کسی نہ کسی طرح...... ساون کا پوچھتی...... گرتی پڑتی اس گھر کے دروازے پر آ کر نڈھال ہو کر گر پڑی...... دروازہ ساون کے باپ موگو نے کھولا تھا...... وہ اللہ رکھی کو اس حالت میں دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا...... پھر جب وہ کسی طرح اسے سہارا دے کر اندر لایا تو ساون جیسے سن ہو کر رہ گیا...... اسے یوں لگا جیسے اس کی کل کائنات اس کے قدموں میں بکھرنے لگی ہو...... اس نے فوراً اپنی بکھرتی ہوئی کائنات کو بڑھ کر سمیٹ لیا۔

''اللہ رکھی!...... یہ تیرے ساتھ کیا ہوا ہے...... مجھے بتائیں...... اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' غیظ وغضب سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی...... اس نے فوراً اپنی کلہاڑی ہاتھوں میں لے لی۔ اس کی ماں اور بہن ہدایتاں ساون کو جوش وغیرت کی آگ میں سلگتا دیکھ کر دہل کر رہ گئیں۔

''نہیں ساون!...... مجھے کچھ نہیں ہوا...... تُو کہیں نہیں جا...... میں تجھے کھونا نہیں چاہتی...... تُو کہاں چلا گیا تھا ساون...... مم...... مجھے...... وڈیرے کے پاس کون چھوڑ کر گیا تھا۔''

اللہ رکھی کی زبان پر اپنا نام اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں اپنے لئے شناسائی دیکھ کر ساون کی آتش انتقام ذرا سرد پڑنے لگی اور وہ خوشی وانبساط سے اللہ رکھی کو شانوں سے پکڑ کر مسرت آمیز لہجے میں دیوانوں کی طرح اسے جھنجوڑتے ہوئے بولا...... ''اللہ رکھی...... میری اللہ رکھی...... ! تت...... تُو نے مجھے...... مجھے پہچان لیا...... اپنے ساون کو پہچان لیا۔'' اللہ رکھی اس کی بات پر قدرے چونک کر بولی۔

''ساون! میں تجھے بھولی کب تھی...... یہ تُو کیا کہہ رہا ہے......؟''

''میں تجھے سب بتا دوں گا اللہ رکھی...... پہلے مجھے اس ذلیل وڈیرے سے حساب کر آنے دے''...... ساون ایک بار پھر آگ بگولا ہوتے ہوئے بولا...... مگر اس اثناء میں اس

کی ماں اور بہن بھی اس کے آگے گڑگڑاتی ہوئی آگئیں اور اللہ رکھی بھی اپنی قسم دیتے ہوئے ساون کو اپنے ارادے سے باز رکھتے ہوئے بولی۔

''نہ ساون...... تجھے میری قسم...... خود پہ قابو پالے...... اللہ سائیں اس ظالم بیری کا خود ہی منہ کالا کرے گا......'' اللہ رکھی کی التجا کام کر گئی اور ساون کا غصہ ذرا...... ٹھنڈا پڑا......اور سب نے سکھ کا سانس لیا۔

☆======☆======☆

اگلے دن پورے گوٹھ داد پور میں کہرام مچا ہوا تھا...... وڈیرے لکھ میر خان کو...... علی بخش نے کلہاڑیوں کے وار کر کے ہلاک کر ڈالا تھا اور علی بخش کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی...... گوٹھ کے لوگ اس بات پر متحیر تھے کہ بھلا علی بخش کو وڈیرے سے ایسی کیا دشمنی تھی کہ اس نے آناً فاناً وڈیرے کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر یہ بات صرف اللہ رکھی اور ساون ہی جانتے تھے کہ...... علی بخش نے وڈیرے کو کیوں ہلاک کیا تھا۔

کچھ روز بعد جب ساون اور اللہ رکھی کی آپس میں شادی ہونے والی تھی تو ساون نے شرمائی شرمائی اللہ رکھی سے کہا...... ''ہم اپنی شادی میں شہر سے اختر بانو اور روزینہ کو بھی ضرور بلوائیں گے۔'' تو اللہ رکھی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''ساون! یہ اختر بانو اور روزینہ کون ہیں؟'' تو ساون مسکرا کر چپ ہو رہا...... اسے سب سے زیادہ ترس روزینہ پر آیا۔

(ختم شد)